ایک سیاست کئی کہانیاں

رؤف کلاسرا

ایک سیاست کئی کہانیاں

رؤف کلاسرا

دوست پبلی کیشنز

اسلام آباد - لاہور - کراچی

ترتیب

کہانیوں کی کہانی	رؤف کلاسرا	7
زاویے	عامر متین	13
چوہدری شجاعت حسین		19
چوہدری نثار علی خان		42
جنرل علی قلی خان		73
شاہد حامد		95
اسحاق ڈار		127
فیصل صالح حیات		147
امین فہیم		167
آصف علی زرداری		188
آفتاب احمد خان شیر پاؤ		217
سلطان محمود قاضی		230

جنرل [illegible] 246
میر ظفر اللہ خان جمالی 263
نواز شریف 281
سید یوسف رضا گیلانی 331
ذوالفقار علی بھٹو 352

کہانیوں کی کہانی

میں یہ کتاب چھ سال کی تاخیر سے لکھ رہا ہوں۔ رپورٹنگ کا کچھ ایسا چسکا پڑا ہے یا صحافت میں ہم سب کے گرو عامر متین کے بقول "کیڑا" ہونے کا کہ اب کسی اور طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔ لیکن میں قیام لندن کے دنوں میں جس بک سٹور پر گیا اور جس بیسٹ سیلر بک کو بھی ہاتھ لگایا تو پتہ چلا وہ وہاں کے کسی صحافی نے لکھی تھی۔ پاکستان کے بارے میں جتنی اچھی کتابیں اب تک لکھی گئی ہیں ان کے لکھنے والے بھی غیر ملکی صحافی ہیں۔ یہ صحافی پاکستان میں اپنے اخبار کے لیے صرف تین سال لگاتے ہیں اور اپنی معیاد ختم ہونے پر واپس جا کر ان کا پہلا کام پاکستان اور پاکستانی سیاستدانوں، فوج اور ایجنسیوں کے بارے میں کتابیں لکھنا ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک خواہش میرے دل میں بھی ہمیشہ سے موجود تھی کہ کچھ ایسا کام کیا جائے جس سے پاکستانی سیاست کے مختلف ادوار اور بڑے بڑے کرداروں کو عوام کے سامنے ایک کہانی کی شکل میں پیش کیا جا سکے۔ اسی خواہش کے پیش نظر ان سیاسی خاکوں کو اردو میں ایک نیا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میرے ذہن میں یہ بات کیسے آئی تھی کہ 2003ء میں، میں نے اس وقت کے سب سے زیادہ طاقتور سیاستدان چوہدری شجاعت حسین کا انٹرویو کیا تھا جس نے میرے لیے ایک نئی راہ متعین کی تھی۔ میں ہمیشہ اس کوشش میں رہا کہ میں خبر کو بھی ایک کہانی کی شکل میں لکھوں تاکہ پڑھنے

والا ہو رہے کا انکار نہ ہو۔ میں نے چوہدری شجاعت کا وہ انٹرویو اپنے انگریزی اخبار "دی نیوز" میں ایک کہانی کی طرح ہی لکھا تھا۔ وہ کہانی لوگوں کو اتنی پسند آئی کہ پھر میں نے تیس کے قریب مزید سیاستدانوں کی کہانیاں لکھیں۔ مجھے محمود خان اچکزئی کا وہ فقرہ نہیں بھولتا کہ میں نے چالیس برس بعد انتہائی مشہور عالمی صحافی اوریانا فلاسی کی یاد انہیں دلا دی تھی۔ میں نے اس وقت تک عالمی لیڈروں کے زبردست انٹرویوز پر مشتمل اوریانا کی کتاب "An interview with history" نہیں پڑھی تھی۔

جب پڑھی تو اس کا ایک ایسا رومانس سر پر سوار ہوا کہ میں نے اس کا بھٹو صاحب کا مشہور زمانہ انٹرویو ترجمہ کر کے اس کتاب میں شامل کیا ہے تاکہ ہماری نئی نسل ماضی سے قدرے روشناس ہو سکے۔ یہ انٹرویو 1972ء میں لیا گیا تھا۔ میرا دل چاہا کہ کاش اوریانا فلاسی دوبارہ بھٹو صاحب کا انٹرویو 1977ء کی فوجی بغاوت کے بعد کرتی تو پتہ نہیں کیا کیا انکشافات ہوتے۔ جس انداز سے اوریانا فلاسی نے بھٹو صاحب کی شخصیت کو بے نقاب کیا ہے وہ اس کتاب کو پڑھنے والوں کے لیے زیادہ دلکش بنائے گا۔

جب میں اپنے ان تیس سیاسی خاکوں میں سے انتخاب کرنے بیٹھا تو مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کس کا نام ڈراپ کروں۔ مجھے سب سے زیادہ مایوسی اس بات کی ہے کہ محمود خان اچکزئی کے ساتھ آٹھ برسوں پر محیط نشستوں کے بعد بھی میں اپنے آپ کو اس قابل نہ بنا سکا کہ وہ مجھے اپنے رازوں کی کہانی لکھنے دیتے۔ میرا خیال ہے کہ اگر محمود اچکزئی مجھے اجازت دے دیتے تو وہ اس کتاب کا سب سے بہترین باب ہوتا۔ میں ابھی بھی مایوس نہیں ہوا ہوں۔ انہوں نے آٹھ برس پہلے مجھے یہ کہا تھا کہ یہ تمام راز آف دی ریکارڈ بتائے جا رہے ہیں۔ میرے لبوں پر پھیلتی مسکراہٹ دیکھ کر وہ یکدم سنجیدہ ہو کر براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک پٹھان کے لہجے میں بولے۔ "اگر تم نے وہ راز راز نہ رہنے دیے تو پھر ہو سکتا ہے کسی دن تمہیں اپنی جان بچانے کے لیے اسلام آباد سے فرار ہونا پڑے تو اگر کوئی شخص تمہیں پورے پاکستان میں اپنا مہمان بنائے گا تو وہ صرف محمود اچکزئی ہو گا۔ آگے تمہاری مرضی۔ اگر تم اپنی آخری پناہ گاہ والا شخص میرے راز لکھ کر ختم کرنا چاہتے ہو تو یہ تمہاری چوائس!"

یہ بات میں ہی جانتا ہوں کہ کتنی مشکل سے میں نے ان آٹھ برسوں میں محمود اچکزئی کے سینے سے دھواں بن کر نکلنے والے ان خوفناک رازوں کو کیسے ایک صحافی ہونے کے باوجود چھپا کر رکھا ہے۔
اگرچہ میرے دوست کالم نگار سلیم صافی نے محمود اچکزئی کی موجودگی میں مجھے کہا کہ رؤف بھائی اتم بھی بڑے رومانس آدمی ہو۔ تم مجھے دیکھو اور یہ مجھے بھی کئی باتیں بتاتے رہتے ہیں جنہیں میں چھاپنے کے بعد ایک دو دن بعد ان سے نہیں ملتا۔ اس پٹھان کا دل بہت بڑا ہے، وہ جلد ہی ادھر سے بھیجے صحافیوں کو معاف کر دیتا ہے۔ میں نے مسکرا کر سلیم صافی کو جواب دیا کہ ہو سکتا ہے یہ خصوصی رعایت محمود اچکزئی صاحب صرف پختون ہونے کے ناطے ایک پختون صحافی کے ساتھ روا رکھتے ہوں جبکہ پنجاب کے صحافی کو ان آٹھ برسوں میں ابھی تک ان سے اتنی قربت حاصل نہیں ہو گی۔

محمود اچکزئی کے علاوہ شیخ رشید، خواجہ محمد آصف، مشاہد حسین، اعجاز الحق، اور سیف اللہ اور چند ایسے بڑے سیاستدان تھے جن کے پروفائل لکھ کر بھی میں اس کتاب میں شامل نہیں کر سکا۔ اگر اس سیاسی کتاب کو پذیرائی ملی تو شاید ان کے رازوں سے بھی پردے اٹھ جائیں۔ بہت سارے دوستوں نے کہا کہ قاضی حسین احمد، مولانا فضل الرحمن اور الطاف حسین کے بھی اسی طرح کے پروفائل لکھوں۔ پتہ نہیں میرا دل کیوں نہیں مانا۔ میں نے ان سب کو یہی جواب دیا کہ میرا خیال ہے کہ وہ مجھے اپنے دل کی باتیں نہیں بتائیں گے یا وہ سچ جو میں سننا چاہتا ہوں وہ اپنے اندر سے نہیں نکال پائیں گے، لہٰذا ان کا اور اپنا وقت برباد کرنے کا کیا فائدہ؟ اس لیے میں ان تینوں کے چاہنے والوں سے معذرت خواہ ہوں۔

"دی نیوز" کے سابق ایڈیٹر سلیم بخاری مجھے ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ مجھے انگلش میں لکھے گئے یہ سارے سیاسی پروفائلز کتابی شکل میں لے آنے چاہئیں۔ یہ کریڈٹ بھی سلیم بخاری کو جاتا ہے کہ یہ سب کے سب تہلکہ خیز پروفائلز انہی کے دور میں شائع ہوئے اور پہلی دفعہ جنرل مشرف کے دور میں انہی کے خلاف ہی ایسی ایسی چیزیں شائع ہونا شروع ہوئیں جن کا تصور کرنا شاید مشکل تھا۔ سلیم بخاری نے ایک بھی پروفائل نہیں رکنے دیا۔ اگر میں یہاں جنگ گروپ کے مالک میر شکیل الرحمن کا ذکر نہ کروں تو یہ ان کے ساتھ زیادتی ہو گی۔ اس بات کا میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ میر شکیل الرحمن پر جنرل مشرف کا کتنا دباؤ تھا کہ وہ اس طرح کے انٹرویو چھاپنا بند کریں۔ جنرل علی قلی خان کے پروفائل کے بعد تو حد ہو گئی تھی کیونکہ اس سے جنرل مشرف کی ان سازشوں کا پردہ فاش ہوا تھا جو انہیں نواز شریف سے خفیہ ملاقاتوں کے بعد آرمی چیف کے عہدے تک لے گئی تھیں۔ میر شکیل الرحمن نے بڑی ہمت سے میرے سارے پروفائل اخبار میں چھاپے۔ شاید اگر وہ جنرل مشرف کے دباؤ میں آ جاتے تو آج یہ تاریخ اس طرح رقم نہ ہو پاتی جس طرح اس کتاب کی شکل میں ہو رہی ہے۔ میں اس کتاب پر زیادہ تبصرہ اس لیے نہیں کرتا

ہوتا ہے۔ اسے اسی صحبتوں کی کھوج میں رکھتا ہے جہاں سیاسی گفتگو ہو سکے۔ یہ "گیدا" رؤف کو چھوڑے واقعات کی بڑی کہانیوں سے کڑیاں جوڑنے میں مصروف رکھتا ہے۔

پاکستان میں سیاسی صحافت کے لوازمات ذرا مختلف ہیں۔ گورے صحافیوں کے لیے پاکستان کا موروثی جاگیرداران اور برادری پرچی معاشرہ سمجھنا ذرا مشکل فعل ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے اپنے انگلش میڈیم صحافی بھی پاکستانی سیاست کے مقامی پیچ و خم، سیاسی کرداروں اور جماعتوں کی تاریخ اور مختلف ادوار کے اتار چڑھاؤ کو سمجھنے کا تردد نہیں کرتے۔ میرے کافی ایسے "مقامی گورے" صحافی دوست ہیں جو فخریہ بتاتے ہیں کہ ان کی اردو بہت کمزور ہے اور یہ کہ وہ اردو اخبار بالکل نہیں پڑھتے۔ اکثر بڑے شہروں میں پلے بڑھے ہیں اور نچلے طبقوں کے معاشرتی مسائل سے بہت کم واقفیت رکھتے ہیں اور جو صحافی درمیانے اور نچلے طبقوں سے ترقی کر کے اوپر آ گئے ہیں، اسلام آباد اور بڑے شہروں کی رنگینیاں ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور وہ اپنے ماضی سے جان چھڑاتے نظر آتے ہیں۔

صحافت میں پاکستانی معاشرے میں موجود یہ طبقاتی مسائل ہمیشہ رہے ہیں۔ مگر اب فرق یہ ہے کہ سیاست سے نابلد صحافیوں کی ایک پوری نسل ایسے عہدوں پر براجمان ہو چکی ہے کہ وہ رائے عامہ کو ایک اندھیری گلی میں دھکیلتی نظر آتی ہے۔

ٹیلی ویژن کی آمد سے یہ رجحان مزید خطرناک ہو گیا ہے۔ اینکرز کا ایک طبقہ اسلام آباد کے ڈرائنگ روموں کی گپ شپ، ایجنسیوں کی پھیلائی ہوئی سازشی افواہوں اور مراعات یافتہ مافیا کے پراپیگنڈے کو سیاسی تجزیے کے طور پر روزانہ پیش کرتا نظر آتا ہے۔

اکثر اینکرز کا صحافتی تجربہ کچھ سالوں یا مہینوں پر محیط ہے جس میں اچھے زمانوں میں صحافیوں کو سیاسی رپورٹنگ کی بمشکل اجازت ملتی تھی۔ انہیں نہ نیوز روم کی ڈانٹ ڈپٹ کا تجربہ ہے نہ فیلڈ رپورٹنگ کا۔ یہ ایسے ادوار کی پیداوار ہیں جس میں سیاسی عمل یا تو ناپید تھا یا اس کی کوئی لولی لنگڑی شکل سیاست کے طور پر موجود تھی۔ اس کی وجہ سے یہ نومولود صحافی سیاست اور سیاستدان کے خلاف بڑی جلدی تعصب قائم کر لیتے ہیں۔ اس سے نہ صرف ملک میں جمہوریت کے پروان چڑھنے میں دشواری ہوتی ہے بلکہ ہم ایک باغی اور متبادل خیالات کو برداشت کرنے والے معاشرے کو قائم کرنے سے قاصر ہیں۔ آئے دن پاکستانی ٹی وی ٹاک شو پر سیاسی موضوعات پر ایسی بھونڈی بحث نظر آتی ہے کہ انسان کا سر پیٹنے کو دل کرتا ہے۔ ایک کھیل چال ہے جس میں جھوٹی خبر بغیر تناظر کے اس طرح اچھال دی جاتی ہے کہ اس سے حکومت اور ملک پورا جمہوری نظام خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

مہذب معاشرے میں سیاستدان ناکام ہوتے ہیں۔ حکومتیں گرتی ہیں۔ آئین تبدیل ہوتے ہیں اور اداروں کے اختیارات پر لڑتے بھی ہیں مگر اس سے نظام، ریاست یا قومی سلامتی پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ اٹلی میں پچھلے 25 سال میں پاکستان کے مقابلے میں دو گنا حکومتیں گر چکی ہیں۔ امریکہ میں سپریم کورٹ نظریاتی بنیاد پر استوار ہے۔ ججوں کے نظریات، زندگی اور فیصلوں پر عام تنقید ہوتی ہے۔ فرانس کے صدر کی اہلیہ ان کی تیسری بیوی بننے سے پہلے ننگے جسم کی ماڈلنگ کرتی تھی۔ جاپان اور برطانیہ میں آئے دن سیاستدان مالی اور جنسی سکینڈلز میں پکڑے جاتے ہیں۔ مگر ان واقعات سے ان ملکوں کی قومی سلامتی پر کوئی حرف نہیں آتا۔ کوئی یہ راگ نہیں الاپتا کہ یہ ناکام ریاست ہے یا یہ ملک ٹوٹ جائے گا بلکہ اس طرح کی بحثیں ملک، جمہوریت اور صحتمند معاشرے کے لیے بہت مفید ہیں۔ یہ تب ہی ممکن ہے اگر سیاست اور سیاستدانوں کو صحیح تناظر میں دیکھا جائے۔

پاکستان میں تو ویسے ہی سیاست کو سات خون معاف کر دینے چاہئیں۔ جس ملک میں اس کی تاریخ کے آدھے وقت فوج حکمران رہی ہو، وہاں سیاست کو کیسے گالی دی جا سکتی ہے۔ جنہیں ہم سیاستدان کہہ کر تھوکتے ہیں، زیادہ تر وہ لوگ ہیں جنہیں مختلف ادوار میں ایجنسیوں نے بڑی محنت کے بعد چنا ہوتا ہے تاکہ وہ ان کے ایجنڈے پر کاربند رہیں اور سیاسی عمل کو پنپنے نہ دیں۔ ان میں سے کچھ لوگ جب نیک بننے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم صحافی ان کو ان کا مکروہ ماضی یاد دلا کر اتنے پتھر مارتے ہیں کہ وہ بیچارے یا تو سیاست چھوڑ دیتے ہیں یا دوبارہ اسٹیبلشمنٹ کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں۔ تینوں بڑی جماعتیں، مسلم لیگ ن اور ق اور پیپلز پارٹی یا تو فوج کی تخلیق شدہ ہیں یا ان کے قائدین نے مارشل لاء کی کوکھ سے جنم لیا ہے، مگر اس کے باوجود مختلف ادوار میں سب نے اپنی بساط، عقل اور حالات کے متعلق ملک و معاشرے کی بھلائی کے لیے کوششیں کی ہیں۔

اس سب کے لیے سیاست کی افادیت کے بنیادی فلسفے پر اتفاق ضروری ہے۔ ضروری نہیں کہ ہمارے ہاں عمومی طور پر پائی جانے والی سیاست اور اس سے وابستہ کردار اور جماعتوں کے متعلق جو آراء پائی جاتی ہیں وہ صحیح ہوں۔ ضروری نہیں کہ سیاست کا مطلب مال بنانا اور طاقت کا حصول ہو۔ ضروری

[illegible] یہ سیاستدان کس کردار کے مالک ہیں [illegible]
[illegible] یہ چیلنج لینا اور پارٹیوں اور [illegible] سے وراثت کیا جاتا ہے۔

سیاست کی ایک بنیادی صفت یہ ہے کہ وہ ایسا نظام مہیا کرے جس میں عوام کو شراکت کا احساس ہو۔ ان کو لگے کہ جو کچھ ہو رہا ہے ان کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ سیاستدان وہ شخص ہے جس نے اپنے آپ کو عوام کے سامنے پیش کیا ہے کیونکہ ان سے کردار اور اہلیت میں بہتر ہے اور ان کی دی ہوئی طاقت کو ان کی بھلائی کے لیے استعمال کرے گا اور ہر انسان کو یہ حق ہے کہ اس کے کردار کے متعلق جانچ پڑتال کر سکے۔ سیاسی عمل یہ نہیں ہے کہ کس سیاستدان نے کس وقت کیا اور کیوں کیا بلکہ یہ ہے کہ اس کے کام سے عوام کے مسائل کا کیا تعلق ہے۔ سیاست عوامی مسائل کے متعلق ہے نہ کہ سیاسی بیانات سے!

ہم پر یہ لازم ہونا چاہیے کہ ہم سیاسی جماعتوں اور سیاستدانوں کو یہ موقع دیں جس میں سیاسی عمل اور ارتقا جاری رہے۔ ایسا سیاسی کلچر پروان چڑھے جس میں ہم سیاستدانوں پر جائز تنقید بھی کرتے رہیں اور سیاسی نظام بھی نہ لڑکھڑائے۔ جس میں سیاستدانوں اور جماعتوں کو عوام ووٹ کے ذریعے ہی لے کر آئیں اور ووٹ کے ذریعے ہی تبدیل کریں۔ جس میں رائے عامہ اتنی مضبوط ہو کہ سیاسی جماعتیں وراثتی اور موروثی امیدواروں کی جگہ سیاسی کارکنوں کو فروغ دیں اور اپنی جماعت کے اندر بھی جمہوری کلچر نافذ کریں۔ جس میں کاروباری اور کرپٹ مافیا کا کردار کم ہو اور عام آدمی بھی سیاست میں ترقی کر سکے۔ جس میں آزاد الیکشن کمیشن سب کے لیے مساویانہ موقع فراہم کر سکے اور عوام میں ووٹ کی طاقت کا ادراک بڑھ سکے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایسی بحث و مباحثہ یا Informed public discourse ہو جس میں عوام اچھے اور برے کا بہتر تعین کر سکیں۔

ایسی پڑھی لکھی Debate تب ہی ممکن ہے جب ہمارے سیاسی رپورٹر یا تجزیہ نگار (جو کہ آج کے تجزیہ باز صحافیوں سے مختلف ہیں) کو اپنے موضوع کا بہتر ادراک ہو اور یہ سب تب ہی ممکن ہے جب نئے تجزیہ نگاروں کو وہ مواد مہیا ہو جس سے وہ کل کے واقعات جان کر آج اور آنے والے کل کے متعلق بہتر بات کہہ سکیں۔ رؤف کلاسرا کی یہ کاوش آج کے ان تجزیہ نگاروں کے لیے بہت مفید ہے جن کے پاس رائے عامہ کو تبدیل کرنے کی طاقت تو بہت ہے مگر سیاست کو سمجھنے کا تجربہ، جماعتوں کے اسرار و رموز، مقامی سیاست کے مسائل اور علاقائی تفریقوں سے آگاہی بہت کم ہے۔

رؤف نے یہ سچائی خاکے کی شکل میں شخصیات کے اندر جھانک کر [illegible] ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہم رؤف کے تجزیے سے اتفاق کریں مگر رؤف نے سیاست کے ایک دور کا خاکہ [illegible] کے لیے پیش کر دیا ہے۔ جس کی [illegible] میں اختلاف کا [illegible] بھی شریک ہو سکتا ہے۔

مجھے یہ خاکے پڑھ کر احساس ہوا کہ جو چوہدری نثار، یا چوہدری شجاعت، رؤف کے خاکوں میں ابھرے ہیں ان کو تو میں جانتا ہی نہیں تھا کیونکہ مصنف نے ان کو اپنے زاویے سے دیکھا ہے۔ شاید یہ سیاسی صحافت کا بھی سب سے بڑا سچ ہے کہ ایک ہی منظر اور کردار کی کئی کہانیاں ہوتی ہیں۔ اسی لیے ان خاکوں کا عنوان "ایک سیاست کئی کہانیاں" بہت موزوں ہے۔ کسی کے پاس سچائی کی ٹھیکیداری نہیں اور یوں ہی چھوٹی کہانیوں سے ایک بڑی کہانی ابھرتی ہے جو حقیقت کے قریب تر ہوتی ہے۔

عامر متین

ڈی ایچ اے، اسلام آباد

چوہدری شجاعت حسین

مجھے چوہدری شجاعت حسین سے ملنے کا شوق اس وقت ہی پیدا ہو گیا تھا جب اڈیالہ جیل میں قید یوسف رضا گیلانی اور اسلام آباد کے سب سے مہنگے ترین علاقے ای سیون سیکٹر میں واقع اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بات بات پر مسکراتے اور قہقہے لگاتے سید مشاہد حسین نے مجھے ایک ہی بات بتائی کہ جب ان دونوں کو 12 اکتوبر 1999ء کی فوجی بغاوت کے بعد گرفتار کیا گیا تو جو شخص ان کے گھر سب سے پہلے اپنی جیبوں میں پیسے ڈال کر ان کے بیوی بچوں کی خیریت دریافت کرنے گیا تھا وہ اور کوئی نہیں چوہدری شجاعت تھا۔

پتہ نہیں کیوں میرے ذہن میں چوہدری شجاعت کا امیج ایک ایسے سیاسی گاڈ فادر کا سا بن گیا تھا جو مشکل وقت میں اپنے دوستوں اور دشمنوں کی مدد کرنے کے لیے ہر وقت تیار تھا۔ شاید چوہدری صاحب بھی ماریو پوزو کے ناول گاڈ فادر کے ڈان کورلیون کی طرح اپنے اندر ایک ایسی جبلت لے کر پیدا ہوئے تھے جس کو اس بات کا احساس تھا کہ اپنے سیاسی مخالفین کو جیتنے کا سب سے بہتر موقع وہ تھا جب وہ کسی بہت بڑی مصیبت کا شکار تھے۔ کہنے کو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انہیں یوسف رضا گیلانی کے گھر والوں کی مصیبتوں کا اس لیے بھی علم تھا کیونکہ وہ خود پرویز الٰہی کے ساتھ اسی اڈیالہ جیل میں قید و بند کی صعوبتیں اٹھا چکے تھے۔ یہ بھی تو کہا جا سکتا ہے کہ جنرل مشرف کے ساتھ مل کر تو انہوں نے گیلانی کو

جیل بھی پایا تھا لہٰذا ان سے بہتر کون جانتا تھا کہ ان کے قیدی کے گھر میں اب [illegible] کی کمی تھی۔

جب 23 اپریل 2003ء کو میں ایف ایٹ مرکز میں واقع چوہدری شجاعت کی رہائش گاہ کے باہر پہنچا تو وہاں قیمتی گاڑیوں کی لمبی قطاریں دیکھ کر کسی بھی شخص کا پہلا تاثر یہی ہوتا کہ اس ملک کا اصل حکمران جنرل مشرف نہیں بلکہ جو اس گھر میں رہتا تھا۔ بہت بڑے ڈرائنگ روم میں ہر قسم کے سیاسی چہرے دیکھے جا سکتے تھے۔ وہاں کوئی وزیر بننا چاہ رہا تھا تو کوئی پارلیمانی سیکرٹری اور کچھ نہیں تو اسٹینڈنگ کمیٹی کا چیئرمین ہی لگ جائے۔ چوہدری شجاعت کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ہر پانچ منٹ بعد اس سیاسی مجمعے میں سے کوئی اپنا منہ آگے نکال کر اپنے نتھنے پھلائے زور سے اپوزیشن کے خلاف تقریر کرنا شروع کر دیتا کہ بھلا جنرل مشرف کے لیگل فریم ورک آرڈر کی مخالفت کرنے کی کیا تک تھی۔

میں خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھا ان سیاسی لوگوں کی مضحکہ خیز باتیں سن رہا تھا کہ کسی نے آ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا اور بولا کہ میں چوہدری شجاعت کا انتظار کروں۔ ابھی مجھے بیٹھے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور چوہدری شجاعت اندر داخل ہوئے۔ میں کھڑا ہوا تو وہ بڑی عزت و احترام سے ملے۔ ان کا خیال تھا کہ میں شاید موجودہ سیاسی صورتحال پر ان کا کوئی روٹین میں انٹرویو کرنا چاہ رہا تھا۔ میں مسکرایا اور انہیں بتایا کہ چوہدری صاحب سیاسی انٹرویو تو چلتے رہتے ہیں اور مجھ سے بہت بہتر صحافی یہ کام زیادہ اچھے طریقے سے کر رہے تھے۔ میرے ذہن میں کچھ اور بات تھی۔ میرے خیال میں لوگ جاننا چاہتے ہوں گے کہ آپ ایک عام سیاسی خاندان سے ایک سیاسی گاڈ فادر کیسے بنے۔ وہ شخص جس کے گھر کو 12 اکتوبر کی رات فوج نے لاہور میں گھیرے میں لے لیا تھا اور انتہائی ذلت آمیز انداز میں گھر کے مکینوں کی تلاشی لی گئی تھی وہ کیسے آج اس پوزیشن میں آ گیا تھا کہ جنرل مشرف جیسا شخص اس سے مشورے کے بغیر [illegible]۔

چوہدری شجاعت مسکرائے اور انہوں نے اپنے بارے میں گاڈ فادر [illegible] بات بھی کی۔ مجھے [illegible] انہوں نے اس [illegible] ایک [illegible]۔

چوہدری شجاعت تھوڑی دیر کے لیے چپ ہوئے اور بولے کہ اس کا مطلب ہے آپ کو خصوصی ٹائم دینا پڑے گا اور یہ گفتگو تو پھر یہاں بیٹھ کر نہیں ہو سکتی۔ تو کیا خیال ہے کل سے کسی اور جگہ نہ ملا جائے۔ ابھی میں کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ اس وقت پیپلز پارٹی کے ایک باغی ایم این اے رضا حیات ہراج کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ مجھے نہیں پہچانتے تھے لہٰذا انہوں نے کھل کر چوہدری شجاعت کو بتایا کہ کیسے پیپلز پارٹی والوں کو ڈنڈا دے رکھا تھا۔ چوہدری شجاعت نے ہاں ہوں میں جواب دیا۔

اگلے دن جب میری ملاقات چوہدری شجاعت سے منسٹرز انکلیو میں رہائش پذیر وزیر صحت نصیر خان کے گھر پر ہوئی تو پھر چوہدری شجاعت نے اپنی زندگی کے اہم رازوں سے پردہ اٹھانا شروع کیا اور ایک نئی کہانی کی ابتدا ہوئی۔

چوہدری شجاعت نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن وہ بھی سیاست کے میدان میں داخل ہوں گے۔ ان کے باپ چوہدری ظہور الٰہی اور ان کے خاندان کی جتنی بھی فیکٹریاں تھیں وہ ذوالفقار علی بھٹو نے 1970ء میں [illegible] کے نام پر اپنے قبضے میں لے لی تھیں۔ یوں بھٹو اور چوہدری خاندان میں دشمنی کی بنیاد پہلے ہی پڑ چکی تھی۔ جب جنرل ضیاء نے بھٹو کا تختہ الٹا تو چوہدری خاندان نے آگے بڑھ کر اس فوجی ڈکٹیٹر کو اپنے گلے سے لگایا کیونکہ دشمن کا دشمن ہمیشہ آپ کا دوست ہوتا ہے۔ ان تینوں یعنی بھٹو، ضیاء اور چوہدری ظہور الٰہی کو پتہ نہیں تھا کہ بہت جلد ان کے خاندانوں میں ایک ایسی مستقل دشمنی کی بنیاد پڑنے والی تھی جس کی بازگشت 27 سال بعد بھی اکتوبر 2007ء میں اس وقت سنی گئی جب بے نظیر بھٹو نے یہ الزام لگایا کہ چوہدری پرویز الٰہی 18 اکتوبر کی رات کراچی میں ہونے والے بم دھماکے میں ملوث تھے جس میں [illegible] پیپلز پارٹی [illegible] [illegible] [illegible] چوہدری شجاعت [illegible] اس وقت کے صدر غلام اسحاق خان کی [illegible]

لیں سے ہوا تھا؟

چوہدری شجاعت نے سیدھا میری آنکھوں میں دیکھا اور بولے کہ رؤف صاحب! ایسا ان مسائل کا حل نہیں تھا۔ میں نواز شریف کی سربراہی میں ہونے والی میٹنگز میں واحد شخص ہوتا تھا جو کھل کر ہمیشہ نواز شریف کے اس طرح کے غلط فیصلوں کے خلاف مزاحمت کرتا تھا۔ یہ میری وجہ سے ہی ہوا کہ کئی دفعہ پھر اس طرح کے فیصلے نہ ہو سکے جن سے ان کی اپنی حکومت اور ملک کو شدید نقصان ہوتا۔ شجاعت کے بقول اب نواز شریف ملک میں اپنی مرضی سے عدالتیں قائم کرنا چاہ رہے تھے اور یہ بات کیبنٹ کے سامنے لائی گئی تو انہوں نے اس کو سارے ایجنڈے سے ہی ہٹا دیا۔ تاہم نواز شریف ڈٹے رہے اور انہوں نے اگلی کیبنٹ میٹنگ میں اس کی منظوری لے لی۔ اس پر چوہدری شجاعت نے نواز شریف کو خبردار کیا تھا کہ ایک دن ہم سب کو ان عدالتوں کا سامنا کرنا پڑے گا لہٰذا بہتر ہے کہ ہم ان کے قیام سے گریز کریں اور پھر ایک دن جنرل مشرف نے نواز شریف کی بنائی ہوئی اسی ایک عدالت سے انہیں عمر قید دی تھی۔

شجاعت کے بقول 12 اکتوبر کی بغاوت سے پہلے نواز شریف جو خوفناک فیصلہ کرنا چاہ رہے تھے وہ یہ تھا کہ جو بھی سر عام اسلحہ کی نمائش کرے گا اسے سزائے موت دی جائے گی۔ اس کام کے لیے انہوں نے فوجیوں کو استعمال کرنا تھا اور 14 اکتوبر 1999 کو ڈیفنس کی کیبنٹ کمیٹی کی میٹنگ طلب کر لی گئی تھی جس میں یہ فیصلہ کیا جانا تھا۔ تاہم وہ دن پہلے ہی ان کا اپنا تختہ الٹ دیا گیا۔ شجاعت کے ذمے ایک کام لگایا گیا تھا کہ وہ اس میٹنگ میں تمام ملٹری کمانڈروں کو اس منصوبے کے بارے میں بریف کریں گے اور آرمی سے کہا جائے گا کہ وہ نہ صرف اس معاملے میں ان سے تعاون کریں بلکہ سر عام اسلحہ کی نمائش کرنے والے لوگوں کو پکڑ کر ان کو سزائیں دی جائیں۔ شروع میں چوہدری شجاعت نے اس پلان کی بڑی مخالفت کی۔ ان کے بقول نہ صرف اس قانون کا غلط استعمال ہوگا بلکہ یہ حکومت کے لیے بھی بہت مشکلات پیدا کرے گا۔ تاہم، شجاعت کو کہا گیا کہ وہ 12 اکتوبر کو یہ سارا پلان کیبنٹ کمیٹی برائے دفاع میں پیش کرنے سے پہلے وزیراعظم سے ڈسکس کر لیں۔ اس میٹنگ میں جنرل پرویز مشرف نے بھی شرکت کرنی تھی اور چاروں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ تاہم سب لوگ اس وقت بڑے حیران ہوئے جب غیر متوقع طور پر سندھ کے وزیراعلیٰ غوث علی شاہ نے وزیراعظم کے علم کے باوجود اس میٹنگ میں شرکت نہیں کی تھی کہ آج بھی غوث علی شاہ پر یہ الزام لگتا ہے کہ انہوں نے فوجی بغاوت کی بو سونگھ لی تھی اور وہ اس میٹنگ میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ شجاعت کے بقول ان کے لیے حیرانی کی بات یہ تھی کہ اس دن نواز شریف بہت خاموش تھے اور پریشانی واضح طور پر ان کے چہرے پر عکس ہوتی تھی جیسے ان کے ذہن پر کوئی بہت بڑا بوجھ ہو۔ یہ میٹنگ کوئی دو بجے کے قریب ختم ہوئی اور تمام لوگ نواز شریف کے ساتھ پرائم منسٹر ہاؤس چلے گئے تاہم چوہدری شجاعت وہاں سے نکل گئے کیونکہ انہوں نے جاپانی سفیر کے ساتھ لنچ کرنا تھا۔

اس مرحلے پر چوہدری شجاعت تھوڑی دیر کے لیے رکے اور ایک بڑا گہرا سانس لیا اور بولے کہ اگر 12 اکتوبر والے دن وہ وزیراعظم کے ساتھ چلے جاتے تو وہ بھی وہاں بہت سارے دوسرے لوگوں کی طرح فوجیوں کے ہاتھوں اسیر ہو جاتے جو وہاں جنرل ضیاء الدین بٹ کو نیا آرمی چیف بنانے کی تقریب میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔

میں نے چوہدری شجاعت سے پوچھ ہی لیا کہ آخر نواز شریف نے جنرل مشرف کو آرمی چیف کے عہدے سے ہٹانے کا فیصلہ کیوں کیا تھا؟

بغیر کسی ہچکچاہٹ کے شجاعت نے جواب دیا کہ نواز شریف ان دنوں غیر سیاسی لوگوں کے گھیرے میں آئے ہوئے تھے اور انہوں نے ہی ان سے وہ احمقانہ فیصلے کروائے تھے۔ کیبنٹ کے کسی ایک ممبر کو بھی اس فیصلے کی بھنک نہیں پڑنے دی گئی تھی۔ اور تو اور، شجاعت بھی جنرل مشرف کو ہٹائے جانے کے اس فیصلے سے لاعلم تھے۔ شجاعت کے بقول شریف برادران کا کچھ مزاج ہی ایسا تھا کہ وہ بڑے بڑے فیصلے بغیر سوچے سمجھے یا اپنے قریبی سیاسی ساتھیوں سے مشورہ کیے بغیر کر گزرتے تھے۔ چوہدری شجاعت کا خیال تھا کہ اگر نواز شریف نے مشرف کو ہٹانا ہی تھا تو اگر وہ اپنے قریبی ساتھیوں سے مشورہ کرتے تو اس سارے کام کو بڑے بہتر انداز میں کیا جا سکتا تھا۔ شجاعت کا اپنا خیال تھا کہ سری لنکا سے واپسی پر اگر مشرف کو بلا کر یہ کہا جاتا کہ انہیں آرمی چیف کے عہدے سے ہٹا دیا گیا ہے تو کوئی آسمان نہ گر پڑتا۔ شجاعت کے ذہن میں کوئی ذرہ برابر بھی شک نہیں تھا کہ جنرل مشرف کے پاور میں آنے کا ذمہ دار اور کوئی نہیں، نواز شریف خود تھے۔ شجاعت اکثر نواز شریف کو بتایا کرتے تھے کہ آپ فوجی

[illegible] پیدا کرنے کے لیے [illegible] معاملات میں زیادہ عمل دخل [illegible] شجاعت نے مجھے 1993 کا ایک واقعہ سنایا جب نواز شریف جنرل آصف نواز کی اچانک موت کے بعد [illegible] کی کوشش کر رہے تھے۔ [illegible] آرمی چیف بنانے کی [illegible]

چوہدری شجاعت کو پرائم منسٹر ہاؤس بلایا گیا جہاں چوہدری نثار علی خان اور جنرل مجید ملک پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے اور نئے آرمی جنرل کے بارے میں گفتگو جاری تھی۔ لیفٹیننٹ جنرل رمضان کو بھی آرمی چیف بنانے کی بات ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ عبدالوحید کاکڑ اور جنرل اشرف کو بھی ممکنہ امیدوار سمجھا جا رہا تھا۔ جب باری آئی تو چوہدری شجاعت کی رائے طلب کی گئی تو شجاعت نے وزیراعظم کو کہا کہ آپ بڑے آرام سے چپ چاپ نام لکھ کر غلام اسحٰق خان کو بھیج دیں اور آخری فیصلہ ان کو کرنے دیں۔ شجاعت نے نواز شریف کو بتایا کہ جو بھی آرمی چیف بنے گا وہ سیدھا ان کو سیلوٹ مارنے کے لیے وزیراعظم ہاؤس ضرور آئے گا اس لیے انہیں اس بات پر پریشان نہیں ہونا چاہیے کہ اگلا آرمی چیف کون ہوگا۔

میں نے شجاعت سے پوچھا کہ انہوں نے نواز شریف اور شہباز شریف دونوں کے ساتھ مل کر کام کیا ہوا تھا۔ ان کے خیال میں دونوں بھائی کس مزاج اور طبیعت کے آدمی تھے۔

شجاعت کے بقول نواز شریف زیادہ مہذب اور ہر ایک کے ساتھ بڑی عزت سے پیش آتے تھے۔ تاہم ان کی ساری شخصیت 1997ء کے الیکشن میں بھاری مینڈیٹ لینے کے بعد بدل گئی تھی۔ نواز کے برعکس شہباز شریف بہت سخت مزاج اور سینئر آفیسرز کی بڑی توہین کرتے تھے۔ تاہم، چوہدری شجاعت کا میاں شریف کے بارے میں بڑا مختلف نقطہ نظر تھا۔ ان کے خیال میں شریف برادران کے والد صاحب ان دونوں بھائیوں کے فیصلوں میں بردباری لانے کے لیے بڑا اہم کردار ادا کرتے تھے۔ کئی اہم موقعوں پر میاں شریف نے چوہدری شجاعت کی بڑی مدد کی جب انہوں نے ان دونوں بھائیوں کے غلط فیصلوں کو رکوانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ورنہ ان کی حکومت کے لیے بڑے شدید مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔ میاں شریف خاندان کے بڑے کی طرح اپنی ایک رائے دیا کرتے اور یہ دونوں بھائی اس کا احترام کرتے تھے۔

تاہم، مجھے ابھی تک یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ شریف خاندان کے اتنا قریب ہونے کے باوجود بھی چوہدری شجاعت اور جنرل مشرف میں دوستی کیسے ہو گئی تھی اور دونوں 12 اکتوبر کے بعد اس ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بن گئے۔

شجاعت نے اس راز سے بھی پردہ اٹھایا۔

دراصل چوہدری شجاعت ڈیفنس کمیٹی آف کیبنٹ کی میٹنگز میں بطور وزیر داخلہ شریک ہوتے تھے۔ یہ کئی دفعہ ہوا کہ جنرل مشرف اور چوہدری شجاعت کے نیشنل سکیورٹی کے معاملات پر خیالات تقریباً ایک جیسے پائے گئے جس کی وجہ سے ان دونوں میں فطری طور پر ہم آہنگی بڑھی، خصوصاً کارگل کے معاملے میں!

جونہی چوہدری شجاعت نے کارگل کا ذکر کیا تو میرے ذہن میں جنرل مشرف اور نواز شریف کی جاری لفظوں کی جنگ سامنے آ گئی۔ نواز شریف یہ مسلسل کہتے تھے کہ جنرل مشرف نے ان کو بتائے بغیر کارگل کا محاذ شروع کیا جس سے ہندوستان اور پاکستان کی فوجیں تقریباً جنگ لڑنے کے قریب آ گئی تھیں۔ سب سے بڑھ کر پاکستان اور انڈیا کے درمیان جاری امن مذاکرات کو شدید دھچکا لگا اور پوری دنیا میں پاکستان اکیلا رہ گیا جبکہ جنرل مشرف ہمیشہ یہ دعویٰ کرتے رہے کہ کارگل کی جنگ باقاعدہ نواز شریف سے اجازت لے کر شروع کی گئی تھی۔ میں نے اس کو بہترین موقع جانا اور شجاعت سے پوچھ لیا کہ کیا ان کے خیال میں نواز شریف کو کارگل کے مسئلے پر اندھیرے میں رکھا گیا تھا اور ان کو بتائے بغیر ہندوستان سے اتنی بڑی جنگ چھیڑنے کی کوشش کی گئی۔

چوہدری شجاعت نے فوراً اس تاثر کی تردید کی اور بولے کہ نہیں، نواز شریف کو اس معاملے کا سب پتہ تھا۔ اس بات کا ثبوت دینے کی غرض سے شجاعت نے مجھے بتایا کہ ایک دفعہ ایک بریگیڈیئر کارگل پر بریفنگ دے رہے تھے۔ ایک مرحلے پر جنرل مشرف، جو اس میٹنگ میں شریک تھے، نے یہ محسوس کیا کہ نواز شریف کو اس بریگیڈیئر کی باتیں سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور بریگیڈیئر کے ہاتھ سے اسٹک لے کر جنرل مشرف نے کارگل آپریشن کی تمام تفصیلات بتانا شروع کر دیں۔

اچانک نواز شریف نے بڑی اونچی آواز میں کہا کہ جنرل تم نے تو یہ ساری باتیں مجھے کبھی نہیں

چوہدری شجاعت بڑے حیران ہوئے اور مجھ سے پوچھا کہ کس کی بات کر رہے ہیں۔ میں نے کہا اور انہیں کہا کہ پنجاب میں فخر امام، عابدہ حسین، انور سیف اللہ، سلیم سیف اللہ اور میاں اظہر جیسے بہت سارے سیاسی لیڈروں کی بات کر رہا ہوں جنہوں نے یہ الزامات لگائے تھے کہ انہیں جان بوجھ کر الیکشن میں ہرایا گیا تھا تاکہ چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی کی راہ ہموار ہو سکے اور وہ اپنی مرضی کی گیم کھیل سکیں۔ شجاعت نے میری بات بڑے دھیان سے سنی اور پھر بولے کہ یہ بالکل غلط بات تھی کیونکہ اگر وہ الیکشن جیتتے تو آج وہ بھی حکومت کا حصہ ہوتے۔ شجاعت کا خیال تھا کہ ان سیاسی لوگوں میں سے کوئی ایک بھی اس کے لیے کوئی بہت بڑی تحریک نہیں تھا لہٰذا انہیں ہرانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

تاہم یہ بات بڑی واضح تھی جس کا اقرار اب چوہدری شجاعت نہیں کر رہے تھے کہ اگر میاں اظہر الیکشن جیت جاتے تو پھر یقیناً وہ پی ایم ایل کیو کے صدر ہونے کی حیثیت سے وزارت عظمیٰ پر اپنا حق جتاتے اور یوں چوہدری پرویز الٰہی کے لیے پنجاب میں وزارت اعلیٰ کا عہدہ لینے میں جہاں دقت پیش آتی وہاں اگر وہ وزیر اعلیٰ بن بھی جاتے تو پنجاب سے ایک اور وزیر اعظم جس کا تعلق بھی لاہور سے تھا، اس کی موجودگی میں شاید وہ اتنی آزادانہ حکومت نہ کر سکتے جو انہوں نے بعد میں کی۔ لہٰذا اس بات میں بڑی حد تک سچائی ہو سکتی ہے کہ چند لیڈروں کو جان بوجھ کر ہرایا گیا تاکہ پنجاب سے کسی وزیر اعظم کو روکا جا سکے اور چوہدریوں نے بڑی خوبصورتی سے اپنی سیاسی گیم کھیلی اور ظفر اللہ جمالی جیسے کمزور شخص کو وزیر اعظم بنا کر پنجاب پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ یہی نہیں بلکہ جب ظفر اللہ جمالی کا کام ختم ہوا اور ان کی جگہ ہمایوں اختر خان نے آئی ایس آئی اور طارق عزیز کی مدد سے وزیر اعظم بننے کی کوشش کی تو آخری لمحے میں چوہدری شجاعت جیسے زیرک سیاستدان نے میز ان پر الٹ دی اور شوکت عزیز کو وزیر اعظم بنوا دیا کیونکہ چوہدری برادران کسی قیمت پر یہ افورڈ نہیں کر سکتے تھے کہ پنجاب سے کوئی وزیر اعظم بنے۔ ان کی یہ حکمت عملی بڑی کامیاب رہی اور 15 نومبر 2007ء کو جب قومی اور صوبائی اسمبلیوں کو توڑ کر نئے الیکشن کرانے کے لیے نئی نگران حکومت بنائی گئی تو اس وقت تک پرویز الٰہی اپنے آپ کو بڑی کامیابی سے ملک کا اگلا وزیر اعظم ثابت کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ بینظیر بھٹو ماری گئیں اور یوں ساری گیم پلٹ گئی۔

چوہدری شجاعت ابھی بھی باتیں کر رہے تھے اور میرا ذہن ان کا سیاسی کھیل سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ایک طرف تو چوہدری شجاعت یہ دعویٰ کر رہے تھے کہ 12 اکتوبر کے بعد ان کی فیملی کے ساتھ انتہائی توہین آمیز رویہ اختیار کیا گیا تھا۔ ان کے گھروں کے باتھ روم تک چیک کیے گئے۔ جنرل امجد جیسے لوگوں نے ان سے ملنے سے انکار کیا اور اگر کوئی کسر رہ گئی تھی تو میاں آصف جیسے بیوروکریٹ نے انہیں ذلیل کر کے پوری کر دی اور وہ پھر بھی جنرل مشرف کے حامی بن گئے۔ میرا اپنا ذاتی خیال ہے کہ یہ سارا کام جنرل مشرف کی ہدایت پر کیا جا رہا تھا تاکہ ان چوہدری برادران کے گلے میں رسی اس طرح ڈالی جائے کہ نہ صرف وہ خود جنرل مشرف کے لیے کام کرنے پر تیار ہو جائیں بلکہ اپنے جیسے سیاستدانوں کا ایک پورا ریوڑ ہانک کر ان کی شکار گاہ میں لے جائیں جنہیں استعمال کر کے وہ اس ملک پر حکومت کریں۔ بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ جنرل مشرف نے نیب کو استعمال کر کے نہ صرف چوہدری شجاعت بلکہ دیگر تمام سیاستدانوں کو نکیل ڈال کر اپنے اقتدار کے لیے استعمال کیا۔

چوہدری شجاعت نے شاید میرے ذہن میں گردش کرتے ان سوالوں کو پڑھ لیا تھا لہٰذا انہوں نے خود ہی مجھے کہا کہ میں نے جنرل مشرف کے اقتدار کی اس لیے حمایت کی تھی کیونکہ ان میں اور مشرف میں ایک چیز بڑی مشترک تھی کہ دونوں نیشنل سیکیورٹی کے بارے میں ایک ہی رائے رکھتے تھے۔ چوہدری شجاعت نے مشرف کے لیے کی جانے والی اپنی حمایت کے جواز ڈھونڈنے جاری رکھے اور مجھے بتایا کہ ماضی کے جرنیلوں کے برعکس جنرل مشرف نے مارشل لا نہیں لگایا تھا بلکہ انہیں یہ کام کرنے پر مجبور کیا گیا۔ تاہم، چوہدری شجاعت مجھے یہ بتانا نہیں بھولے کہ وہ ملک میں فوجی حکومت کے خلاف تھے۔ چوہدری صاحب کے خیال میں ماضی میں جتنے بھی مارشل لاء لگائے گئے وہ سب غلط تھے اور ان کے لیے ان تمام جرنیلوں کو ذمہ دار سمجھنا چاہیے جنہوں نے اپنے ذاتی مفادات کے لیے جمہوریت کی گاڑی کو پٹڑی سے اتارا۔ تاہم، ایک سمجھدار سیاستدان کی طرح چوہدری شجاعت میں بھی اتنی عقل باقی تھی کہ انہوں نے جنرل مشرف کو ہرگز اس فہرست میں شامل نہیں کیا جس میں جنرل ایوب، جنرل یحییٰ اور جنرل ضیاء کے نام تھے۔ چوہدری شجاعت کو یہ پتہ تھا کہ وہ تینوں جنرل تو مر چکے تھے لہٰذا وہ ان کا کچھ

نہیں پا سکتے تھے۔ تاہم جنرل مشرف نہ صرف زندہ تھے بلکہ چوہدریوں کے اپنے مستقبل کی سیاست بھی ان جنرل کی زندگی اور وردی کے ساتھ منسلک تھی۔

یہ پہلی دفعہ نہیں ہوا تھا کہ چوہدری شجاعت وردی میں ملبوس آرمی جرنیلوں سے متعارف ہو کر سیاست میں ترقی کی منزلیں طے کر رہے تھے کیونکہ انہوں نے باتوں باتوں میں یہ انکشاف کیا کہ کیسے ایک دن جنرل اسلم بیگ نے انہیں ملنے کی دعوت دی۔ جب وہ چوہدری الٰہی کے ساتھ وہاں ان سے ملنے کے لیے پہنچے تو بیگ صاحب نے ان دونوں کو کروڑوں روپے دینے کی پیشکش کی۔ یہ بھاری رقم انہیں مہران بینک کے اکاؤنٹ سے ملنی تھی۔ یہ وہی مہران بینک اسکینڈل ہے جس کے بارے میں اصغر خان نے سپریم کورٹ آف پاکستان میں ایک درخواست دائر کی تھی کہ کیسے جنرل اسلم بیگ اور ریٹائرڈ ڈی جی آئی ایس آئی اسد درانی نے سیاستدانوں میں چودہ کروڑ روپے کی رشوت بانٹی تھی۔ جن سیاستدانوں کو مہران بینک سے پیسے دیے گئے تھے ان میں نواز شریف، فاروق لغاری، سندھ کے سابق وزیر اعلیٰ جام صادق، ایم کیو ایم کے الطاف حسین، یوسف میمن، جاوید ہاشمی، لیاقت جتوئی، ایم کیو ایم کے آفاق احمد، امتیاز شیخ، جام معشوق، افضل خان، دوست محمد فیضی، عدنان والد سرتاج عزیز وغیرہ شامل تھے۔

چوہدری شجاعت کے بقول جب وہ اسلم بیگ کے گھر پہنچے تو وہ بغیر بازوؤں کی شرٹ پہنے بہت ریلیکس نظر آ رہے تھے۔ جنرل بیگ نے ان دونوں چوہدریوں کو بتایا کہ انہوں نے ایک پلان بنایا ہے جس کے تحت آئی جے آئی کے پلیٹ فارم سے لڑنے والے تمام سیاستدانوں کو ان کے الیکشن کے لیے پیسے دیے جائیں گے۔ چوہدری شجاعت حسین ایک سرونگ آرمی چیف کے منہ سے اتنی بڑی بات جو اتنے آرام سے کی گئی تھی سن کر ششدر رہ گئے۔ تاہم، چوہدری شجاعت نے جنرل بیگ سے وہ پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ جنرل اسلم بیگ کو چوہدریوں کا یہ انکار سن کر بڑا دھچکا لگا کیونکہ اب تک ان سے آرمی ہاؤس میں جو بھی ملنے آیا تھا اس نے پیسے لینے سے انکار نہیں کیا تھا۔ مرزا اسلم بیگ نے یہ سمجھا کہ شاید یہ چوہدری صاحبان اپنے نام پر پیسے لینے کے لیے تیار نہیں تھے لہذا یہ ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ چنانچہ جنرل بیگ نے انہیں پیشکش کی کہ وہ اپنے نام سے اکاؤنٹ کھولنے کے بجائے اپنے کسی دوست [illegible] کے نام پر کراچی میں اکاؤنٹ کھول کر اس میں پیسے ٹرانسفر کر دیے جائیں گے۔ چوہدریوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے جنرل بیگ نے یہ بھی پیشکش کی کہ اس اکاؤنٹ میں کافی بڑے پیسے ٹرانسفر ہوتے رہیں گے اور وہ پیسے پیپلز پارٹی کو الیکشن ہرانے کے لیے استعمال کریں گے۔ تاہم، چوہدری شجاعت نے ایک سمجھدار سیاستدان کی طرح ایک بیوقوف مچھلی بننے سے انکار کر دیا جو پانی میں ٹکڑا کھانے کے چکر میں دریا کے کنارے ایک شکاری کا پھندا نگل لیتی ہے اور پھر اس کی قسمت کا فیصلہ وہ شکاری کرتا ہے۔ چوہدری شجاعت نے جنرل بیگ کو بتایا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی اس طرح کی گھٹیا سیاست کرنے کا سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ فوجی جرنیلوں سے پیسے لے کر الیکشن لڑیں گے۔ ایک حیران اور پریشان آرمی جنرل کو چوہدری شجاعت نے بتایا کہ وہ کیا بات کر رہے تھے کیونکہ وہ تو اپنی پارٹی کے بہت سارے لوگوں کو الیکشن لڑنے کے لیے خود پیسے فراہم کرتے ہیں۔ بھلا انہوں نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اب وہ ان سے پیسے لے کر الیکشن لڑیں گے۔ انہوں نے جنرل بیگ کو بتایا کہ وہ ان سے ایک روپیہ بھی نہیں لیں گے اور اپنی جیب سے سارا الیکشن لڑیں گے۔

چوہدری شجاعت نے مجھے بتایا کہ جب جنرل بیگ نے یہ محسوس کیا کہ وہ ان سے پیسے لینے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں تو یکدم آرمی جنرل کا لہجہ بہت سخت ہو گیا۔ چہرے پر لکھی ناراضگی صاف نظر آ رہی تھی۔ جنرل بیگ نے چوہدری شجاعت پر زور ڈالا کہ وہ پیسے لے لیں۔ تاہم، آخری حربے کے طور پر جنرل بیگ نے چوہدری شجاعت کو کہا کہ ٹھیک ہے، اگر وہ خود پیسے لینے کے لیے تیار نہیں ہیں تو وہ ایم این ایز اور ایم پی ایز کا الیکشن لڑنے والے ان لوگوں کی ایک ایسی فہرست تیار کریں جو پیپلز پارٹی کے امیدواروں کے خلاف الیکشن لڑ رہے تھے۔ جنرل بیگ کے بقول ان تمام امیدواروں کو مہران بینک سے پیسوں کی ادائیگی کی جائے گی۔

چوہدری شجاعت نے اس بات کا میرے سامنے اعتراف کیا کہ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ وہ ایک آرمی چیف کو ناراض کرنے کی جرات کر رہے تھے جس کا نتیجہ کوئی اچھا نہیں نکلنا تھا۔ لہذا انہوں نے بڑی سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جنرل اسلم بیگ سے کچھ وقت مانگا اور کہا کہ بہت جلد وہ ایک فہرست بنا کر ان کے حوالے کریں گے جو ان سے پیسے لے کر الیکشن لڑنے پر راضی ہو جائیں۔ تاہم، چوہدری شجاعت نے کہا کہ وہ اس کے بعد کبھی بھی جنرل بیگ سے ملنے نہیں گئے اور نہ ہی انہوں نے اس

[illegible]
گئے تھے۔

جب 24 اپریل 2008ء کو چوہدری شجاعت کا یہ تہلکہ خیز انٹرویو دی نیوز میں Shujaat makes startling disclosures کے ٹائٹل سے چھپا تو ہر طرف ایک تہلکہ سا مچ گیا کیونکہ کسی کو یقین نہیں آرہا تھا کہ چوہدری شجاعت جیسا بندہ اپنے اندر کی کہانیاں باہر لے آئے گا۔ اسی شام مجھے چوہدری شجاعت کا فون آیا اور اپنے مخصوص پنجابی لہجے میں وہ میرا شکریہ ادا کرنے لگے۔ ان کی آواز سے جوش اور خوشی جھلک رہی تھی۔ وہ مجھے کہنے لگے کہ آپ نے تو پورے شہر کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ہر طرف سے انہیں فون آرہے تھے۔ تاہم میں نے ایک بات بڑی شدت سے محسوس کی کہ کارگل کے معاملے پر جنرل مشرف کی حمایت کر کے انہوں نے اپنے باس کو بہت خوش کر دیا تھا۔ وہ مجھے کہنے لگے کہ آپ کے اس انٹرویو کا کارگل والا حصہ کسی اردو اخبار میں نہیں چھپ سکتا۔ میں نے کہا بالکل چھپ سکتا ہے اور میں نے انہیں طریقہ بتایا کہ یہ کیسے چھپ سکتا ہے۔ اگلے دن روزنامہ جنگ میں جنگ کے ایک رپورٹر کے نام سے چوہدری شجاعت کا وہ انٹرویو پھر چھپا۔ بعد میں پتہ یہ چلا کہ جنرل مشرف نے چوہدری شجاعت کا میرا لیا ہوا وہ انٹرویو پڑھ کر انہیں فون کر کے بہت سراہا تھا اور انہیں شاباش دی تھی کیونکہ اس انٹرویو سے جنرل مشرف کے اس بیان کی تصدیق ہوتی تھی کہ انہوں نے کارگل آپریشن نواز شریف کی مرضی سے شروع کیا تھا۔ اس کے بعد ہر انٹرویو اور گفتگو میں چوہدری شجاعت نے کارگل والے مسئلے پر یہی لائن لینا شروع کی۔

اس سے پہلے جب میں چوہدری شجاعت کا انٹرویو ختم کر چکا اور اٹھ کر دفتر آنے لگا تو ایک روایتی میزبان کی طرح چوہدری شجاعت نے مجھ سے بھی پوچھا کہ آپ بتائیں میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ میں دوبارہ بیٹھ گیا اور ان سے کہا کہ میرا ایک بڑا ضروری کام ہے۔ اگر آپ وہ کرا دیں تو میں بہت مشکور ہوں گا۔ چوہدری شجاعت نے کہا کہ بالکل! آپ حکم کریں۔ میں نے انہیں بتایا کہ ان کے پاس جنرل ضیاء کے طیارے کی ایک ایسی انکوائری رپورٹ پڑی تھی جو آج تک کبھی نہیں چھپی اور اس کی اکلوتی کاپی ان کے قبضے میں تھی۔ اگر وہ مہربانی کر کے وہ کاپی مجھے دے سکیں تو میرے لیے بہت

بڑا مطلب پورا ہوگا اور اس سے بڑی خبر کسی رپورٹر کی زندگی میں نہیں ہو سکتی۔ چوہدری شجاعت نے تھوڑی دیر سوچنے کی کوشش کی اور کہا تھا۔ انہوں نے تھوڑے سے توقف کے بعد کہا کہ وہ بہت جلد یہ کاپی ڈھونڈ کر مجھے دے دیں گے۔ اس کے بعد چوہدری شجاعت سے میری کئی ملاقاتیں ہوئیں اور وہ ہر دفعہ مجھے یہی کہتے کہ مجھے اب تک دو گھنٹے نہیں ملے کہ میں بیٹھ کر وہ رپورٹ کی کاپی آپ کے لیے ڈھونڈ سکتا۔ جس دن مجھے دو گھنٹے مل گئے میں وہ کاپی ڈھونڈ کر آپ کو ضرور بھیجوں گا۔ میں ہمیشہ ان سے یہی کہتا کہ چوہدری صاحب اس نے تو آپ کی دریا دلی اور ملاقات کا بڑا ذکر سنا تھا لیکن میں نے آپ سے ایک چھوٹے سے کام کی درخواست کی تھی وہ بھی آپ نہیں کر سکے۔ چوہدری شجاعت کے اس وعدے کو سات سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا ہے اور چوہدری صاحب میرے لیے اب تک دو گھنٹے نہیں نکال سکے۔ پچھلے دنوں پاکستان کے بہت بڑے صحافی عامر متین کے گھر پھر ملاقات ہوئی جہاں وہ ڈان کے ظفر عباس کے لیے ہونے والی تقریب میں شریک تھے۔ مجھے دیکھا تو خود ہی انہیں یاد آ گیا اور بول پڑے یار وہ لیٹ ایاں اے۔ ابھی رحمن ملک ادھر تھا۔ میں اسے کہتا کہ یہ رپورٹ شاید وزارت داخلہ میں پڑی ہو۔ میں مسکرا پڑا۔

اس سے پہلے میری چوہدری شجاعت سے ملاقات 2008ء میں ہوئی جب میں نے اپنے اخبار دی نیوز میں ایک سنسنی خیز خبر چھاپی کہ کیسے چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی نے صدر آصف زرداری کے معتمد خاص ڈاکٹر قیوم سومرو کے گھر جا کر خفیہ ملاقاتیں کی تھیں۔ یہ ملاقاتیں اس وقت ہوئیں جب آصف زرداری صاحب نے بینظیر بھٹو کے چہلم کے اگلے دن نوڈیرو میں بیٹھ کر اپنی پہلی پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے پی ایم ایل کیو کو قاتل لیگ قرار دیا تھا۔ اس کا مطلب بڑا واضح تھا کہ آصف زرداری اس پارٹی اور اس کے لیڈروں کو بینظیر بھٹو کا قاتل سمجھتے تھے۔ یہ بات چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی کے لیے خطرے کی گھنٹیاں بجا رہی تھی کہ کہیں اقتدار میں آ کر ان دونوں پر بینظیر بھٹو کے قتل کا مقدمہ نہ درج کر لیا جائے۔ اسی اثناء میں شہباز شریف نے بھی چوہدری مونس الٰہی کے گرد گھیرا تنگ کرنا شروع کیا، خصوصاً بینک آف پنجاب کے 9 ارب روپے کے اسکینڈل کی کہانیاں اخبارات میں چھپنے لگیں۔ اپنے آپ کو چاروں طرف سے گھیرے میں پا کر سمجھدار سیاستدانوں کی طرح چوہدری شجاعت

اور پرویز الٰہی نے آصف زرداری سے قربتیں بڑھانے کا فیصلہ کیا اور اس کام کے لیے ڈاکٹر قیوم سومرو کا انتخاب کیا گیا۔ قدرت نے یہ دن دکھانے تھے کہ چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی جن کی مرضی کے بغیر اس ملک میں آٹھ سال تک کوئی پتہ نہیں ہلتا تھا، آج ڈاکٹر قیوم سومرو کے گھر چھپ کر جا رہے تھے تاکہ اپنی اور اپنے بیٹے کی جان بچائی جا سکے۔

اپنے اخبار میں یہ کہانی لکھتے ہوئے مجھے اپریل 2005ء کی ایک صبح یاد آ گئی جب میں بھی دیگر صحافیوں کے ساتھ آصف علی زرداری کے ساتھ دبئی سے آ کر لاہور ایئرپورٹ پر اترا تھا۔ زرداری صاحب کا استقبال کرنے کے لیے ملک بھر سے آئے ہوئے پارٹی ورکرز پرویز الٰہی کی پنجاب پولیس کے ہاتھوں ڈنڈے کھا کر یہاں ایئرپورٹ پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ آصف زرداری کو ایجنسیوں نے یقین دلایا تھا کہ اگر وہ لاہور فتح کر لیں تو ملک میں نئے انتخابات کرا لیے جائیں گے اور ان کی پارٹی کو حکومت حوالے کر دی جائے گی۔ آصف علی زرداری صاحب بھی ایجنسیوں کے جھانسے میں آ گئے۔ چنانچہ لاہور ایئرپورٹ پر جہاز کے لینڈ کرنے سے پہلے ہی انہیں پتہ چل چکا تھا کہ گیم ختم ہو چکی ہے۔ یہی وجہ تھی جب جہاز کے اندر لاہور کے ایس پی یمین نے آ کر آصف زرداری کو سلیوٹ مارا تو انہوں نے اپنی روایتی مسکراہٹ سے اس نوجوان آفیسر کو کہا کہ تمہارے پاس میری گرفتاری کے وارنٹ ہوں گے چلو مجھے لے چلو۔ ہم سب صحافی بڑے حیران ہوئے کہ یہ صاحب تو لاہور فتح کرنے آئے تھے لیکن وہ چپکے سے ایس پی یمین کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر زرداری ہاؤس چلے گئے اور پرویز الٰہی کی پولیس نے ہم صحافیوں کو مار مار کر بھگا دیا۔ ہمارا قصور یہ تھا کہ ہم نے زرداری صاحب کے ساتھ دبئی سے آنے کی جرأت کیسے کی تھی۔

آج یہی وقت تھا کہ چوہدری پرویز الٰہی اپنے بیٹے کی جان بچانے کے لیے ڈاکٹر قیوم سومرو کے [illegible]

کے گرد منڈلاتے تمام خطرات بھی دور ہو گئے۔ اس کے بعد چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی نے آصف زرداری کے صدر بننے کے بعد ایوان صدر میں رات کے اندھیرے میں کئی کھانے کھائے جہاں یہ منصوبے بنائے گئے کہ پنجاب میں نواز شریف اور شہباز شریف کی کمر کیسے توڑی جائے۔ ان ملاقاتوں کے نتیجے میں ہی پنجاب میں گورنر راج لگا۔ پھر جو کچھ ہوا وہ سب لوگوں نے دیکھا کہ کیسے ان سب لیڈروں کو اپنا تھوکا ہوا چاٹنا پڑا۔ نہ صرف نواز شریف اور شہباز شریف عدالتوں سے بحال ہوئے بلکہ پنجاب حکومت بھی واپس کر دی گئی۔

اپنے ایف ایٹ کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی مجھے بھی سمجھا رہے تھے کہ مجھے اس طرح کی خبریں نہیں چھاپنی چاہئیں۔ ایک بات کی میں یقیناً داد دوں گا کہ میں نے چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی کے خلاف ان کے قرضے معاف کرانے سے لے کر فیصل آباد کی سونیا ناز کے ساتھ پنجاب میں ہونے والے ریپ کیس اور اب قیوم سومرو کے ساتھ خفیہ ملاقاتوں کی کئی ایسی خبریں چھاپی تھیں جو یقیناً کوئی بھی حکمران پسند نہیں کرتے۔ لیکن کسی ایک دن بھی چوہدری شجاعت یا پرویز الٰہی نے میرے ساتھ تلخی یا سختی سے بات نہیں کی بلکہ جب اور جہاں ملے بڑی عزت اور احترام سے ملے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں تمام سیاسی لیڈروں کے برعکس چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی میں ہم صحافیوں کو اپنے خلاف لکھنے کے باوجود برداشت کرنے کی بہت بڑی کوالٹی ہے۔

یہی وجہ ہے میں چپ چاپ چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی کی باتیں سنتا رہا اور جب اٹھنے لگے تو ان سے ایک ہی بات کی کہ چوہدری صاحب! آپ نے مجھ سے پانچ سال پہلے جنرل ضیاء کی انکوائری رپورٹ دینے کا وعدہ کیا تھا اور آپ نے آج تک میرا وہ کام نہیں کیا۔ چوہدری شجاعت تھوڑے جھینپ سے گئے اور بولے کہ جس دن [illegible]

چوہدری نثار علی خان

اکتوبر 2002ء کے الیکشن کے بعد نئی پارلیمنٹ وجود میں آ چکی تھی۔ چوہدری نثار علی خان کا میں نے اب تک صرف نام سنا تھا، ان سے ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بدلتے حالات و واقعات کے مطابق میں نے بھی اپنے آپ کو بدلنے کا فیصلہ کیا تھا اور پارلیمنٹ کی رپورٹنگ کے لیے اپنا نام اپنے ایڈیٹر سلیم بخاری کو پیش کیا تھا۔ سلیم بخاری اور دی نیوز کے چیف رپورٹر شکیل شیخ کی مہربانی سے میرا نام پارلیمنٹ کی کوریج کرنے والے رپورٹروں میں شامل کر دیا گیا تھا۔ یہ بات بتاتے ہوئے بڑا عجیب سا لگ رہا ہے کہ پارلیمنٹ جانے سے قبل مجھے سیاست اور سیاسی لیڈروں سے بڑی چڑ تھی اور میں حیران ہوتا تھا کہ سیاسی رپورٹر کیا جھک مارتے رہتے ہیں۔ بھلا سیاسی رپورٹنگ کرنا بھی کوئی رپورٹنگ ہے۔ سارا دن سیاستدانوں سے گپیں ماریں اور شام کو اپنا وہ چارا عمل بنا کر اسی گپ شپ کو اخبار میں چھاپ دیں۔ تاہم پارلیمنٹ کی رپورٹنگ کرنے کے کچھ عرصے بعد مجھے احساس ہوا کہ سیاسی رپورٹنگ کا اپنا ایک نشہ ہوتا ہے۔ جو اس میں ڈوب جائے وہی سکندر ٹھہرتا ہے۔ جب میں نے چوہدری شجاعت کا پہلا سیاسی تفصیلی انٹرویو کر کے اپنے اخبار میں چھاپا تو میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ یہ سلسلہ رکنا نہیں چاہیے اور باقی کے کچھ بڑے اہم لوگوں کا بھی انٹرویو کرنا چاہیے تاکہ ایک پوری سیاسی تاریخ مرتب کی جا سکے۔ میرا خیال ہے کہ وہ پاکستان مسلم لیگ نواز کے خواجہ محمد آصف ہی تھے جنہوں نے مجھے دو تین دفعہ یہ تجویز

دی کہ میں چوہدری نثار علی خان سے ملوں اور ان کا انٹرویو کروں۔ خواجہ صاحب کے بقول نثار کے پاس بہت بڑے بڑے راز تھے۔ ایک دن قومی اسمبلی کا اجلاس ختم ہوا تو پارلیمنٹ کیفے ٹیریا میں چوہدری نثار اور خواجہ آصف صحافیوں کے ساتھ ایک میز پر بیٹھے تھے۔ میں اس سے پہلے چوہدری نثار سے کبھی نہیں ملا تھا اور نہ ہی وہ مجھے شکل سے پہچانتے تھے۔ تاہم، میں خواجہ صاحب کے قریب گیا، ان سے علیک سلیک ہوئی۔ چوہدری نثار علی خان سے بھی ہاتھ ملایا اور وہیں اسی میز کے گرد بیٹھ گیا۔ اچانک خواجہ آصف نے مجھ سے پوچھا کہ رؤف اور کیا نئی تازی ہے۔ میرا نام سن کر چوہدری نثار تھوڑا سا چونکے اور میری طرف دیکھ کر کہا کہ آپ رؤف کلاسرا ہیں۔ میں نے کہا جی بالکل۔ ان کی بڑی مہربانی کہ وہ فوراً کھڑے ہو گئے اور دوبارہ مجھ سے ہاتھ ملایا۔ وہ مجھے بتانے لگے کہ کیسے جب وہ جنرل مشرف کے مارشل لاء کے بعد فیض آباد میں واقع اپنے گھر پر قید تھے تو انہوں نے پہلی دفعہ دی نیوز میں میرا نام خبروں کے ساتھ پڑھنا شروع کیا تھا۔ ان کے لیے میری تحریریں حیرانی کا سبب تھیں کیونکہ مارشل لاء کے باوجود جنرل مشرف کی حکومت کے خلاف نہ صرف سخت تحریریں میرے نام سے چھپ رہی تھیں بلکہ بہت سارے سکینڈلز بھی اخبار کی زینت بن رہے تھے۔ چوہدری نثار کے لیے یہ بات بڑی حیرانی کا موجب تھی کہ اچانک ایک نیا رپورٹر اتنا بڑا رسک لیتے ہوئے جنرل مشرف کے مارشل لاء کے خلاف خبریں تحریر کر رہا تھا۔

بعد میں مجھے چوہدری نثار نے بتایا کہ ان کی مسز بھی میری تحریروں کی گرویدہ تھیں۔ ان کے خیال میں میں سندھی تھا کیونکہ پنجابی رپورٹر اتنے سخت طریقے سے فوجی مارشل لاء کے خلاف نہیں لکھ سکتے تھے۔ تاہم، میں نے چوہدری نثار کو بتایا کہ میں سندھی نہیں بلکہ سرائیکی ہوں۔ اس پہلی ملاقات کے بعد چوہدری نثار سے گپ شپ بڑھتی گئی۔ وہ ان چند سیاستدانوں میں سے ہیں جو جب چاہیں اور جس سے چاہیں دوستی قائم کر سکتے ہیں اور جب یہ محسوس کریں کہ اب اس دوستی کی ضرورت نہیں ہے تو بھی وہ ایک لمحے میں اس بندے کو اپنے آپ سے دور کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مجھے خود بھی چوہدری نثار کی شخصیت کے اس پہلو کا تجربہ ہوا ہے جسے میں بعد میں بیان کروں گا۔

چوہدری شجاعت کے انٹرویو کے بعد ماحول بڑا سازگار تھا اور بہت سارے سیاستدان مجھ سے بات چیت کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ تاہم، میں نے چوہدری نثار علی خان سے درخواست کی کہ میں ان کا انٹرویو کرنا چاہتا ہوں۔ آپس کی بات یہ ہے کہ مجھے نثار کے بارے میں زیادہ پتہ نہیں تھا اور

تاہم چوہدری نثار یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھے کہ محمد خان جونیجو اوجھڑی کیمپ دھماکے کے بعد مستعفی ہونے کو تیار ہو رہے تھے۔ نثار نے کہا کہ دراصل یہ بھی ایک ڈس انفارمیشن تھی جس کا مقصد فوج کے اندر اوجھڑی کیمپ پر ایک سیاسی حکومت کو دباؤ میں کرنا تھا۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ جن دنوں نثار جونیجو حکومت میں وزیر تھے انہی دنوں بینظیر بھٹو وطن لوٹی تھیں۔ میرے سوال پر نثار بتانے لگے کہ جنرل ضیاء، بینظیر بھٹو کی وطن واپسی کے اتنے زیادہ خلاف نہیں تھے۔ تاہم ضیاء کو یہ خیال تھا کہ پاکستان کا سیاسی اور جمہوری سلسلہ جو ابھی نیا نیا چلا تھا وہ اتنا پختہ نہیں تھا کہ بینظیر بھٹو کے بڑے جلسوں کا سامنا کر سکے۔ تاہم، جونیجو نے جنرل ضیاء کو اس بات پر راضی کر لیا کہ بینظیر بھٹو کے وطن واپس آنے سے ضیاء کے اقتدار کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ جونیجو کا یہ بھی خیال تھا کہ بہتر ہوگا کہ بینظیر بھٹو کا سیاسی طور پر سامنا کیا جائے۔ کچھ دنوں بعد بینظیر بھٹو وطن واپس آ گئیں اور جیسا کہ جونیجو نے کہا تھا اس سے ملک میں فوری طور پر کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی اور سیاسی حکومت بینظیر بھٹو کی وجہ سے نہیں، جنرل ضیاء کی وجہ سے ختم ہوئی تھی۔

29 مئی 1988ء کو جب جونیجو حکومت ختم کی گئی تو لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ بہت سارے وزیر جنہیں جنرل ضیاء نے برطرف کیا تھا وہ دوبارہ حلف لے کر ان کی نگرانی میں قائم کی گئی کابینہ میں بیٹھ گئے تھے۔ چوہدری نثار بھی ان وزیروں میں شامل تھے جبکہ پنجاب میں نواز شریف نے نگران وزیراعلیٰ کا حلف اٹھایا تھا۔ تاہم، نثار نے میرے سامنے اس بات کا اعتراف کیا کہ نواز اور انہوں نے خود جونیجو کے خلاف جنرل ضیاء کی حمایت کر کے غلطی کی تھی۔ تاہم، نثار نے کہا کہ شاید اس فیصلے کے پیچھے یہ وجہ تھی کہ پنجاب میں پیر پگاڑا صاحب مسلسل نواز شریف کے خلاف ایک سیاسی گروپ کو اپنی حمایت کا یقین دلا رہے تھے۔ یوں ہمارے پاس ایک بڑی وجہ بن گئی تھی کہ ہم اسلام آباد میں پیر پگاڑا کے امیدوار وزیراعظم کا ساتھ نہ دیں۔ تاہم، نثار نے یہ بات مان لی کہ چاہے وجہ کچھ بھی ہو یہ نہیں ہونا چاہیے تھا اور سیاسی قوتوں کو ایک سیاسی وزیراعظم کا ساتھ دینا چاہیے تھا نہ کہ وردی میں بیٹھے ہوئے ایک جنرل کا۔ یوں جنرل ضیاء نے نواز شریف اور جونیجو کے درمیان اختلافات کا بڑا فائدہ اٹھا کر اپنی مرضی کی حکومت تشکیل کر لی۔

تاہم چوہدری نثار کے اندر ابھی بھی ایک سیاسی ورکر زندہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب ضیاء نے جونیجو کی حکومت توڑی تو نثار نے اس ایکشن کے خلاف ایک بڑا زوردار بیان دیا۔ یہ بیان پڑھ کر نواز شریف نے نثار کو فون کیا اور یہ ہدایت کی کہ وہ اس طرح کے بیان دینا بند کر دیں اور نثار چپ ہو گئے۔

میں نے نثار سے پوچھا کہ جنرل ضیاء کی شخصیت کس طرح کی تھی۔ وہ بولے ضیاء بڑے خلوص مزاج کے تھے اور بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ تاہم، جونیجو حکومت برطرف کرنے کے بعد وہ دوبارہ ایک نارمل زندگی شروع نہیں کر سکے تھے۔ جونیجو حکومت کی برطرفی سے لے کر اپنی موت تک نثار نے شاید ہی جنرل ضیاء کو اچھے موڈ میں دیکھا ہو۔ نثار نے کہا کہ ایک دن کابینہ میٹنگ سے پہلے پی ٹی وی کے کیمرہ مین کے آنے سے قبل جنرل ضیاء نے اپنے تمام وزیروں سے کہا کہ وہ باری باری کیمرے کے سامنے مسکرائیں تاکہ عام پبلک میں یہ تاثر جائے کہ جنرل ضیاء اور اس کے ساتھی ہرگز پریشان نہیں ہیں۔ اس ایک بات سے جنرل ضیاء میں پھیلی ٹینشن اور پریشانی کا اندازہ ہوتا تھا جس کا وہ سامنا کر رہے تھے۔

باتوں باتوں میں نثار نے اس بات کا بھی انکشاف کیا کہ جنرل ضیاء کا طیارہ کریش ہونے سے کچھ دن قبل جنرل ضیاء کے سینئر وزیر اسلم خٹک نے انہیں یہ مشورہ دیا تھا کہ ان کی زندگی کو خطرہ ہے لہٰذا وہ ہوائی جہاز کا سفر ترک کر دیں۔ جنرل ضیاء نے اپنے سینئر وزیر کو بتایا کہ خدا اس کی حفاظت کرے گا۔ نثار کے بقول جنرل ضیاء نے اپنے سینئر وزیر کی بات کو زیادہ سیریس نہیں لیا تھا حالانکہ اسلم خٹک کی بات سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے پاس کوئی اندر کی انفارمیشن موجود تھی کہ جنرل ضیاء کو قتل کرنے کا منصوبہ بن چکا تھا۔ پھر ہمیں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ جنرل ضیاء، پاکستان کی اندرونی اور بیرونی قوتوں کے لیے اب ایک بہت بڑا بوجھ بن چکے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جنرل ضیاء اپنی موت سے قبل یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ ملک میں نئے انتخابات نہیں کروائیں گے اور مختلف آپشنز پر غور ہو رہا تھا۔ ایک دن جنرل ضیاء نے کابینہ میٹنگ بلائی اور اپنے تمام وزیروں سے یہ پوچھا کہ کیا ملک میں نئے الیکشن ہونے چاہئیں۔ وزیروں کی اکثریت نے ملک میں نئے انتخابات نہ کروانے کا مشورہ دیا اور یہ تجویز دی کہ ملک میں صدارتی نظام حکومت رائج کر دیا جائے۔ ان وزیروں نے جنرل ضیاء کو بتایا کہ وہ ابھی بھی ملک میں بہت زیادہ پاپولر تھے اور بینظیر بھٹو کو صدارتی انتخاب میں شکست دے سکتے تھے۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے ان وزیروں نے یہ بھی بتایا کہ لوگ ایک عورت کو ووٹ نہیں دیں گے۔ نثار نے جب یہ

[illegible] غلام اسحاق خان [illegible] ملک کے قائم مقام وزیراعظم بن جائیں [illegible] ان کے ساتھ غلام اسحاق خان بھی استعفیٰ دے کر گھر جائیں [illegible] جنرل کاکڑ نے نواز شریف کو یقین دلایا کہ غلام اسحاق خان بھی اپنے گھر جائیں گے اور انہوں نے [illegible] کہ وہ ایوان صدر چھوڑ دیں۔

[illegible]

میں نے چوہدری نثار سے پوچھا کہ ایم کیو ایم کے خلاف فوجی آپریشن کی کیا حقیقت تھی تو انہوں نے ایک لمبی کہانی سنائی۔ وہ کہنے لگے کہ میں 1992ء میں ہونے والے ملٹری آپریشن کی بات بعد میں بتاؤں گا اس سے پہلے میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پاکستان سیکرٹ ایجنسیاں اور فوجی اسٹیبلشمنٹ جس ایم کیو ایم کو ملک دشمن، غدار اور بھارت کا ایجنٹ قرار دیتی تھیں، اسے 2002ء کے الیکشن کے بعد سندھ اور مرکز میں خود ہی اقتدار میں لے کر آئیں۔ چوہدری نثار نے 1999ء کے اوائل میں ایک ایسی میٹنگ کا ذکر کیا جس میں نواز شریف اور چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف موجود تھے۔ آئی ایس آئی کے اس بریگیڈیئر نے ان دونوں کی موجودگی میں کہا کہ چوہدری نثار کی الطاف حسین سے لندن میں ملاقاتیں ان کے لیے پرابلم پیدا کر رہی ہیں۔ نواز نے بڑے غصے میں اس بریگیڈیئر کو جواب دیا کہ ملک کے لیے پالیسی بنانا آئی ایس آئی کے آفیسر کا کام نہیں ہے۔ اس کا کام تمام احکامات پر عملدرآمد کرنا تھا۔ اسی میٹنگ میں ہی 72 سیاستدانوں کے نام پیش کیے گئے تھے جو الطاف کی سرپرستی کر رہے تھے۔

چوہدری نثار کو یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ جب وہ ایم کیو ایم کو قومی دھارے میں لانے میں مصروف تھے اس وقت نواز شریف کو یہ بتایا گیا کہ ایم کیو ایم ایک ملک دشمن جماعت تھی اور یہ بھارت کی خفیہ ایجنسی را کے اشاروں پر چل رہی تھی۔ آج وہی فوج اور سیکرٹ ایجنسیاں الطاف حسین کی اسی پارٹی کو اقتدار میں لے آئی تھیں۔ نثار کے بقول، انہوں نے ہمیشہ ایم کیو ایم کی وجہ سے بہت

[illegible] ورکروں کے ساتھ کیا گیا۔ نثار نے کہا کہ [illegible] ایم کیو ایم کی لیڈرشپ نے سندھ اور اسلام آباد میں حکومت جائن کرنے سے پہلے سیکرٹ ایجنسیوں اور جی ایچ کیو سے اس طرح کی معافیاں نہیں منگوائیں اور بڑے چپکے سے آ کر جنرل مشرف کی حکومت کو جائن کر لیا۔

میں اب بھی چوہدری نثار سے 1992ء کے ملٹری آپریشن کے بارے میں پوچھنا چاہ رہا تھا۔ نثار کو ابھی تک یاد تھا کہ جنرل آصف نواز پاکستان ٹیلی ویژن پر بھی یہ دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ ایم کیو ایم کے خلاف ہونے والے آپریشن کی تفصیلات ٹیلی ویژن کے ذریعے پوری قوم کو دکھائیں۔ نواز شریف اس وقت لندن میں الطاف حسین سے ملاقات کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ تاہم نثار نے پی ٹی وی کو آپریشن کی ویڈیو دکھانے سے منع کر دیا۔ جب نواز شریف لندن سے پاکستان لوٹے تو انہوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک ملاقات کی اور اس میں فوجی قیادت کے خلاف خاصی سخت زبان استعمال کی۔ فوج کے خلاف ہونے والی اس تنقید کو کسی نے اخبارات کو لیک کر دیا اور جنرل آصف نواز نے اس کا سخت برا منایا۔ چوہدری نثار نے اس برے وقت میں نواز شریف کے ساتھ کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا جس پر غصے میں آ کر جنرل آصف نواز نے سیکرٹ ایجنسیوں کو ان کے پیچھے لگا دیا۔ چوہدری نثار علی کے بھائی جنرل افتخار علی خان اور ان کے ایک اور عزیز پر بڑا دباؤ ڈالا گیا۔ کچھ دنوں بعد چند مشترکہ دوستوں نے جنرل آصف نواز اور چوہدری نثار کے درمیان ایک ملاقات کا اہتمام کیا۔ جنرل آصف نے چوہدری نثار سے شکایت کی کہ ان کے خاندانوں کے تعلقات بہت پرانے تھے، پھر بھی وہ محض ایک تاجر (نواز شریف) کے لیے ان تعلقات کا خیال بھی نہیں کر رہے تھے۔ نثار نے جنرل آصف کو جواب دیا کہ جناب کس میں اتنی جرأت ہے کہ کوئی آرمی چیف کے خلاف اپنی توپوں کا رخ کر سکے۔ جہاں تک ان کی نواز شریف کے ساتھ دوستی کا تعلق ہے تو وہ اسے نہیں چھوڑیں گے۔

میں نے نثار سے پوچھا کہ فاروق لغاری اور نواز شریف کے درمیان بینظیر بھٹو کے خلاف محاذ

ریٹائرمنٹ کے بعد چیئرمین جائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی مقرر کرنا چاہتے تھے۔ تاہم، عام توقعات کے برعکس جنرل کرامت کا نیشنل سیکیورٹی کونسل بنانے کا متنازعہ بیان ہی ان کے نواز شریف کے ساتھ اختلافات کی کوئی ایک وجہ نہیں تھا۔ نواز شریف کے علم میں یہ بات لائی گئی تھی کہ جب جنرل کرامت اپنے ہی کسی ایک ایسے دوست سے ملے جو نواز شریف کے بھی دوست تھے تو انہوں نے وزیراعظم کے بارے میں کچھ ایسے ریمارکس دیے جنہیں پسند نہیں کیا گیا۔ نواز شریف نے جنرل جہانگیر کرامت سے اپنے بارے میں کیے گئے ریمارکس کے بارے میں وضاحت طلب کی تو وہ اپنی بات سے مکر گئے۔ نواز شریف اور جنرل کرامت میں بات اتنی بڑھ گئی کہ متحدہ عرب امارات کے شاہی خاندان کے ایک فرد کو باقاعدہ مداخلت کر کے دونوں میں صلح کرانی پڑی۔

نواز شریف اور جنرل جہانگیر کرامت کے درمیان ٹینشن کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ جنرل جہانگیر کرامت اپنی مرضی کے ایک جنرل علی قلی خان کو اپنے بعد آرمی چیف لگوانا چاہتے تھے اور اس کام کے لیے وہ دن رات لابنگ بھی کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں وزیراعظم نواز شریف کو سیکرٹ ایجنسیوں نے کچھ ایسی رپورٹس بھی بھیجی تھیں جو متوقع آرمی چیف کے خلاف تھیں۔ اس وقت کے ڈی جی آئی ایس آئی جنرل نسیم رانا بھی نواز شریف کے پاس نئے چیف آف آرمی سٹاف کے متوقع امیدواروں کے بارے میں کچھ ایسی فائلیں لے کر آئے تھے جو سنگین تھیں۔ جرنیلوں کی حرکتوں اور ان کے کرتوتوں کے بارے میں سیکرٹ ایجنسیوں کی تیار کی ہوئی وہ رپورٹس دیکھ کر چوہدری نثار پہلی دفعہ بڑے ڈسٹرب ہوئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سیکرٹ ایجنسیاں اپنے سروِنگ جرنیلوں کے بارے میں بھی اس طرح کی چیزوں کا خفیہ ریکارڈ رکھتی ہیں۔

اس سے پہلے جب نواز شریف اور صدر فاروق لغاری کے درمیان تعلقات خراب ہوئے تھے تو جنرل کرامت نے بھی ایک خط وزیراعظم کو لکھا تھا جس پر نواز شریف خوش نہیں تھے۔ جنرل کرامت نے اونٹ کی کمر پر آخری تنکا اس وقت رکھا جب انہوں نے نیول وار کالج، لاہور میں نیشنل سیکیورٹی کونسل بنانے کی تجویز پیش کی۔ ان کے اس خطاب سے اسلام آباد میں بیٹھے سب لوگ چونک گئے۔ چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ جہانگیر کرامت نے نیشنل سیکیورٹی کونسل کا نام اپنی تقریر میں نہیں لیا تھا لیکن جب آئی ایس پی آر نے خصوصی طور پر نیشنل سیکیورٹی کونسل کا لفظ پریس ریلیز میں شامل کر کے پی ٹی وی کو بھجوایا تو اس سے حکومت کو احساس ہوا کہ معاملہ بہت سیریس ہے۔

نواز شریف نے سوچا کہ اب کافی ہو گیا ہے۔ جنرل کرامت نے اپنی حدود سے تجاوز کر لیا تھا۔ نواز نے ہر قیمت پر جنرل کرامت کو گھر بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ چوہدری نثار اور شہباز شریف نے جنرل جہانگیر کرامت کو ہٹانے کی مخالفت کی لیکن نواز شریف نے یہ کہہ کر ان کی بات مسترد کر دی کہ وقت آ گیا ہے کہ ملک میں اب سویلین لوگوں کی رٹ قائم کی جائے۔ نواز نے جنرل جہانگیر کرامت کو وزیراعظم ہاؤس بلوایا اور غیر متوقع طور پر کرامت نے مستعفی ہونے کی پیشکش کر دی۔ اسی شام ڈی جی آئی ایس آئی رانا نسیم جنرل جہانگیر کرامت کا استعفیٰ نواز شریف کو آ کر دے گئے۔

○○○

اب نواز شریف کو ایک دفعہ پھر ایک نئے آرمی چیف کی تلاش تھی جو ان کے خیال میں ایک سویلین حکومت کو جوابدہ ہو اور وہ نہ تو وزیراعظم کو کسی صدر کے حق میں خط لکھے اور نہ ہی اپنی تقریروں میں کھلے عام نیشنل سیکیورٹی کونسل بنانے کی تجویز پیش کرے۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ پیٹھ پیچھے ملک کے وزیراعظم کے خلاف گفتگو بھی نہ کرے۔ جنرل علی قلی خان کے خلاف چوہدری نثار اور جنرل افتخار علی خان پہلے ہی محاذ بنا چکے تھے اور نواز شریف چوہدری نثار سے پوچھے بغیر کوئی نیا آرمی چیف نہیں لگانا چاہتے تھے۔

جب میں نے نثار سے پوچھا کہ جنرل مشرف کو کس نے آرمی چیف بنوایا تھا تو انہوں نے مجھے کہا کہ نواز شریف نے خود ہی مشہور صحافی سہیل وڑائچ کو جدہ میں دیے گئے اپنے ایک انٹرویو میں یہ کہا تھا کہ انہوں نے چوہدری نثار کے کہنے پر انہیں آرمی چیف لگایا تھا۔

چوہدری نثار نے مجھے جنرل مشرف کو آرمی چیف بنوانے کی کہانی سنانا شروع کی۔

جس شام ڈی جی آئی ایس آئی جنرل رانا نسیم جنرل جہانگیر کرامت کا استعفیٰ نواز شریف کے حوالے کر گئے تو نواز شریف نے اپنے ملٹری سیکرٹری سے کہا کہ وہ کور کمانڈر منگلا لیفٹیننٹ جنرل پرویز مشرف کو کال کریں اور اس سے کہیں کہ وہ رات کے نو بجے سے پہلے پہلے انہیں آ کر ملیں۔ جنرل مشرف کو جب یہ ٹیلیفون کال ملی تو وہ بڑے حیران ہوئے کہ ملک کا وزیراعظم جس نے کچھ دیر پہلے آرمی چیف

سے استعفیٰ لیا تھا وہ انہیں اس طرح بلا کر کیوں ملنا چاہ رہا ہے۔ جنرل مشرف اسے گھبرا گئے اور انہوں نے ملٹری سیکرٹری سے پوچھا کہ کیا میں وزیراعظم سے ملنے یونیفارم میں آؤں یا سادہ کپڑوں میں! جنرل مشرف کے پوچھنے کا مطلب یہ تھا کہ کیا وزیراعظم ان سے سرکاری طور پر ملنا چاہ رہے تھے یا وہ ان سے کوئی نجی میٹنگ کرنا چاہتے تھے جس کا فوج کی اعلیٰ قیادت کو علم نہ ہونے پائے۔ جنرل مشرف کو بتایا گیا کہ وہ باقاعدہ یونیفارم پہن کر وزیراعظم سے ملنے آئیں۔

تاہم، جنرل پرویز مشرف نو بجے کے دیئے ہوئے مقررہ وقت پر وزیراعظم ہاؤس نہ پہنچ سکے۔ یوں پی ٹی وی نے نو بجے کی خبروں میں جنرل جہانگیر کرامت کے استعفیٰ کی خبر تو چلا دی تھی اور ساتھ میں جنرل پرویز مشرف کو نیا آرمی چیف بنانے کا بھی اعلان انہی خبروں میں کیا گیا۔ اس وقت جنرل مشرف اسلام آباد ایئرپورٹ چوک پہنچ چکے تھے جب انہیں موبائل پر ان کے کسی دوست کا فون آیا کہ انہیں نیا آرمی چیف بنا دیا گیا ہے۔ اس وقت جنرل مشرف کو یہ احساس ہوا کہ انہیں ایمرجنسی میں وزیراعظم ہاؤس کیوں بلایا جا رہا ہے۔

چوہدری نثار کے بقول فوج میں ہر آرمی جنرل کی اپنی ایک لابی ہوتی ہے۔ اگر جنرل کی لابی پہلے نہ ہو تو آرمی چیف بننے کے بعد خود بخود بن جاتی ہے۔ تقدیر نے جنرل مشرف کو آرمی چیف بنانا تھا لہٰذا یہ بحث اب بیکار ہے کہ ان کا نام نواز شریف کو کس نے دیا تھا۔

نئے آرمی چیف کی تقرری کے وقت نواز شریف کے پاس تین جرنیلوں کے نام موجود تھے جن میں جنرل علی قلی اور جنرل پرویز مشرف بھی تھے۔ تاہم، شارٹ لسٹنگ کے بعد مقابلہ جنرل علی قلی اور پرویز مشرف میں تھا۔ نواز شریف علی قلی خان سے خوش نہیں تھے، خصوصاً جب سے جنرل کرامت کے ساتھ ان کی چپقلش شروع ہوئی تھی۔ جنرل قلی نے فوج کی کسی اندرونی میٹنگ میں کچھ ایسی باتیں کی تھیں جو نواز شریف کو پسند نہیں آئی تھیں۔ اس کے علاوہ جنرل جہانگیر کرامت بھی علی قلی خان کے حق میں تھے لہٰذا یہ بات بھی ان کے خلاف چلی گئی اور یوں جنرل مشرف کو آرمی چیف بنا دیا گیا۔

○○○

نواز شریف کو ہرگز یہ اندازہ نہیں تھا کہ جنرل پرویز مشرف جیسا بظاہر بے ضرر نظر آنے والا جنرل جسے انہوں نے علی قلی خان کو نظرانداز کر کے آرمی چیف بنایا تھا وہ ایک دن ان کے اقتدار کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن کر نمودار ہوگا۔ کارگل کا آپریشن نواز شریف کے لیے ایک جھٹکے سے کم نہیں تھا۔ انہوں نے جن دنوں بھارتی وزیراعظم واجپائی کو لاہور بلایا ہوا تھا اس وقت ان کے اپنے آرمی چیف انہیں بتائے بغیر کارگل پر اپنی فوجیں چڑھا بیٹھے تھے۔ نواز شریف کو جنرل مشرف کے اس خفیہ پلان کا اس وقت پتہ چلا جب واجپائی نے ایک رات خود ٹیلی فون پر نواز شریف کو بتایا کہ ان کی آرمی بھارت کے ساتھ کارگل کے محاذ پر باقاعدہ جنگ لڑ رہی ہے۔

جب نواز شریف کے نوٹس میں یہ بات لائی گئی اس وقت اگر وہ چاہتے بھی تو وہ کارگل کی اس جنگ کو نہ تو روک سکتے تھے اور نہ ہی اسے Reverse کر سکتے تھے۔ معاملات ان کے ہاتھ سے نکل چکے تھے اور جنرل مشرف کے اس ایڈونچر کا نواز شریف کی حکومت پر بہت برا اثر پڑنے والا تھا۔

نواز شریف اور ان کی حکومت کو فوجی قیادت نے کارگل آپریشن کے بارے میں صرف اتنا کچھ بتایا جو ان کے خیال میں سیاسی قیادت کو بتانا چاہیے تھا۔ ساری بات اس وقت کھل کر سامنے آئی جب گورنر ہاؤس لاہور میں نواز شریف کو جنرل پرویز مشرف نے کارگل آپریشن پر بریفنگ دی جس میں اس وقت کے نیول چیف فصیح بخاری اور ایئر چیف پرویز مہدی بھی شامل تھے۔ جب جنرل پرویز مشرف نے اس آپریشن کی تفصیلات بتائیں تو اس میٹنگ کے باقی شرکاء کو تو چھوڑیں، وہاں بیٹھے فصیح بخاری اور پرویز مہدی بھی ہکا بکا رہ گئے۔ ان دونوں نے شدید حیرانی کا اظہار کیا اور بولے کہ انہیں تو کبھی بھی اس آپریشن سے پہلے اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا۔ بھارت کے ساتھ ایک کھلی جنگ کی صورت میں ان دونوں نے اپنی جو رائے دی اس سے وہاں بیٹھے تمام لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ان دونوں کی باتوں سے سب کو یہ تاثر ملا کہ اگر بھارت نے کارگل کو بنیاد بنا کر پاکستان پر فضائی اور بحری راستوں سے حملہ کیا تو شاید صورتحال بہت خراب ہو جائے۔ اس میٹنگ میں بیٹھے ہوئے تمام شرکاء کو پہلی دفعہ یہ احساس ہوا کہ کارگل کی وجہ سے پاکستان ایک بہت بڑے خطرے میں گھر گیا تھا۔

میں نے چوہدری نثار سے پوچھا کہ جنرل مشرف یہ دعویٰ کرتے آئے تھے کہ انہوں نے کارگل کا آپریشن نواز شریف کی منظوری سے شروع کیا تھا۔ چوہدری نثار ہنسے اور بولے کہ نواز شریف نے اگر منظوری دی تھی تو کیا وہ اتنے بیوقوف تھے کہ وہ ایک طرف کارگل کا آپریشن شروع کراتے اور دو

ماہ کے اندر اندر واجپائی کو لاہور بلا لیتے۔

گورنر ہاؤس لاہور میں ہونے والی اس میٹنگ کے بعد چوہدری نثار کو وزیر اعظم نواز شریف نے فون کیا اور کہا کہ وہ فوری طور پر ان کے ساتھ امریکہ جانے کے لیے تیار ہو جائیں کیونکہ یہ پاکستانی فوج کی عزت بچانے کا وقت ہے۔ نواز شریف اس وقت حیران رہ گئے جب چوہدری نثار نے انہیں امریکہ جانے سے منع کیا اور کہا کہ میاں صاحب! جن لوگوں نے اپنے سویلین لیڈروں کو اعتماد میں لیے بغیر کارگل کا ایڈونچر شروع کیا ہے انہیں اب اس کے نتائج بھی بھگتنے دیں۔

نواز شریف نے تب یہ جواب دیا کہ چوہدری صاحب! انہیں، میں اپنے ملک کی فوج کو بھارتی افواج کے سامنے ذلیل ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔

نثار نے مجھے بتایا کہ انہوں نے جس طریقے سے نواز کے امریکہ جانے کی مخالفت کی تھی اس کے گواہ شہباز شریف خود ہیں۔

نثار نے اس موقع پر گہرا سانس لیا اور مجھے دیکھ کر بولے کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ جس فوج کو نواز شریف نے مشکل وقت میں بچایا تھا اسی نے ہی انہیں ایک قلعے میں ڈال دیا۔

نثار مجھے بتانے لگے کہ یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ جس سیاسی وزیر اعظم نے فوج کے ساتھ بھلائی کی اسی فوج نے انہیں یا تو پھانسی پر چڑھا دیا یا پھر ایک قلعے میں قید کر دیا۔

اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے نثار نے کہا کہ یہ بھٹو ہی تھے جو نوے ہزار پاکستانی فوجی بھارتی قید سے واپس لے آئے تھے اور اسی آرمی نے انہیں پھانسی دی۔ ٹھیک ستائیس سال بعد اسی فوج نے یہی کام نواز شریف کے ساتھ کیا۔ اپنی فوج کی عزت بچانے کے لیے نواز شریف اپنے اوپر تمام تر تنقید سہتے ہوئے 4 جولائی 1999ء کو امریکی صدر بل کلنٹن سے ملنے گئے۔ انہوں نے وہاں امریکی مداخلت کے ذریعے ہماری فوج کی عزت بچائی جو اس وقت بھارتی افواج کی وجہ سے نہایت خطرے میں تھی۔ ٹھیک تین ماہ بعد اسی فوج نے نواز شریف کو ہتھکڑیاں لگا کر وزیر اعظم ہاؤس سے گرفتار کر لیا۔

نواز شریف اور جنرل مشرف میں بھی تنازعات پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ان اختلافات میں اصل تیزی اس وقت آئی جب یہ خبریں سامنے آنے لگیں کہ جنرل مشرف کوئٹہ کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل طارق پرویز کو نواز شریف سے ملاقات کرنے پر برطرف کرنے والے تھے۔

شہباز شریف، چوہدری نثار اور جنرل مشرف ڈنر پر اکٹھے ہوئے۔ جنرل مشرف نے انہیں بتایا کہ وہ جنرل طارق کو برطرف کرنے والے ہیں۔ نثار نے جنرل مشرف کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر ان کے خیال میں جنرل طارق کے خلاف ایکشن لینا بہت ضروری ہے تو انہیں برطرف کرنے کے بجائے ان کا کہیں ٹرانسفر کر دیں۔ جنرل مشرف نے چوہدری نثار کی اس تجویز سے اتفاق کیا۔

نثار نے شہباز شریف سے بھی کہا کہ وہ نواز شریف کو مت بتائیں کہ ان کی جنرل پرویز مشرف سے جنرل طارق کے معاملے پر کیا بات ہوئی تھی کیونکہ وزیر اعظم پہلے ہی خاصے ناخوش تھے۔ تاہم، شہباز شریف کے پیٹ میں یہ بات نہ رہ سکی اور انہوں نے جاتے ہی نواز شریف کو یہ بات فوراً بتا دی کہ جنرل مشرف جنرل طارق پرویز کو ان سے ملاقات کرنے کے الزام میں کوئٹہ کے کور کمانڈر کی پوزیشن سے ٹرانسفر کر رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب نواز شریف کی سسرال میں ہونے والی کسی کی موت پر جنرل مشرف ان سے تعزیت کے لیے ان سے ملنے گئے تو وزیر اعظم نے جنرل طارق کا معاملہ ان کے سامنے اٹھایا جس سے ان دونوں کے درمیان خلیج مزید بڑھ گئی۔ اگر ابھی بھی کوئی کمی رہ گئی تھی تو اخبار میں یہ خبر چھپ گئی کہ جنرل طارق کو وزیر اعظم نواز شریف سے ملاقات کرنے پر جنرل مشرف نے برطرف کر دیا ہے۔ یہ خبر پڑھ کر نواز شریف خاصے اشتعال میں آ گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ فوری طور پر آئی ایس پی آر اس کی ایک وضاحت جاری کرے۔ بات اتنی بڑھ گئی کہ کور کمانڈر راولپنڈی جنرل محمود نے یہ تجویز پیش کی کہ آئی ایس پی آر کے بجائے وزارت دفاع اپنی طرف سے ایک وضاحت جاری کر دے۔ تاہم، غصے سے بھرے نواز شریف نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔

اسی اثناء میں فوج میں یہ افواہ بھی پھیل گئی کہ نواز شریف چار جرنیلوں کو کارگل آپریشن کے متعلق وزیر اعظم کو بے خبر رکھنے کے الزام میں برطرف کرنا چاہتے ہیں جن میں جنرل محمود، جنرل عزیز، کور کمانڈر ناردرن ایریاز جنرل جاوید حسن اور ڈی جی ملٹری آپریشنز جنرل توقیر ضیاء شامل ہیں۔

نثار نے کہا کہ اس طرح کا تاثر فوج میں جان بوجھ کر پھیلایا گیا تھا تاکہ ایک سیاسی حکومت کو برطرف کر کے مارشل لاء لگایا جائے جیسا کہ جنرل ضیاء نے 1988ء میں جونیجو حکومت کو برطرف کرنے کے لیے اسی طرح کا بہانہ تراشا تھا کہ وزیر اعظم جونیجو اوجڑی کیمپ کے ذمہ دار جرنیلوں کے خلاف کارروائی کرنا چاہتے تھے۔

جنرل مشرف نے فوری طور پر چوہدری نثار اور شہباز شریف سے رابطہ کیا اور ان سے پوچھا کہ واقعی نواز شریف ان چار جرنیلوں کو برطرف کرنا چاہتے ہیں۔ جس پر ان دونوں نے انہیں یقین دلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ مشرف کو رام کرنے کے لیے انہیں نواز شریف سے چیئرمین جائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کا عہدہ بھی دلوا دیا گیا۔

اسی دوران میں جنرل مشرف کے قریبی جرنیلوں نے نواز شریف کو برطرف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ان کا پلان یہ تھا کہ اگر نواز شریف نے جنرل مشرف کو ہٹانے کی کوشش کی تو وہ اس پر ایکشن لیں گے۔ ان جرنیلوں نے سیاسی حکومت کو ایک باقاعدہ پیغام بھی بھیجا تھا کہ اگر جنرل مشرف کو ہٹانے کی کوشش کی گئی تو وہ اس پر شدید ردعمل ظاہر کریں گے۔ نواز شریف کے گرد بیٹھے سازشیوں نے انہیں خبردار کیا کہ اگر انہوں نے جنرل مشرف کو برطرف نہیں کیا تو فوج انہیں برطرف کر دے گی۔ دونوں اطراف نے اپنے تئیں برطرفی سے بچنے کے لیے اپنے اپنے انداز میں اپنا ردعمل ظاہر کیا اور فتح ان کی ہوئی جن کے پاس ٹینک اور توپیں تھیں۔

میں نے نثار سے پوچھا کہ سننے میں تو یہ بھی آیا تھا کہ جنرل مشرف چاہتے تھے کہ نواز شریف وزارت عظمیٰ کا عہدہ اپنے چھوٹے بھائی شہباز شریف کو دے دیں کیونکہ وہ انہیں زیادہ بہتر لیڈر سمجھتے تھے۔

میری بات سن کر چوہدری نثار مسکرائے اور بولے کہ دراصل شہباز شریف کو تھوڑی سی غلط فہمی ہوئی تھی۔ اگر آپ نواز شریف کے اقتدار کے آخری دن یاد کریں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ آرمی قیادت اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ وہ نواز شریف کو کسی بات پر ڈکٹیشن دیتی۔ جنرل مشرف نے دراصل مذاق میں یہ بات کی تھی۔ اصل واقعہ کچھ یوں تھا کہ جنرل مشرف، نثار اور شہباز اکٹھے لنچ کر رہے تھے جب جنرل مشرف نے مذاق کے انداز میں شہباز شریف سے کہا کہ آپ پنجاب پر حکمرانی کرنے کی بجائے اسلام آباد کیوں نہیں آ جاتے۔ مشرف کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اسلام آباد آ کر ایک طرح سے ڈپٹی پرائم منسٹر کا سا رول ادا کریں اور نواز شریف کو ان کے مسائل سلجھانے میں ان کی مدد کریں۔

○○○

12 اکتوبر 1999ء کی شام چوہدری نثار علی خان وزیراعظم ہاؤس میں موجود تھے جب نواز شریف نے جنرل پرویز مشرف کو برطرف کر کے جنرل ضیاء الدین بٹ کو آرمی چیف مقرر کر دیا۔ اس سے پہلے یکم اکتوبر کو چوہدری نثار علی خان ولی خان سے ملنے کے لیے لندن گئے تھے تا کہ وہ انہیں دوبارہ حکومت میں واپس لا سکیں۔ وہ لندن میں دس دن رہے اور 10 اکتوبر کو پاکستان واپس لوٹے تھے۔ چوہدری نثار نے 11 اکتوبر کو نواز شریف سے ملنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ وہ ملتان گئے ہوئے تھے۔

12 اکتوبر والے دن شہباز شریف نے چوہدری نثار کو وزیراعظم ہاؤس لنچ پر بلایا۔ دونوں نے وزیراعظم ہاؤس میں شہباز شریف کے کمرے میں بیٹھ کر لنچ کیا۔ ان دونوں کو بتایا گیا کہ وزیراعظم ابھی ملتان سے واپس لوٹے ہیں اور کسی میٹنگ میں مصروف ہیں۔ نثار اور شہباز نے وزیراعظم کو پیغام بھجوایا کہ وہ ساتھ والے کمرے میں موجود ہیں۔ جب وہ فارغ ہو جائیں تو انہیں بلا لیا جائے۔

اسی اثناء میں شہباز شریف سو گئے اور چوہدری نثار ٹی وی دیکھتے رہے۔ اچانک چوہدری نثار نے پی ٹی وی پر جنرل مشرف کی برطرفی کی خبر سنی اور فوری طور پر شہباز شریف کو جگایا۔ شہباز شریف کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ نواز شریف نے جنرل مشرف کو برطرف کر دیا ہے۔ انہوں نے بڑے غصے میں چوہدری نثار سے کہا کہ وہ ابھی جا کر وزیراعظم کو پنجاب کی وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیں گے کیونکہ اگر وہ اپنے سگے بھائی پر بھروسہ نہیں کر سکتے تو اس کے بعد وزیراعلیٰ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں!

نثار نے بپھرے ہوئے شہباز کو ٹھنڈا کیا اور کہا کہ ان کے لیے پہلے ہی بہت بڑے مسائل کھڑے ہو گئے ہیں، وہ اب نئے مسائل نہ کھڑے کریں۔ چوہدری نثار وزیراعظم ہاؤس سے نکلے اور راولپنڈی میں واقع اپنے گھر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد انہیں شہباز شریف کا فون آیا کہ چند فوجی افسران نے پی ٹی وی پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی، انہیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ نثار نے دوبارہ اپنی گاڑی نکالی اور وزیراعظم ہاؤس کی طرف دوڑا دی لیکن اب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ فوجی وزیراعظم ہاؤس کو گھیرے میں لے چکے تھے اور کسی نے انہیں اندر نہیں جانے دیا۔

چوہدری نثار کو سمجھ آ گئی کہ سارا کھیل ختم ہو گیا ہے۔

○○○

چوہدری نثار جب اپنے گھر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ فوجیوں نے اسے گھیرا ہوا تھا۔ پہلے تو انہوں نے انہیں گھر کے اندر جانے کی اجازت نہیں دی۔ آخرکار بحث کے بعد انہیں اندر جانے دیا گیا اور وہ دو سال تک اسی گھر میں قید رہے۔

ایک رات انہیں اپنڈکس کا شدید درد ہوا۔ وہ ساری رات درد سے تڑپتے رہے لیکن فوجیوں نے انہیں علاج کے لیے باہر نہیں جانے دیا۔ صبح کے وقت کہیں جا کر ان کا آپریشن ہوا۔

یہ چوہدری نثار علی خان کی زندگی کے سب سے مشکل ترین دن تھے۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک دن یہ فوجی ان کے گھر کے گرد گھیرا ڈال کر انہیں اپنے ہی گھر میں قید کر لیں گے۔ یہ فوجی ان کی اور ان کے بچوں کی ڈاک کو چیک کرتے تھے۔

ایک دن میجر اور ایف آئی اے کے دو آفیسرز چوہدری نثار سے ملنے کے لیے گھر آئے۔ ان دونوں نے نثار سے کہا کہ وہ نواز شریف کے خلاف ایک تحریری بیان دیں کہ انہوں نے ان سے رائیونڈ کے لیے گیس کی منظوری لی تھی۔ نثار نے ان سے کاغذ چھین لیا اور نواز شریف کے حق میں بیان لکھ کر دے دیا۔

جنرل مشرف کو چوہدری نثار کی اہمیت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ جس دن مشرف نے رفیق تارڑ کو ہٹا کر خود صدر بننے کا فیصلہ کیا، اس سے ایک دن پہلے غیر متوقع طور پر اس وقت کے ڈی جی آئی ایس آئی جنرل محمود ان کے گھر پر تشریف لائے۔ جنرل محمود تین گھنٹے تک چوہدری نثار کے ساتھ رہے۔ وہ دو گھنٹے پچاس منٹ تک بولتے رہے اور جنرل محمود سنتے رہے۔ ان تین گھنٹوں میں جنرل محمود صرف دس منٹ کے لیے بول پائے۔

جونہی جنرل محمود چوہدری نثار سے ہاتھ ملا کر صوفے پر بیٹھے نثار نے ان کے بولنے سے پہلے ہی ان پر تین باتیں بڑی واضح کر دیں۔ انہوں نے جنرل کو بتایا کہ وہ نواز شریف کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے، پی ایم ایل کیو کو جائن نہیں کریں گے اور جنرل مشرف کی حکومت کے حق میں کوئی بیان جاری نہیں کریں گے۔

جنرل محمود نے مسکراتے ہوئے کہا کہ چلیں یہ ٹھیک ہے کہ آپ نواز شریف کو نہیں چھوڑنا چاہتے ہیں لیکن نواز شریف کے بارے میں کیا خیال ہے جو انہیں چھوڑ کر رات کے اندھیرے میں جدہ چلے گئے تھے۔

نثار نے جنرل محمود سے کہا کہ اگر آج انہوں نے نواز شریف سے بے وفائی کر کے اس قید سے رہائی پا بھی لی تو وہ ساری عمر اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکیں گے۔

یہ بات سن کر جنرل محمود واپس چلے گئے۔

فوجیوں کے ہاتھوں اپنے گھر میں ہی دو سال تک قید رہنے کی وجہ سے چوہدری نثار کے بچوں پر بڑا شدید نفسیاتی اثر پڑا۔ اس برے وقت میں چوہدری نثار کے بچوں کو سب سے زیادہ دباؤ کا سامنا کرنا پڑا۔

جب چوہدری نثار اپنے گھر میں قید تھے تو جنرل مشرف نے انہیں اپنے ساتھ ملانے کی کوششیں جاری رکھیں۔ انہیں مختلف قسم کی آفرز دی جاتی رہیں۔ انہیں پی ایم ایل کیو کا صدر بنانے سے لے کر وزیر اعظم بنانے تک کی بھی پیشکش کی گئی۔

اسی اثناء میں پی ایم ایل نواز کے لیڈروں کی طرف سے چوہدری نثار علی خان پر انگلیاں اٹھائی جانے لگیں۔ سب کو اس بات کا پتہ تھا کہ جنرل مشرف کو آرمی چیف بنانے والے چوہدری نثار تھے لہذا حکومت کی برطرفی کا ذمہ دار ایک لحاظ سے انہیں بھی ٹھہرایا جا رہا تھا۔ ان دنوں کلثوم نواز اور تہمینہ دولتانہ نے جنرل مشرف کی حکومت کو مشکل میں ڈالا ہوا تھا۔ دھیرے دھیرے یہ بات مشہور ہونا شروع ہو گئی کہ جنرل مشرف نے نواز شریف، شہباز شریف، خواجہ آصف، اسحاق ڈار اور پارٹی کے دیگر ٹاپ لیڈروں کو تو جیلوں اور اٹک قلعے میں رکھا ہوا تھا جبکہ چوہدری نثار وہ واحد لیڈر تھے جنہیں گھر پر قید کیا گیا تھا۔ بہت سارے سوالیہ نشانات چوہدری نثار علی خان کی نواز شریف اور پارٹی سے وفاداری پر اٹھائے جا رہے تھے۔ اور تو اور، کلثوم نواز کی بھی یہی سوچ تھی کہ چوہدری نثار جنرل مشرف کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور اس کے بدلے میں انہیں جیل کے بجائے گھر میں رکھا گیا ہے۔ یہ ساری باتیں کلثوم نواز، نواز شریف کے کانوں میں ڈال رہی تھیں جب وہ ان سے ملنے جیل جاتیں۔ اسی اثناء میں یہ بات بھی مشہور کی گئی کہ کسی نے رات کے اندھیرے میں چوہدری نثار کو باقاعدہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے چکری کی طرف جاتے ہوئے موٹروے پر دیکھا تھا۔ ان تمام باتوں کا نواز شریف پر بڑا اثر ہو رہا تھا۔ انتہائی غیر محسوس طریقے سے نواز شریف ان باتوں پر قائل ہونا شروع ہو گئے تھے کہ چوہدری نثار علی خان بھی جنرل مشرف کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ نواز شریف کا ان باتوں پر فوراً یقین کرنے کی ایک وجہ اور بھی تھی کہ

جنرل مشرف اور چوہدری نثار پچھلے کئی برسوں سے ایک دوسرے کے دوست تھے اور نثار کے کہنے پر ہی انہیں آرمی چیف مقرر کیا گیا تھا۔

چوہدری نثار کو ان باتوں کا علم نہیں تھا۔ انہیں پہلی دفعہ نواز شریف کا ان کی ذات پر شک کرنے کا اس وقت پتہ چلا جب ان کی قید ختم کی گئی۔ چوہدری نثار رہائی کے بعد سیدھے لندن چلے گئے، وہاں انہیں نواز شریف کا فون آیا۔ انہوں نے پوچھا کہ انہوں نے رہائی کے بعد جہاں دیگر لوگوں کا نام لے کر شکریہ ادا کیا وہاں انہوں نے ان کا نام کیوں نہیں لیا۔ اس پر چوہدری نثار نے انہیں جواب دیا کہ میاں صاحب! مجھے ان تمام لوگوں نے فون کر کے مبارکباد دی تھی۔ میں آپ کے فون کا انتظار کرتا رہا لیکن آپ نے کبھی فون کر کے مبارکباد نہیں دی لہٰذا میں نے بھی آپ کا شکریہ ادا کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

چوہدری نثار اور نواز شریف کے درمیان ٹیلی فون پر ہونے والی اس مختصر گفتگو کے بعد یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ اب دونوں کے سیاسی اور ذاتی تعلقات جو 1985ء میں شروع ہوئے تھے، وہ سترہ سال بعد آخر کار شکوک و شبہات کی نذر ہو گئے تھے۔ چوہدری نثار نے سیاست چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جب وہ واپس آئے تو انہوں نے اپنے قریبی ساتھیوں کو بتایا کہ انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ سیاست کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیں گے۔ چوہدری نثار کے ساتھیوں نے اس پر بڑا شدید ردعمل ظاہر کیا۔ انہوں نے چوہدری نثار کو اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب نثار کے لیے ایک اور بڑا مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ وہ کس پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑیں کیونکہ وہ اپنے تئیں مسلم لیگ نواز کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ چکے تھے جس کی قیادت نے انہیں اس بات پر سراہنے کی بجائے کہ انہوں نے پارٹی سے برے وقتوں میں غداری نہیں کی تھی، ان پر شک کیا تھا کہ وہ شاید جنرل مشرف کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور ان کی کردار کشی کی گئی تھی۔

چوہدری نثار نے مجھے بتایا کہ اپنی سیاسی تاریخ کے اس اہم مرحلے پر میرے پاس دو راستے تھے یا تو میں پی ایم ایل نواز کے ساتھ چمٹا رہوں یا پیپلز پارٹی کو جوائن کر لوں۔

انہوں نے بینظیر بھٹو کی قریبی ساتھی آمنہ پراچہ جو ان کی قریبی فیملی فرینڈ تھیں کے ذریعے پیپلز پارٹی جوائن کرنے کے لیے خفیہ بات چیت بھی شروع کر دی تھی۔

جب اس بات کا پتہ شہباز شریف کو چلا کہ چوہدری نثار نے سیاست ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو انہوں نے فوری طور پر چوہدری نثار کو اس سے روکا۔ اکتوبر 2002ء کے الیکشن سر پر تھے۔ شہباز شریف نے چوہدری نثار کو اپنی پرانی دوستی کا حوالہ دے کر اپنی پارٹی کی طرف سے الیکشن لڑنے پر راضی کر لیا۔

نواز شریف نے فون کر کے چوہدری نثار علی خان کو جدہ آنے کی دعوت دی۔ جب تین سال بعد نواز شریف اور چوہدری نثار کی ملاقات ہوئی تو نثار نے گلہ کیا کہ جنرل مشرف کی برطرفی سے پہلے ان سے مشورہ کیوں نہیں کیا گیا تھا۔ اس پر نواز شریف نے یہ جواز پیش کیا تھا کہ اگر وہ انہیں اور شہباز شریف کو یہ بات بتاتے تو شاید وہ انہیں جنرل مشرف کو برطرف نہ کرنے دیتے اور وہ ہر قیمت پر جنرل کو گھر بھیجنا چاہتے تھے۔ چوہدری نثار نے نواز شریف سے یہ بھی شکایت کی کہ وہ ان تین سالوں میں اچھے برے حالات سے گزرے لیکن انہوں نے کبھی ان سے یا پارٹی سے بے وفائی نہیں کی لیکن اس کے باوجود بھی پارٹی کے لیڈران کے خلاف پراپیگنڈہ کرنے میں مصروف تھے۔

چوہدری نثار علی خان کا اشارہ کلثوم نواز کی طرف تھا جن سے کئی برسوں سے ان کی بول چال تک بند تھی اور آج تک ہے۔

○○○

جب میں چوہدری نثار علی خان سے 2003ء میں ان کے گھر پر ملا تھا، اس وقت پاکستان کا نیوکلیئر ایشو ایک دفعہ پھر تنازعات میں گھر چکا تھا۔ باتوں باتوں میں چوہدری صاحب نے اس بات کا انکشاف کیا کہ 1991ء میں ایک دن اس وقت کے آرمی چیف چوہدری نثار سے ملے اور انہیں وزیر اعظم نواز شریف کے نام ایک بڑا خفیہ پیغام دیا۔ جنرل اسلم کے بقول کہ اگر پاکستان ایک مسلم ملک کو نیوکلیئر ٹیکنالوجی فراہم کرنے پر تیار ہو جائے وہ تو اس کے بدلے میں بارہ ارب ڈالر دینے کو تیار تھا۔

یہ سن کر چوہدری نثار علی خان جو اس وقت وزیر پٹرولیم کے علاوہ نواز شریف کے اسپیشل اسسٹنٹ بھی تھے، ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ انہوں نے جنرل کو بتایا کہ اس طرح کی

سودے بازی پاکستان کے مفاد میں ہرگز نہیں ہے۔ حیرانی میں ڈوبے چوہدری نثار نے جنرل سے پوچھا کہ انہیں اس بات کا احساس ہے کہ وہ وزیراعظم کے نام کس طرح کی تجویز بھیج رہے ہیں اور پاکستان پر مسلم ملک کو نیوکلیئر ٹیکنالوجی ایکسپورٹ کرنے کے الزامات کی بنا پر کس طرح کے سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

آرمی چیف چوہدری نثار کی یہ بات سن کر پھر بھی اپنی بات پر ڈٹے رہے اور انہوں نے کہا کہ آپ ایک دفعہ وزیراعظم نواز شریف سے بات تو کریں۔ وہ اس ڈیل کے ذریعے پاکستان کو بڑی آسانی سے بارہ ارب ڈالر دلوا سکتے تھے۔

جب چوہدری نثار نے نواز شریف کو جنرل کی اس پیشکش کے بارے میں بتایا تو وہ بھی ششدر رہ گئے اور انہوں نے نہایت نفرت بھرے لہجے میں اس تجویز کو نہ صرف مسترد کیا بلکہ کہا کہ کس طرح آرمی چیف کسی بھی ملک کو نیوکلیئر ٹیکنالوجی فروخت کرنے کی اس طرح کی احمقانہ تجاویز اپنے دماغ میں لیے گھوم رہا ہے۔

یہ واقعہ سنا کر چوہدری نثار نے مجھے کہا کہ عمومی طور پر ہمارے یہ فوجی جرنیل سیاسی قیادت کو نااہل سمجھتے ہیں کہ شاید یہ ملک چلانے کے قابل نہیں ہوتے۔ اب بھلا بتائیں کہ ایسے آرمی چیف کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو شخص امریکہ کو سبق سکھانے کے نام پر ایک اسلامی ملک کو بارہ ارب ڈالر کے عوض ایٹم بم فروخت کرنے کا منصوبہ بنا لیتے ہیں۔

میں چوہدری نثار کی یہ بات سن کر یہ سوچتا اور مسکراتا ہوا ان کے گھر سے باہر آ گیا کہ جنرل اسلم بیگ پہلے آرمی چیف نہیں تھے جن کے ذہن میں اتنے بڑے بڑے اعلیٰ خیالات پرورش پا رہے تھے۔ جنرل بیگ سے بڑا کام تو جنرل مشرف نے کر دکھایا تھا جنہوں نے نہ صرف کارگل پر جنگ شروع کی، نواز شریف کے ذریعے امریکہ کو درمیان میں ڈال کر بھارت کو حملہ کرنے سے بچایا اور اسی کارگل کو استعمال کر کے وزیراعظم کو گھر بھیجا اور نو سال حکومت کی اور سب سے بڑھ کر انہوں نے چوہدری نثار کو استعمال کر کے اپنے آپ کو آرمی چیف بھی لگوایا تھا۔

سیاستدان کتنے ہی چالاک کیوں نہ ہو جائیں وہ اداروں سے ان فوجی جرنیلوں کے مقابلے میں

زیرو ہیں۔ آپ تصور کریں کہ اگر سیاسی طور پر چالاک اور سمجھدار یہ فوجی جرنیل ہمارے سیاستدان ہوتے اور مودب اور اوسط درجے کی ذہانت رکھنے والے یہ سیاستدان ان کے جگہ فوجی جنرل ہوتے تو شاید پاکستان آج ایک ترقی یافتہ ملک بن چکا ہوتا!

○○○

میرا چوہدری نثار علی خان کے بارے میں تاثر بڑا اچھا تھا۔ تاہم، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مجھ جیسے سیاسی رپورٹنگ کے شوقین بہت جلد ان لیڈروں کی باتوں میں آ جاتے ہیں اور انہیں پتہ نہیں کیا کچھ سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ جونہی چوہدری نثار نے قومی اسمبلی میں اپنے پر پرزے پھیلانا شروع کیے تو یہ وہ شخص نہیں تھے جن سے مل کر میں نے ان کا انٹرویو کیا تھا۔ ان کی آواز اور رویے میں رعونت اور تکبر آ چکا تھا۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کسی سے ہاتھ بھی ملائیں تو اس کے بعد واش روم جا کر اپنے ہاتھ دھوتے ہیں۔ ایک دن انہوں نے مجھے بلا کر جنرل مشرف کے ایک وزیر کے سکینڈل کے دستاویزی ثبوت دیے۔ وہ وزیر ان کے حلقے میں ان کا روایتی حریف تھا۔ خبر اچھی تھی لہذا میں نے فائل کر دی۔ کچھ دنوں بعد ان کا مجھے پھر فون آیا۔ وہ بڑے پریشان تھے۔ چکری کے قریب واقع ان کے گاؤں سے ملحقہ زمینوں کو فوجیوں نے ایکوائر کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ وہاں کوئی فوجی تنصیب بنانا چاہتے تھے۔ چوہدری نثار کی اپنی زمینیں بھی اس میں آ رہی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ میں اس پر ایک سٹوری قلمبند کروں۔ انہوں نے مجھے کچھ کاغذات بھی دیے۔ میں نے اپنے ایڈیٹر سے بات کی تو انہوں نے زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بہرحال، میں نے میرٹ پر اپنے ایڈیٹر کو راضی کر لیا کہ ہمیں یہ خبر شائع کرنی چاہیے۔ اس کام میں دو تین دن لگ گئے۔ ایک شام مجھے چوہدری نثار کا بڑے غصے میں فون آیا کہ میں نے اب تک وہ خبر کیوں نہیں فائل کی۔ میں ان کی ٹون سن کر بڑا حیران ہوا۔ وہ ایسا ظاہر کر رہے تھے جیسے وہ میرے باس ہوں اور میں کسی سرکاری محکمے کا ملازم۔ اس دن کے بعد میرے ان سے بھی تعلقات ٹھیک نہیں رہے ہیں نہ میں نے کبھی ان سے ہاتھ ملانے کا سوچا ہے۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ سب سیاستدان صحافیوں کو محض استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ ان کی مرضی کی خبر کر دیں تو آپ بڑے اچھے اور زبردست صحافی ہیں۔ اگر آپ اپنا پروفیشنلزم کو فالو کریں گے تو پھر یہ ایک لمحے میں اپنی اوقات پر آ جاتے ہیں۔ میں نے چوہدری نثار کے اس رویے سے اجتناب برتا اور اس کے بعد میں

نے کسی سیاستدان کو اپنا دوست سمجھنے کی حماقت نہیں کی۔ چوہدری نثار سے رہی سہی امیدیں اس وقت ختم ہو گئیں جب ڈان ٹی وی کے رپورٹر اعزاز سید نے اپنے چینل پر یہ خبر بریک کی کہ چوہدری نثار اور شہباز شریف آرمی چیف اشفاق پرویز کیانی سے اب تک چھ خفیہ ملاقاتیں کر چکے تھے۔ اس خبر سے یہ بات ثابت ہوئی کہ جیلوں میں مار کھانے کے باوجود بھی یہ سیاستدان فوج کے ساتھ مل کر اس ملک اور اس کی سیاست کے خلاف سازشیں کرنے سے باز نہیں آتے۔ جنرل مشرف کے دور میں ماضی سے سبق حاصل کرنے کے دعویدار ایک دفعہ پھر سے آرمی چیف کے دروازے پر رات کو چوروں کی طرح دستک دے رہے تھے۔

جنرل علی قلی خان

جس دن میں نے چوہدری نثار علی خان کا انٹرویو کیا تھا اور انہوں نے جنرل علی قلی کے بارے میں کچھ ایسی باتیں کی تھیں جس کے بعد مجھے یہ یقین تھا کہ اس سابق جنرل سے اب گفتگو کرنا شاید اتنا مشکل نہیں رہ گیا ہے۔ ایک دن میں اسلام آباد میں واقع فرانسیسی سفارتخانے کی کسی تقریب میں شامل ہونے کے لیے گیا تو وہاں علی قلی کے بھائی رضا علی خان سے ملاقات ہوئی۔ پتہ چلا وہ پشاور میں فرانسیسی قونصل خانے میں اپنی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ میرے لیے یہ بڑا سنہری موقع تھا کہ میں جنرل قلی کے بھائی کے ذریعے ان کا انٹرویو کرنے کی کوشش کروں کیونکہ نثار کے انٹرویو کے بعد مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جنرل علی کے پاس بتانے کو بہت کچھ ہوگا۔

دو تین بعد آخر میرا جنرل علی قلی سے رابطہ ہو گیا۔ میرا اندازہ درست نکلا، انہوں نے چوہدری نثار کا انٹرویو پڑھ لیا تھا اور اب وہ مجھے گفتگو کرنے کا وقت دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

میں جنرل علی قلی سے ملنے کے لیے ان کے راولپنڈی میں جی ایچ کیو کے قریب واقع گھر میں گیا۔ جنرل قلی اس وقت گھر پر اکیلے تھے۔ انتہائی عزت و احترام اور شائستگی کے ساتھ وہ مجھے اندر لے گئے اور بتانے لگے کہ ساتھ والا گھر سابق آرمی چیف جنرل وحید کاکڑ کا ہے۔ جونہی انہوں نے جنرل کاکڑ کا نام لیا تو میرے اندر ایک رپورٹر کا لالچ پھر جاگ پڑا اور میں نے ان سے اسی وقت درخواست کر

ملی کے دور جنرل کاکڑ سے وقت لے کر ملاقات شروع کر دیں۔ میں ان کا دل سے مشکور ہوں کہ ابھی میں جنرل علی قلی سے جنرل کاکڑ کا تذکرہ شروع کرنے کی بات کر رہا تھا کہ ایک ہینڈسم نوجوان جنرل قلی کے گھر آ گیا۔ جنرل صاحب نے اس سے میرا تعارف کروایا اور بتایا کہ یہ جنرل وحید کاکڑ کے بیٹے ہیں۔ میں دل ہی دل میں بہت خوش ہوا کہ چلیں اتفاق سے قسمت میرے حق میں تھی اور ہو سکتا ہے کہ بہت جلد کاکڑ صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے اور 1990ء کے پاکستانی سیاست کے انتہائی اہم سالوں پر سے پردہ اٹھایا جا سکے کہ کیسے انہوں نے نواز شریف اور غلام اسحاق خان کو گھر بھیجنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ تاہم آنے والے دنوں میں میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا کیونکہ بقول علی قلی وہ ایک ریٹائرڈ زندگی گزار رہے تھے اور کسی صحافی سے ملنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

میں نے باتوں باتوں میں جنرل علی قلی کو تھوڑا سا مایوس پایا۔ اپنے ساتھ اس ہونے والی ناانصافی پر وہ پانچ سال بعد بھی ناخوش تھے۔ باپ سے بیٹا اور بیٹے سے پوتے تک فوج میں جانے کی روایت ٹوٹ گئی تھی۔ علی قلی کا بیٹا فوج میں چھ سال نوکری کرنے کے بعد کیپٹن کے طور پر ریٹائرڈ ہو کر گھر آ گیا تھا۔ یوں جنرل حبیب اور جنرل علی قلی کی روایت تیسری نسل پر آ کر ختم ہو گئی تھی۔

علی قلی نے مجھے جو اصل بات بتائی وہ یہی تھی کہ انہیں سینئر موسٹ ہونے کے باوجود بھی آرمی چیف نہیں بنایا گیا تھا اور یہ ان کا حق بنتا تھا۔ جب جنرل علی قلی نے یہ خبر سنی کہ جنرل مشرف کو چیف آف آرمی سٹاف بنا دیا گیا تھا تو انہوں نے اسی وقت خدا کا شکر ادا کیا کہ آج ان کا باپ جنرل حبیب یہ خبر سننے کے لیے زندہ نہیں تھا۔

جنرل حبیب ایک پروفیشنل اور قابل جنرل تھے۔ جنرل حبیب اور جنرل موسیٰ دونوں کورس میٹ بھی تھے۔ جنرل موسیٰ ایک رنگروٹ تھے جبکہ اس کے برعکس جنرل حبیب نے باقاعدہ انڈین ملٹری میں کمیشن کے ذریعے آرمی جوائن کی تھی۔ اگرچہ جنرل موسیٰ اس وجہ سے سینئر تھے کہ ان کا پاس آؤٹ جنرل حبیب سے پہلے ہوا تھا لیکن جہاں تک اہلیت اور خوبیوں کا تعلق تھا ان کا جنرل حبیب سے کوئی جوڑ نہیں بنتا تھا۔ جنرل ایوب کو دراصل ایک اوسط درجے کے جنرل کی ضرورت تھی اور جنرل موسیٰ ان کی ذات کے لیے بہت موزوں تھے۔ یوں 1959ء میں صرف 46 سال کی عمر میں جنرل ایوب نے جنرل حبیب کو ریٹائرڈ کر دیا۔

جب جنرل حبیب ایک افسردہ اور ٹوٹے دل کے ساتھ ریٹائرڈ ہو کر گھر آئے تو انہوں نے اپنے بیٹے قلی کو بلایا اور اسے کہا کہ جاؤ آرمی جوائن کرو کہ تم نے ایک دن آرمی چیف بننا ہے۔

اپنے باپ کے بارے میں بات کرتے ہوئے علی قلی تھوڑے سے جذباتی ہوئے اور ماضی میں کھو گئے۔ وہ مجھے بتانے لگے کہ جب ان کی سب سے پیاری بیٹی مس زیب (جو 2003ء میں ایم این اے تھیں۔ وہ گوہر ایوب کی بیوی اور عمر ایوب خان کی والدہ ہیں) ان سے ملنے کراچی گئیں تو وہ اپنے بیٹے علی قلی کے فوج میں مستقبل کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اگرچہ وہ بستر پر بیمار پڑے تھے لیکن وہ اپنے بیٹے کے فوج میں مستقبل کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ جنرل حبیب نے اپنی بیٹی کو بتایا کہ ان سے انتہائی ضروری بات کرنی ہے۔ اپنے باپ کی یہ بات سن کر زیب خاصا سیریس ہو گئیں۔ وہ اپنے باپ کی طرف جھکیں تا کہ وہ سن سکیں کہ وہ ایسی کونسی خاص بات ان سے کرنا چاہتے تھے۔

جنرل حبیب نے اپنی بیٹی کے کانوں میں سرگوشی کی اور بولے کہ زیب دیکھو تمہارا بھائی جنرل علی آج اپنی محنت اور قابلیت کی بنیاد پر اتنے بڑے عہدے پر پہنچا ہے۔ تمہارے شوہر گوہر ایوب خان کی سیاست اس کے آرمی چیف بننے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننی چاہیے۔ تم لوگوں کی وجہ سے علی قلی کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہونا چاہیے۔

ایک بیٹی نے اپنے باپ کو حیران بھری نظروں سے دیکھا اور بولی کہ بابا! آپ یہ کیسے سوچ سکتے ہیں کہ ایک سگی بہن اپنے میاں کی سیاست کی وجہ سے اپنے بھائی کو مسائل میں گھرتے دیکھ سکتی ہے۔

زیب نے اپنے باپ کو تسلی دی کہ وہ پریشان نہ ہوں۔ اللہ بہتر کرے گا۔

جنرل قلی اب اپنے باپ کی یادداشتوں میں کھو چکے تھے۔ اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد جنرل حبیب کی زندگی اتنی آسان نہیں رہی تھی۔ وہ نوجوان تھے۔ انہوں نے کاروبار کرنے کا فیصلہ کیا۔ جونہی ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت آئی تو جنرل حبیب پر کرپشن کے الزامات لگا کر انہیں جیل بھیج دیا گیا۔

اصل وجہ کچھ اور تھی۔

دراصل جنرل حبیب اور جنرل یحییٰ خان ایک دوسرے کے بڑے قریب تھے۔ جنرل یحییٰ نے کسی دور میں جنرل حبیب کے ساتھ کام کیا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یحییٰ چاہتے تھے کہ جنرل حبیب نیشنل پریس ٹرسٹ کو چلائیں۔ شروع میں جب حبیب نے مزاحمت کی تو ان کا خیال تھا کہ ان کے پاس کسی

اخباری ادارے کو چلانے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ تاہم جنرل یحییٰ نہیں مانے۔ وہ چاہتے تھے کہ جنرل حبیب اس ادارے کے مالی معاملات کو سنبھالیں۔ مشہور صحافی اور کالم نگار زیڈ اے سلہری کو این پی ٹی کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ انہی دنوں پاکستان ٹائمز میں ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف ایک خبر چھپی۔ اس خبر کا جنرل حبیب سے کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ وہ اخبار کے ایڈیٹر تو نہیں تھے۔ تاہم ذوالفقار علی بھٹو اس خبر سے بے حد شدید ناراض ہوئے اور انہوں نے یہ بات دل میں رکھ لی۔ ان دنوں پاکستان میں نئے الیکشن ہو رہے تھے۔ ایک دن ذوالفقار علی بھٹو زاہد اور مصطفیٰ کھر کے ساتھ جنرل حبیب سے ملنے آئے اور ان سے اپنی پارٹی کے لیے چندہ مانگا کیونکہ جنرل حبیب اپنا ذاتی کاروبار کرتے تھے۔

جنرل علی قلی کے لبوں پر ایک مسکراہٹ پھیلی۔ انہوں نے مجھے کہا کہ دراصل ان کے والد کا مزاج ایک فوجی کا تھا نہ کہ ایک بزنس مین کا۔ انہوں نے بھٹو صاحب کو ان کی پارٹی کے لیے چندہ دینے سے انکار کر دیا۔ بات اگر یہیں تک رہتی تو بھی معاملہ ٹھیک تھا۔ جنرل حبیب نے بھٹو صاحب کو یہاں تک کہہ دیا کہ کیونکہ وہ ذاتی طور پر مسلم لیگ کے ساتھ ہیں لہٰذا وہ اس پارٹی کو انتخابات جیتنے کے لیے اپنی جیب سے چندہ دے چکے ہیں۔

جنرل علی قلی کے بقول ان کے والد صاحب کو بھٹو صاحب کے مزاج کا اندازہ نہیں تھا۔ بھٹو صاحب نے ان کے باپ کی اس بات کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا اور جونہی وہ اقتدار میں آئے جنرل حبیب کو گرفتار کر کے ہری پور جیل بھیج دیا گیا۔ جونہی جنرل حبیب کی گرفتاری کی خبر پھیلی تو سب لوگوں نے بھٹو صاحب کے اس فیصلے کی شدید مذمت کی اور صرف چھ دن بعد جنرل حبیب کو رہا کر دیا گیا۔

اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ جو نقصان پہنچنا تھا وہ پہنچ چکا تھا۔ بھٹو صاحب نے جنرل حبیب کی تمام فیکٹریاں سرکاری قبضے میں لے لیں۔ اگرچہ جنرل حبیب نے بھٹو صاحب کے ہاتھوں بہت نقصان اٹھایا اور تکلیفیں دیکھیں لیکن انہوں نے کبھی بھٹو صاحب کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

اپنی گرفتاری اور فیکٹریاں کھونے کے بعد جنرل حبیب بیرون ملک لندن چلے گئے۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ کچھ عرصے میں بھٹو صاحب کو جنرل حبیب کی ضرورت پڑ گئی۔ اسلم خٹک ان دنوں صوبہ سرحد کے گورنر تھے۔ بھٹو صاحب وہاں اپنے سیاسی مخالفین کو کچھ سبق سکھانا چاہتے تھے۔ اسلم خٹک نے بھٹو صاحب کی بات پوری کرنے سے انکار کر دیا [illegible] جب کہ

انہوں نے ان کے بھائی جنرل حبیب کو جیل میں ڈالا تھا۔

آخر مجبور ہو کر بھٹو صاحب نے لندن جنرل حبیب کو ایک پیغام بھیجا۔ بہت ساری کوششوں کے بعد بھٹو صاحب اور جنرل حبیب میں اختلافات ختم کرائے گئے۔

میں نے جنرل علی قلی سے پوچھا کہ جب ان کے والد جنرل حبیب کو بھٹو کی پھانسی کی خبر ملی تو ان کا اس پر کیا ردعمل تھا؟

جنرل علی نے کہا کہ اب تو اس بات پر سب لوگ متفق ہیں کہ بھٹو صاحب کو پھانسی دینے کا فیصلہ بہت غلط تھا۔ جنرل ضیاء کو انہیں پھانسی نہیں دینی چاہیے تھی۔ جنرل قلی کے خیال میں یہ بھی ایک تکلیف دہ حقیقت تھی کہ جنرل ضیاء اور بھٹو صاحب کے درمیان معاملات اتنی دور تک چلے گئے تھے جہاں ان میں سے صرف ایک ہی زندہ رہ سکتا تھا۔ تاہم، جنرل قلی کے خیال میں جنرل ضیاء نے بھٹو کو پھانسی دے کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔

میں نے جنرل علی قلی کو اپنے باپ کے ساتھ جڑی ماضی کی یادوں سے نکالنے کی خاطر ٹاپک چینج کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ وہ پاکستان آرمی میں کیسے آئے تھے؟

جنرل علی قلی نے کہا کہ اس میں کوئی اتنی بڑی نئی بات نہیں تھی کیونکہ وہ ایک فوجی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور وہ شروع سے ہی فوج میں جانے کے خواہش مند تھے۔ انہوں نے 29 پی ایم اے میں کمیشن لیا اور اپنی اچھی پرفارمنس کی وجہ سے انہیں لندن کے Sand Hurst School بھیجا گیا۔ یہ معمولی بات نہیں تھی۔ وہاں بھی جنرل علی قلی نے انتہائی قابلیت کا مظاہرہ کیا اور انہیں بہترین غیر ملکی کیڈٹ کا ایوارڈ دیا گیا۔ بہت کم لوگوں کو پتہ ہوگا کہ جنرل مشرف اور علی قلی بیچ میٹ تھے۔ علی قلی خان نے اپنے کورس میں ٹاپ کیا جبکہ جنرل مشرف کی گیارہویں پوزیشن تھی۔ ان کے ایک اور بیچ میٹ شمیم شریف تھے۔ وہ بھی ایک شاندار آرمی آفیسر تھے جو بعد میں قطر میں شہید ہو گئے۔ تیسرے اہم بیچ میٹ کرنل افضل تھے جو اس وقت (2003) پاکستان اسٹیل ملز کے چیئرمین تھے۔ لیفٹیننٹ جنرل خالد نواز، میجر جنرل زیدی اور سابق ڈی جی آئی ایس آئی رانا نسیم بھی ان کے کورس میٹ تھے۔

یہی وجہ تھی کہ جب 1998ء میں ایک نئے آرمی چیف کی تقرری کا سوال اٹھا تو اس وقت کی بنائی لسٹ پر وہ سرفہرست تھے۔ ان کے بعد جنرل خالد نواز، جنرل پرویز مشرف اور جنرل نسیم رانا

تھے۔ جنرل ضیاء الدین بٹ ان سے جونیئر تھے اور فہرست میں پانچویں نمبر پر تھے۔

جنرل قلی مجھے بتانے لگے کہ فوج میں میجر، کرنل، بریگیڈیئر اور میجر جنرل کی ترقی ایک سلیکشن پراسس کے ذریعے ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی جب جنرل جہانگیر کرامت نے جو اس وقت آرمی چیف تھے، چیف آف جنرل سٹاف کی تقرری کرنی تھی تو جنرل علی قلی کو یہ عہدہ دیا گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت تک ان کے بیچ میٹ جنرل زیدی پہلے ہی ریٹائرڈ ہو چکے تھے۔ اب اس پوسٹ کے لیے مقابلہ جنرل علی قلی، جنرل خالد نواز اور جنرل پرویز مشرف کے درمیان تھا جو تینوں بیچ میٹ تھے۔ جنرل جہانگیر کرامت نے علی قلی کی پروفیشنل قابلیت اور اہلیت کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں جنرل پرویز مشرف اور جنرل خالد نواز پر فوقیت دی۔ جنرل نسیم رانا کی ترقی ان سے کچھ دن بعد ہوئی تھی لہٰذا وہ اس دوڑ سے نکل چکے تھے۔ چند دنوں بعد اس وقت کے چیف آف جنرل سٹاف جنرل افتخار علی خان (چوہدری نثار علی خان کے بڑے بھائی) ریٹائرڈ ہونے والے تھے۔ جنرل قلی اس وقت راولپنڈی کے کور کمانڈر تھے۔ اپنی پروموشن پر جنرل جہانگیر کرامت کا شکریہ ادا کرنے وہ ان سے ملنے گئے تو جنرل کرامت نے انہیں کہا کہ انہیں چیف آف جنرل سٹاف بنا کر انہوں نے کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ انہوں نے ایک حقدار کو صرف اس کا حق دیا تھا۔

جنرل جہانگیر کرامت سے ملنے کے بعد علی قلی خان اپنے قریبی دوست جنرل افتخار علی خان جن کی جگہ اب ان کی تعیناتی ہوئی تھی سے ملنے کے لیے گئے تاکہ وہ ان کا بھی شکریہ ادا کریں۔ وہ جنرل افتخار کا رویہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ جنرل قلی جنرل افتخار کو اپنا ذاتی دوست سمجھتے تھے۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کا دوست ان کی ترقی پر خوش نہیں ہوگا۔ جنرل افتخار کا یہ رویہ دیکھ کر جنرل علی قلی کو بڑا صدمہ ہوا۔ جنرل قلی کو اس وقت یہ احساس ہو گیا کہ کہیں نہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے کیونکہ اگر جنرل افتخار جیسا پرانا دوست بھی ان کے ساتھ اچھے طریقے سے پیش نہیں آ رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ معاملات درست نہیں ہیں۔ جنرل علی قلی اور جنرل افتخار کی دوستی دو نسلوں سے چلی آ رہی تھی کیونکہ ان دونوں کے والد انڈین آرمی کے دنوں سے ایک دوسرے کے دوست تھے۔

جب جنرل علی قلی جنرل افتخار کے دفتر میں داخل ہوئے تو جنرل افتخار نے کہا کہ ہاں مجھے تمہاری چیف آف جنرل سٹاف کے عہدے پر تعیناتی کی خبر پہلے ہی مل چکی ہے۔ جنرل افتخار نے انتہائی بے مروتی سے کہا کہ میں نے تین ہفتے بعد یہ کرسی چھوڑنی ہے۔ تم صرف اس وقت ہی آ کر میری اس کرسی پر بیٹھ سکتے ہو۔

جنرل علی قلی کو ایک شدید دھچکا لگا کیونکہ وہ تو اپنے اس دوست کے پاس Courtesy call کرنے گئے تھے۔ انہیں بھی پتہ تھا کہ انہوں نے چیف آف جنرل سٹاف کی کرسی پر تین ہفتے بعد بیٹھنا ہے۔

جنرل علی قلی خان کو جنرل افتخار علی خان کے اس سرد رویے کا معمہ فوراً سمجھ میں آ گیا جب انہوں نے جنرل افتخار کے دفتر کی کھڑکی سے باہر جنرل پرویز مشرف کو چلتے پھرتے دیکھا۔ جنرل علی قلی بڑے حیران ہوئے کہ جنرل مشرف جو اس وقت منگلا کے کور کمانڈر تھے وہ وہاں کیا کر رہے تھے؟

جنرل علی قلی نے اپنی حیرانی پر قابو پایا اور جنرل افتخار سے کہا کہ آپ جنرل پرویز مشرف کو اندر بلائیں اور تینوں بیٹھ کر گپ شپ کریں۔

جب جنرل پرویز مشرف کمرے میں داخل ہوئے تو جنرل قلی بڑے گرم جوش انداز سے آگے بڑھ کر جنرل پرویز مشرف سے ملنے لگے تو انہوں نے محسوس کیا کہ جنرل مشرف کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ جنرل مشرف یہ توقع کر رہے تھے کہ انہیں چیف آف جنرل سٹاف بنایا جائے گا۔

جب جنرل جہانگیر کرامت کو غیر معمولی طور پر یہ پتہ چلا کہ جنرل پرویز مشرف چیف آف جنرل سٹاف جنرل افتخار کے پاس اس دن دفتر میں موجود تھے تو انہوں نے جنرل افتخار کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ جنرل صاحب! مجھے یہ بتائیں کہ مشرف آپ کے دفتر میں کیا کر رہے تھے؟ آپ نے انہیں بلایا تھا یا پھر وہ چھٹی لے کر آپ سے ملنے آئے تھے۔ جہانگیر کرامت نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جنرل افتخار سے پوچھا کہ آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے کور کمانڈر منگلا جنرل مشرف کو اپنے دفتر میں کیوں بلایا تھا؟

جنرل افتخار نے جہانگیر کرامت کو بتایا کہ دراصل جنرل مشرف چیف آف جنرل سٹاف نہ بننے پر خاصے ڈسٹرب تھے۔

یہ بات اتنی آسان نہیں تھی جتنی جنرل قلی سمجھ رہے تھے۔

کھچڑی پکنا شروع ہو چکی تھی۔

کچھ دنوں بعد جنرل جہانگیر کرامت کو پتہ چلا کہ جنرل محمود نے جنرل پرویز مشرف کے خلاف ایک رپورٹ ان کو بھجوائی ہے۔ جنرل کرامت نے جنرل محمود کو بلوایا اور ان کی سخت سرزنش کی کہ آپ ملٹری قیادت کے بارے میں ایسے لکھتے ہیں۔ انہوں نے جنرل مشرف کو کہا گیا ہے۔ ایک جونیئر جنرل محمود کو جنرل جہانگیر کرامت نے ذاتی طور پر کہا کہ تمہارے لیے بہتر ہوگا کہ تم اپنے سینئر افسران کے معاملات میں مداخلت نہ کرو۔

جنرل جہانگیر کرامت کی ڈانٹ سن کر جنرل محمود خاصے نروس ہوئے اور بولے کہ دراصل وہ اور جنرل مشرف ایک ہی رجمنٹ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان دنوں مشرف چیف آف جنرل سٹاف نہ بننے پر خاصے ناراض ہیں لہٰذا وہ محض ان کی دلجوئی کرنا چاہ رہے ہیں۔

تاہم جہانگیر کرامت نے بڑے واضح لفظوں میں جنرل محمود کو بتایا کہ آج کے بعد تم اس طرح کے کسی کام میں ملوث نہیں ہو گے کیونکہ اس سے ملٹری کے کمانڈ سسٹم میں شدید مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔

اس واقعے کے ایک ہفتے بعد جنرل جہانگیر کرامت نے کمیٹی کور کا دورہ کرنا تھا جہاں انہیں ایک بریفنگ دی جانی تھی۔ جب جنرل جہانگیر کرامت آئے تو بریفنگ روم میں جانے کے بجائے انہوں نے جنرل قلی سے کہا کہ وہ انہیں اپنے دفتر لے کر چلیں۔ وہ ابھی دفتر میں بیٹھے ہی تھے کہ اس وقت کے جنرل رانا نسیم جو ڈی جی آئی ایس آئی تھے، وہ اپنی بغل میں ایک فائل لیے آئے اور جنرل جہانگیر کرامت سے کہا کہ سر فائل کلیئر ہو گئی ہے۔

علی قلی کو کچھ خبر نہیں تھی کہ کیا ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد انہیں پتہ چلا کہ دراصل اس وقت کے وزیراعظم نواز شریف نے جنرل علی قلی کے چیف آف جنرل سٹاف کی تقرری کے احکامات روک لیے تھے۔ جب جنرل جہانگیر کرامت کو اس بات کا پتہ چلا کہ ان کے احکامات پر عمل نہیں ہو رہا ہے تو انہوں نے ڈی جی آئی ایس آئی رانا نسیم کو نواز شریف کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا تھا کہ وہ فوری طور پر اس فائل کو کلیئر کریں۔ ان دنوں نواز شریف کے پاس وزارت دفاع کا عہدہ بھی تھا۔

بعد میں بات کچھ یوں کھلی کہ جنرل افتخار چیف آف جنرل سٹاف کے طور پر اپنی مدت ملازمت میں توسیع چاہتے تھے۔ ان کی مدت ملازمت میں توسیع کرنے کا کیس جنرل جہانگیر کرامت کو بھی بھیجا گیا تھا۔ ایک عام فوجی کے برعکس جہانگیر کرامت ایک سافٹ مین تھے۔ جنرل کرامت نے نواز شریف

کو بتایا کہ اگر انہوں نے جنرل افتخار کو ان کی ملازمت میں توسیع دی تو یہ ان کے جونیئرز کے ساتھ زیادتی ہوگی جو ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی پروموشن کا انتظار کر رہے تھے۔ نواز شریف کو بتایا گیا کہ اگر جنرل افتخار کی خواہش کا احترام کیا گیا تو کم از کم پاکستانی فوج کے دس سے بارہ سینئر آرمی جرنیل جنرل قلی اور جنرل پرویز مشرف کو بغیر پروموشن کے گھر جانا پڑے گا۔ یوں جنرل جہانگیر کرامت نے جنرل افتخار کو ملازمت میں توسیع دینے سے انکار کر دیا۔ جب چوہدری نثار علی خان اور جنرل افتخار علی خان کو اس بات کا علم ہوا تو ان دونوں نے اپنے دل میں یہ بات بٹھالی کہ دراصل یہ جنرل قلی ہی تھے جنہوں نے جہانگیر کرامت پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے انہیں مدت ملازمت میں توسیع نہیں لینے دی۔

جنرل قلی مجھے بتانے لگے کہ اگرچہ ان کی پروموشن سے جنرل افتخار، چوہدری نثار اور جنرل مشرف کو تکلیف ہوئی تھی لیکن انہیں میرٹ کی بنیاد پر یہ ترقی دی گئی تھی کیونکہ وہ سینیارٹی لسٹ پر نمبر ون تھے۔

میں نے جنرل قلی سے پوچھا کہ آخر نواز شریف اور جہانگیر کرامت کے درمیان وہ کون سے اختلافات تھے جن کی وجہ سے آخر چیف آف آرمی سٹاف کو استعفیٰ دے کر گھر جانا پڑا تھا۔

جنرل قلی نے آخر اس راز سے پردہ اٹھانا شروع کیا۔

نواز شریف اور جنرل جہانگیر کرامت کے درمیان معاملات اس وقت بگڑ گئے جب چیف آف آرمی سٹاف نے نیول ڈیفنس کالج لاہور میں اپنے خطاب میں نیشنل سیکورٹی کونسل بنانے کی تجویز پیش کی۔ جنرل قلی اس وقت چیف آف جنرل سٹاف تھے۔ آئی ایس پی آر براہ راست ان کے ماتحت تھا۔ ڈائریکٹر جنرل آئی ایس پی آر سلیم اللہ نے جنرل قلی کو چیف کی تقریر کے متن کے بارے میں بتایا۔ تاہم علی قلی اس وقت اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ وہ اس متنازعہ تقریر پر کوئی بات کرتے کیونکہ اس وقت وہ وہاں موقع پر موجود نہیں تھے۔

اگلے دن جنرل جہانگیر کرامت علی قلی کو اعتماد میں لیے بغیر نواز شریف سے ملنے چلے گئے۔ اخبارات میں پہلے ہی وزیراعظم اور چیف آف آرمی سٹاف کے درمیان اس تقریر کے بعد بڑھتے ہوئے اختلافات کی خبریں چھپ چکی تھیں۔ نواز شریف سے ملنے کے بعد جب جنرل جہانگیر کرامت جی ایچ کیو واپس آئے تو جنرل علی قلی چیف آف جنرل سٹاف کی حیثیت سے ان سے ملنے کے لیے آرمی

بنایا تھا۔

جنرل قلی نے ایک اور کہانی سنائی۔

جنرل جہانگیر کرامت کے استعفیٰ دینے سے کچھ عرصہ پہلے ہی یہ باتیں شروع ہو گئی تھیں کہ ان کے بعد نیا آرمی چیف کون ہوگا۔ ایک دن جنرل علی قلی کی حیرانی کی حد نہ رہی جب نواز شریف کے ایک بڑے قریبی معتمد خاص نے ان سے رابطہ کیا اور یہ پیغام دیا کہ وہ ان کی نواز شریف سے ایک خفیہ ملاقات کرانا چاہتے ہیں تاکہ کل کو وہ آرمی چیف کی تقرری کے وقت زیر غور لائے جا سکیں۔ علی قلی کو یہ بتایا گیا کہ اگر وہ نواز شریف سے خفیہ ملاقات کے لیے راضی ہو جائیں تو پھر انہیں ایک عام سی کار میں بٹھا کر سادہ کپڑوں میں پرائم منسٹر ہاؤس لے جایا جائے گا۔ علی قلی کو تسلی دینے کے لیے یہ بھی بتایا گیا کہ ان سے پہلے جنرل آصف نواز کی بھی اسی طرح خفیہ ملاقات کرائی گئی تھی اور انہیں بھی سادہ کپڑے پہنا کر ایک عام سی گاڑی میں وہاں لے جایا گیا تھا۔ نواز شریف کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے بعد جنرل آصف نواز کو آرمی چیف بنانے کی کلیئرنس دے دی گئی تھی۔ جنرل علی قلی کو بتایا گیا کہ یہ بات ان کے اپنے فائدے میں ہے اور انہیں جہانگیر کرامت کے بعد آرمی چیف بنایا جا سکتا ہے۔

اس پیغام کے کچھ دن بعد ایک اور بڑے سرکاری افسر جو نواز شریف کے قریب تھے، نے ایک دفعہ پھر علی قلی سے رابطہ کیا اور نواز شریف سے ملانے کی پیشکش کی۔ اس بڑے سرکاری افسر نے جنرل علی قلی کو بتایا کہ وہ ذاتی طور پر انہیں چیف آف آرمی سٹاف بنوانے میں ان کی مدد کریں گے۔ وہ پہلے ان کی نواز شریف سے خفیہ ملاقات کرائیں گے اور پھر انہیں آرمی چیف بنانے کا کیس تیار کر کے پیش کریں گے۔

لیکن نواز شریف کیمپ کی توقعات کے برعکس جنرل قلی نے سادہ کپڑے پہن کر نواز شریف سے خفیہ ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ جنرل قلی نے انہیں بتایا کہ وہ آرمی چیف بننے کے لیے اس طرح کی کوئی حرکت نہیں کریں گے۔ انہوں نے پیغام رساں کو کہا کہ خدا نے انہیں بہت عزت دی ہے اور اگر ان کی قسمت میں آرمی چیف بننا ہوا تو انہیں کوئی نہیں روک سکتا۔ اگر خدا انہیں آرمی چیف نہیں بنانا چاہتا تو پھر نواز شریف سے خفیہ ملاقاتیں کر کے بھی وہ آرمی چیف نہیں بنائے جا سکتے۔

میں نے جنرل قلی سے کہا کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ نواز شریف نے جنرل مشرف کو آرمی

چیف بنانے سے پہلے ان سے بھی خفیہ ملاقاتیں کی ہوں گی۔ جنرل قلی نے میرے اس سوال کا یہ کہہ کر جواب دیا کہ وہ اس طرح کی خفیہ ملاقاتوں پر کوئی تبصرہ نہیں کریں گے۔

میں نے کہا لیکن جنرل صاحب! شیخ رشید نے تو اپنے انٹرویو میں مجھے بتایا تھا کہ جنرل قلی کو آرمی چیف نہ بنانے کی وجہ ان کے برادر ان لا گوہر ایوب تھے جو اس وقت نواز شریف کی حکومت میں وزیر خارجہ تھے۔ جنرل قلی نے اس بات سے اتفاق کیا۔ قلی نے مجھے کہا کہ وہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں کہ گوہر ایوب خان انہیں آرمی چیف بنانے کے لیے کوششیں کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ گوہر ایوب خان نے کبھی بھی انہیں آرمی چیف بنانے کے لیے نہ تو لابی کی تھی اور نہ ہی انہوں نے کسی سے اس پر بات چیت کی تھی۔ قلی کے بقول نواز شریف گوہر ایوب خان پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔ جنرل قلی نے بھی کبھی گوہر ایوب خان سے یہ بات نہیں کی تھی کہ وہ انہیں آرمی چیف بنوائیں۔ قلی کے بقول اگرچہ وہ اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کے لیے ساری باتیں کہہ سکتے ہیں لیکن وہ خاموش رہیں گے کیونکہ ان کی بہن گوہر ایوب کی بیوی ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ ان کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا ہو۔

قلی نے کہا کہ مجھے حیرانی ہوتی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ گوہر ایوب خان شاید میرے لیے لابنگ کر رہے تھے۔ وہ یہ بات کیوں بھول جاتے ہیں کہ ان کے والد جنرل حبیب خان کو آرمی چیف نہ بنانے والے جنرل ایوب خان اسی گوہر ایوب کے ہی والد تھے۔ قلی نے کہا میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا۔

جنرل قلی نے اس بات کو دہرایا کہ دراصل نواز شریف کو آرمی ہاؤس میں ان کی جہانگیر کرامت کے ساتھ ہونے والی میٹنگ کے بارے میں جان بوجھ کر غلط خبریں دی گئی تھیں۔ علی قلی نے اس بات کو مسترد کیا کہ جب جنرل وحید کاکڑ نے نواز شریف اور غلام اسحاق خان سے ملاقات کی تھی جس کے بعد انہوں نے استعفے دے دیے تھے تو شاید وہ اس میٹنگ میں موجود تھے۔ قلی نے کہا کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت وہ ڈی جی ایم آئی تھے اور انہوں نے نواز شریف کو دھمکی دے کر استعفیٰ دینے پر مجبور کیا تھا۔

جنرل قلی کے بقول یہ بات غلط تھی۔ وہ نہ تو اس میٹنگ میں شریک ہوئے تھے اور نہ ہی انہوں نے نواز شریف کو کوئی دھمکی دی تھی۔ جنرل کاکڑ کے ساتھ اس وقت جنرل جاوید اشرف گئے تھے۔ جنرل قلی نے کہا کہ نواز شریف کو ہر وقت ان کے قریبی لوگ پٹھانوں سے ڈراتے بھی رہتے تھے اور ایک پروپیگنڈہ جاری رہتا کہ پٹھان اچھے لوگ نہیں ہیں اور ان سے ڈیل کرنا بہت مشکل کام ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر

برطرف کیا جائے۔

قلی نے اس بات کا بھی انکشاف کیا کہ ان کے پاس اس طرح کی رپورٹس بھی تھیں کہ جب جنرل مشرف آرمی چیف بنے اور انہوں نے مختلف کور کے دورے کیے تو بہت سارے فوجی افسران نے انہیں یہ کہا تھا کہ وہ نواز شریف کو اپنے ساتھ وہ سب کچھ کرنے کی اجازت نہ دیں جو انہوں نے جنرل جہانگیر کرامت کے ساتھ کیا تھا۔ یہی وجہ تھی جب 12 اکتوبر کو جنرل مشرف کو ڈس مس کیا گیا تو ان کے ذہن میں اپنے ان فوجی افسروں کا یہ مطالبہ ضرور ہوگا۔

میں نے جنرل قلی سے پوچھا کہ آخر فوج سیاست میں کیوں مداخلت کرتی آئی تھی تو وہ بولے کہ ان کی اپنی ذاتی رائے یہ ہے کہ فوج کو سیاست میں نہیں پڑنا چاہیے چاہے اس کے پیچھے کتنی بڑی وجہ ہی کیوں نہ ہو۔ تاہم قلی نے کہا کہ جب بھی فوج نے کسی بھی سویلین حکومت کو گرایا تو اس وقت کی سیاسی لیڈرشپ نے باقاعدہ طور پر انہیں اس کے جواز پیش کیے۔ جو مسائل سیاسی انداز میں حل ہو سکتے تھے وہ سیاسی لوگ فوجی لیڈروں کے سامنے لے کر آتے تھے اور یہ بہت غلط اپروچ تھی۔ جنرل قلی کا خیال تھا کہ سیاستدان اپنے مقاصد کے لیے فوج کو استعمال کرتے تھے جس سے فوجیوں کو بھی یہ بہانہ ملتا تھا کہ وہ سیاسی معاملات میں دخل اندازی کریں۔ قلی نے انکشاف کیا کہ جب وہ ڈی جی ایم آئی تھے تو بہت سارے سیاستدان ان سے ملنے جی ایچ کیو آتے اور وہ چاہتے تھے کہ فوج اس وقت کی حکومت کو گرانے میں رول ادا کرے۔ تاہم قلی کے بقول سویلین حکومتوں کو گرانے کے لیے یہ وجوہات مناسب نہیں تھیں۔ قلی کا خیال تھا کہ اگر فوجی قیادت کے پاس کسی سیاسی حکومت کو ہٹانے کی کتنی ہی ضروری وجوہات کیوں نہ ہوں پھر بھی فوری طور پر ملک میں نئے الیکشن کرا کے اقتدار منتخب نمائندوں کے حوالے کر دینا چاہیے کیونکہ ملک پر حکمرانی کرنا فوج کا کام نہیں ہے۔ جنرل وحید نے بالکل یہی کام 1993ء میں کیا تھا جب انہوں نے نئے انتخابات کرا کے اقتدار منتخب نمائندوں کے حوالے کر دیا۔ یوں ملک میں جمہوریت چلتی رہی۔ قلی نے کہا کہ پاکستان میں فوجی مداخلتوں سے نہیں بلکہ جمہوریت کے مسلسل چلتے رہنے سے ہی جمہوریت آئے گی۔ جمہوریت ایک مکمل نظام ہے اور اسے چلتے رہنا چاہیے۔ آرمی کو سویلین حکمرانوں اور پارلیمنٹ کے پیچھے ہونا چاہیے کیونکہ اس وقت دنیا میں جمہوریت ہی ایک ایسا نظام ہے جس کے تحت کسی بھی ملک کو چلایا جا سکتا ہے۔

شاہد حامد

یہ چھ اگست 2003ء کا دن تھا۔ اس دن میری سالگرہ تھی۔ میں نے گھر پر رہ کر سالگرہ منانے کی بجائے نتھیا گلی جانے کا فیصلہ کیا۔ دو دن قبل اسلام آباد میں واقع فرانس کے سفارتخانے میں میری پنجاب کے سابق گورنر اور فاروق لغاری کے انتہائی قریبی دوست اور ان کے ایڈوائزر شاہد حامد سے ایک کھانے پر ملاقات ہوئی تھی۔ انہی دنوں میں نے چوہدری شجاعت والے تہلکہ خیز پروفائل انٹرویو کے بعد ان تمام لوگوں سے ملنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا جو میرے خیال میں اس وقت بعض اہم جگہوں پر موجود تھے جب اس ملک میں یا تو سازشیں ہو رہی تھیں یا سیاسی نظام کی بساط لپیٹی جا رہی تھی۔ میں شاید کبھی شاہد حامد کے بارے میں نہ سوچتا لیکن انہیں فرانس کے سفیر کے گھر کے سرسبز و شاداب لان میں ڈھلتی ہوئی شام میں اپنی خوبصورت بیوی کے ساتھ کھڑے دیکھ کر پتہ نہیں کیوں میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ مجھے اس شخص سے ملنا چاہیے کیونکہ وہ بڑے اچھے طریقے سے ان تمام واقعات سے پردہ اٹھا سکتے ہیں کہ کیسے اور کن حالات میں 5 نومبر 1996ء کو بینظیر بھٹو کی حکومت ان کے دوست فاروق لغاری نے توڑی اور آرمی چیف جہانگیر کرامت کا اس میں کیا کردار تھا۔ چیف جسٹس سجاد علی شاہ کیا گیم کھیل رہے تھے۔ نواز شریف کے ساتھ مستقبل کے معاملات کیسے اور کون طے کر رہا تھا اور سب سے بڑھ کر فاروق لغاری نے کن حالات میں ملک کی صدارت سے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ بات بھی بڑی اہم تھی کہ آخر

جس دن فاروق لغاری اس ملک کے صدر بنے انہوں نے اسی لمحے اپنے ایچی سن کالج کے دوست شاہد حامد کو اپنا ایڈوائزر مقرر کر لیا۔ فاروق لغاری نے شاہد حامد سے جو پہلی لیگل ایڈوائس لی وہ سپریم کورٹ کے اس فیصلے کے بارے میں تھی جس میں ججوں کی سینیارٹی کا فیصلہ دیا گیا تھا۔ بینظیر بھٹو سپریم کورٹ کے اس فیصلے پر عمل کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ بینظیر بھٹو اور فاروق لغاری نے ایک اہم میٹنگ بھی کی تھی جس میں یہ گفتگو ہوئی تھی کہ سپریم کورٹ کے فیصلے پر کس طرح عملدرآمد کیا جائے۔ اس اہم میٹنگ میں فاروق لغاری اور بینظیر بھٹو کے علاوہ صدر کے پرنسپل سیکرٹری شمشیر علی خان، شاہد حامد، رضا ربانی، مرحوم جسٹس منیر اور ڈپٹی اٹارنی جنرل بھی موجود تھے۔ بینظیر بھٹو نے فاروق لغاری کو صاف لفظوں میں بتا دیا کہ وہ چیف جسٹس سجاد علی شاہ کو برطرف کر دیں۔ فاروق لغاری نے بینظیر کی بات سن کر شاہد حامد کی طرف دیکھا اور اس کی رائے مانگی۔ شاہد حامد نے بتایا کہ ججوں کی سینیارٹی کا کیس متفقہ طور پر سنایا گیا ہے اور تمام ججز اس پر عملدرآمد چاہتے ہیں لہٰذا یہ کوئی سمجھداری کی بات نہیں ہوگی اگر ہم نے سپریم کورٹ کے فیصلے پر عمل کرنے کی بجائے چیف جسٹس کو ہٹا دیا۔

صدر لغاری نے شاہد حامد کی اس ایڈوائس سے پورا اتفاق کیا اور بینظیر بھٹو کی اس بات کو ٹھکرا دیا کہ وہ چیف جسٹس کو فارغ کر دیں۔

یہ وہ پہلا واقعہ تھا جس نے بینظیر بھٹو اور فاروق لغاری کے درمیان ہمیشہ کے لیے ایک ایسی خلیج حائل کر دی تھی جو آخرکار بینظیر حکومت کے ٹوٹنے اور کچھ ماہ بعد فاروق لغاری کے استعفیٰ دینے پر ختم ہوئی۔

اپنی یادوں میں کھوئے شاہد حامد نے یاد کیا کہ یہ اگست 1996ء کی بات ہے۔ وہ اسی گھر میں چھٹیاں منانے آئے ہوئے تھے جب صدر پاکستان فاروق لغاری نے انہیں ٹیلی فون کیا اور کہا کہ وہ فوری طور پر اسلام آباد واپس آ جائیں۔ وہ جونہی اسلام آباد پہنچے تو فاروق لغاری نے شاہد حامد کو چیف جسٹس سجاد علی شاہ کا ایک خط دکھایا جس میں انہوں نے یہ شکایت کی تھی کہ پیپلز پارٹی کی حکومت نے اب تک ججوں کے سینیارٹی والے کیس پر عمل نہیں کیا تھا۔ اس خط میں چیف جسٹس سجاد علی شاہ نے یہ بھی وارننگ دی تھی کہ ان کی ججمنٹ پر عمل نہ کرنے سے ایک بہت بڑا آئینی بحران پیدا ہو رہا ہے۔ اس خط کے ملنے کے بعد فاروق لغاری بڑے پریشان تھے اور انہیں یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ جسٹس سجاد علی شاہ اس

خط کے ذریعے انہیں کیا پیغام بھیجنا چاہ رہے ہیں۔

شاہد حامد نے لغاری کو بتایا کہ چیف جسٹس انہیں بڑے واضح الفاظ میں یہ بات بتا رہے ہیں کہ ملک کو آئینی طور پر نہیں چلایا جا رہا ہے۔ چیف جسٹس نے صدر پاکستان کو ان کی آئینی ذمہ داریاں یاد دلائی ہیں جو ان کو انتہائی متنازعہ شق 58(2)b کے تحت حاصل ہیں۔ اس آئینی شق کے ذریعے صدر منتخب حکومت اور اسمبلی توڑ سکتا تھا۔ لغاری نے شاہد حامد سے پوچھا کہ وہ چیف جسٹس کے اس خط پر کیا ردعمل ظاہر کریں۔ شاہد حامد نے لغاری کو مشورہ دیا کہ وہ سپریم کورٹ کو ایک ریفرنس بنا کر بھیجیں جس میں ان سے یہ رائے لی جائے کہ ان حالات میں کیا صدر پاکستان کوئی بھی ایکشن لے سکتے ہیں۔

فاروق لغاری کو شاہد حامد کی یہ تجویز بہت پسند آئی اور فوری طور پر انہیں کہا گیا کہ وہ سپریم کورٹ آف پاکستان کو ایک ریفرنس بھیجنے کی تیاری کریں۔

شاہد حامد نے مجھے بتایا کہ جب بینظیر بھٹو کو فاروق لغاری کے اس فیصلے کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ سپریم کورٹ کو ریفرنس بھیجنے والے ہیں تو وہ بڑے شدید دباؤ کا شکار ہوئیں اور انہوں نے فوری طور پر ججز کیس کے فیصلے پر عمل کر دیا۔

تاہم، فاروق لغاری مطمئن نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ بینظیر بھٹو حکومت کی خراب کارکردگی سے ناخوش تھے۔ صدر لغاری کے خیال میں اگر بینظیر بھٹو کی حکومت زیادہ دیر تک چلنے دی گئی تو پاکستان معاشی دیوالیہ پن کا شکار ہو جائے گا۔

آخر ایک دن صدر لغاری نے شاہد حامد کو بلایا اور پہلی دفعہ یہ اظہار کیا کہ وہ بینظیر بھٹو حکومت کو برطرف کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ یہ بات سن کر شاہد حامد چونک گئے اور انہوں نے صدر لغاری کو بتایا کہ بینظیر حکومت کو توڑنے کے لیے محض ایک وجہ ناکافی ہے۔ سپریم کورٹ کبھی بھی صدر لغاری کے حکومت اور اسمبلیوں کو برطرف کرنے کے فیصلے کو قبول نہیں کرے گی محض اس بنیاد پر کہ صدر کا نشانہ بینظیر بھٹو ہیں۔ تاہم، یہ ممکن ہے کہ اگر ریاست کے ایک سے زیادہ ادارے کرپشن میں ملوث ہیں تو پھر بینظیر بھٹو حکومت کو برطرف کرنے کی بہت ساری وجوہات کورٹ کے سامنے پیش کی جا سکتی ہیں۔

شاہد حامد نے صدر لغاری کو یہ تجویز 1988ء سے لے کر 1993ء تک برطرف ہونے والی حکومتوں اور ان کے عدالتوں میں چلنے والے کیسوں اور ان کے فیصلوں کی روشنی میں دی تھی۔ 1988ء

میرے خیال میں فاروق لغاری چاہتے تھے کہ ان تمام صحافیوں کو کابینہ میں وزیر بنایا جائے جن کی کریڈیبلٹی تھی اور جو بینظیر بھٹو حکومت سے کرپشن کی وجہ سے نفرت کرتے تھے اور سب سے بڑھ کر وہ اپنے اخبارات و جرائد میں مسلسل حکومت کی نااہلی کے خلاف مضمون لکھتے رہے تھے اور فاروق لغاری اور جنرل جہانگیر کرامت کو ایک مسیحا کے طور پر پیش کرتے رہے تھے۔ نجم سیٹھی اور ارشاد احمد حقانی تو اس جھانسے میں آ گئے تاہم عارف نظامی زیادہ پروفیشنل اور ایماندار صحافی ثابت ہوئے اور انہوں نے فاروق لغاری اور شاہد حامد کی دی ہوئی یہ میٹھی گولی کھانے سے انکار کر دیا۔

تنہائی کی فضاؤں میں خنکی بڑھنی شروع ہو گئی تھی لیکن مجھے احساس تھا کہ ابھی شاہد حامد سے بہت کچھ سننا اور پوچھنا ہے۔ میں نے ایک نئے سرے سے سوالات کا سلسلہ پھر شروع کیا۔

میرے لیے اہم بات یہ تھی کہ بینظیر بھٹو کی برطرفی سے پہلے آخر کابینہ کے ناموں کو کس نے بیٹھ کر حتمی شکل دی تھی۔

شاہد حامد نے بتایا کہ جب سے فاروق لغاری نے بینظیر بھٹو حکومت برطرف کرنے کا فیصلہ کیا تھا اس کے بعد وہ اپنے ذہن میں کابینہ کے ان وزیروں کی فہرست بنا چکے تھے جنہیں انہوں نے حلف دینا تھا۔ تاہم کچھ ناموں کا فیصلہ برطرفی آرڈر پر دستخط کرنے کے بعد کیا گیا۔

حکومت برطرف کرنے کے بعد فاروق لغاری نے ورلڈ بینک کے ایک ملازم شاہد جاوید برکی کو خود ٹیلی فون کیا اور انہیں ملک کا وزیر خزانہ بنانے کی پیشکش کی۔ ورلڈ بینک کے صدر مسٹر ولفنسن نے باقاعدہ فون کر کے صدر لغاری کو پاکستان میں ایک منتخب سیاسی حکومت برطرف کرنے پر مبارکباد پیش کی۔

شاہد حامد کی اس بات سے یہ بھی ثابت ہو رہا تھا کہ جہاں نواز شریف، عابدہ حسین، شہباز شریف، چوہدری نثار علی خان اور آرمی چیف جہانگیر کرامت بینظیر بھٹو حکومت برطرف کرنے کی سازش میں شامل تھے وہاں عالمی ادارے بھی باقاعدہ اپنا رول ادا کر رہے تھے۔ بعد میں مجھے بینظیر بھٹو دور کے وفاقی وزیر ڈاکٹر شیر افگن نیازی نے یہ بتایا تھا کہ دراصل ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف بینظیر بھٹو کو دباؤ میں لا رہے تھے کہ وہ پاکستان میں بجلی اور گیس کے نرخ بڑھا دیں۔ تاہم بینظیر بھٹو نے ان کی یہ شرائط ماننے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ وہ عوام پر دباؤ نہیں ڈالنا چاہتی تھیں جس کی انہیں سزا دلوانے میں ورلڈ بینک اور اس

کے ملازم بھی پیش پیش تھے۔

بینظیر بھٹو حکومت برطرف ہونے کے بعد بہت سارے لوگوں کی لاٹری کھل گئی تھی۔ شاہد حامد کو تین اہم وزارتوں کی ذمہ داری سونپی گئی۔ انہیں سوچ سمجھ کر وزارت دفاع، قانون اور اسٹیبلشمنٹ کی وزارتیں دی گئیں تاکہ وہ فوج، عدلیہ اور سول بیوروکریسی کو اپنے حق میں کر سکیں۔ صدر لغاری چاہتے تھے کہ سیاسی جماعت سے ان کے دو نمائندے بھی کابینہ میں لیے جائیں۔ عابدہ حسین اور شفقت محمود کے ناموں پر بھی غور کیا گیا۔ کچھ ناموں کا فیصلہ تو بہت پہلے ہو چکا تھا۔ دو اہم صحافیوں نجم سیٹھی اور ارشاد حقانی کو بھی وزیر بنایا گیا کیونکہ انہوں نے بھی اپنی تحریروں کے ذریعے بینظیر بھٹو کے خلاف صدر لغاری کے ہاتھ مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ملک معراج خالد لاہور میں واقع اپنے گھر میں سو رہے تھے جب آدھی رات کو انہیں ٹیلی فون کر کے بتایا گیا کہ انہیں ملک کا نگران وزیراعظم مقرر کر دیا گیا ہے۔

شاہد حامد نے یہ دعویٰ کیا کہ معراج خالد کو بینظیر بھٹو کی برطرفی کے منصوبے کا بالکل علم نہیں تھا۔

تاہم مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر ایک دوسرے کے دشمن لغاری اور نواز بینظیر بھٹو حکومت کو برطرف کرنے کے لیے ایک نکتے پر کیسے راضی ہو گئے تھے۔

شاہد حامد نے گہرا سانس لیا اور مجھے بتایا کہ دراصل پہلے دن سے ہی لغاری اپنی حیثیت صدر پاکستان کے طور پر منوانا چاہ رہے تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ لوگ انہیں صدر پاکستان سمجھیں نہ کہ پیپلز پارٹی حکومت کا جیالا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپوزیشن کے ساتھ بھی رابطہ کرنے کی کوئی صورت ڈھونڈ رہے تھے۔ تاہم نواز شریف زیادہ سمجھدار تھے اور وہ یہ چاہتے تھے کہ اگر فاروق لغاری اور ان کے درمیان کوئی ملاقات ہو تو اس میں کوئی اہم باتیں یا ایجنڈا ڈسکس ہونا چاہیے۔ محض چائے پینے یا کھانا کھانے کے لیے وہ ملاقات نہیں کریں گے۔ اس پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ دونوں اطراف سے پہلے ایک ٹیم مل جائے جو نواز اور لغاری کے درمیان ملاقات کے ایجنڈے کے لیے تیاری کرے۔ شاہد حامد کو صدر لغاری نے نامزد کیا کہ وہ نواز شریف کی ٹیم سے مذاکرات کریں گے جبکہ نواز شریف نے سرتاج عزیز، جنرل مجید ملک، چوہدری نثار علی اور شہباز شریف کو اپنی طرف سے نامزد کیا۔ یوں ان لیڈروں کی پہلی ملاقات عابدہ حسین کے اسلام آباد میں واقع گھر میں ہوئی۔ شاہد حامد عابدہ حسین کے گھر گئے جہاں نواز شریف کے علاوہ چوہدری نثار، عابدہ اور شہباز شریف موجود تھے۔ ملاقات کے دوران شاہد حامد نے یہ

تجویز دی کہ نواز شریف کو لغاری سے ملنا چاہیے۔ تاہم، سیاسی طور پر بھاری نواز اور ان کے ساتھیوں کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے لہٰذا وہ اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہ رہے تھے۔ بینظیر بھٹو سے 1993ء میں نواز شریف کے بجائے اسحاق خان کا ساتھ دینے پر اسے سزا دینے کا سنہری موقع ان کے ہاتھ آ رہا تھا۔ لہٰذا نواز اور ان کے ساتھیوں نے شاہد حامد سے پوچھا کہ اگر ان کی فاروق لغاری سے ملاقات ہوتی بھی ہے تو اس کے بدلے میں انہیں کیا ملے گا۔ شاہد حامد نے ان سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتے ہیں تو نواز نے بتایا کہ سب سے پہلے لغاری کو پاکستان مسلم لیگ نواز کے بینظیر بھٹو حکومت کے خلاف لیے گئے سٹینڈ کی تائید کرنی چاہیے۔ اگر ان دونوں کے درمیان ملاقات بھی ہو تو اس ملاقات کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ بھی نکلنا چاہیے۔

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ ان میں سے کسی نے شاہد حامد سے یہ پوچھ لیا کہ کیا ان کے پاس واقعی فاروق لغاری کی اتنی اتھارٹی موجود ہے کہ وہ اتنے بڑے اہم فیصلے بیٹھ کر ان سے ڈسکس کر سکیں۔

اس خفیہ ملاقات کا یہ نتیجہ نکلا کہ نواز شریف شاہد حامد سے چند مضبوط یقین دہانیاں لینے کے بعد صدر لغاری سے ملاقات کے لیے تیار ہو گئے۔ شاہد حامد نے صدر پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے سب سے بڑی گارنٹی یہ دی کہ اس ملک میں جب بھی الیکشن ہوں گے وہ آزادانہ اور شفاف ہوں گے۔

میں نے شاہد حامد سے پوچھ لیا کہ جب عابدہ حسین کے گھر پر یہ خفیہ ملاقاتیں ہو رہی تھیں تو کیا ان میں یہ بات بھی چھیڑی گئی تھی کہ اگر الیکشن کے بعد نواز شریف اس ملک کے وزیر اعظم بنتے ہیں اور ان کی ٹرم کے دوران ہی فاروق لغاری دوبارہ صدارتی انتخاب کے لیے امیدوار بنتے ہیں تو کیا مسلم لیگ نواز انہیں سپورٹ کرے گی۔

شاہد حامد نے جواب دیا کہ جب نواز اور لغاری کے درمیان پہلی ملاقات ہوئی تو اس میں اس طرح کی کوئی بات نہیں کی گئی۔ تاہم، شاہد حامد نے اس بات کا انکشاف کیا کہ جب نواز شریف کے ساتھی صدارتی نمائندوں کے ساتھ بینظیر بھٹو حکومت توڑنے کے لیے صلاح مشورے میں مصروف تھے تو انہوں نے یقیناً صدر لغاری کو دوسری دفعہ صدر بنانے کی پیشکش ضرور کی تھی۔ چوہدری نثار علی خان اور شہباز شریف دونوں نے باقاعدہ طور پر فاروق لغاری کو صدر بنانے کے حوالے سے شاہد حامد کو آفر کی تھی۔ اس کے بعد جب لغاری اور نواز شریف کی مزید ملاقاتیں ہوئیں تو نواز شریف نے براہ راست بھی

فاروق لغاری کو خود پیشکش کی تھی۔ تاہم، فاروق لغاری نے ہر دفعہ دوسری ٹرم کے لیے صدر بننے سے انکار کیا۔ لغاری کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ اس ملک کو آئینی تقاضوں کے مطابق چلایا جائے۔ شاہد حامد نے یہ بھی انکشاف کیا کہ بینظیر بھٹو حکومت کی برطرفی کے بعد عابدہ حسین خود ایک پیشکش لے کر آئی تھیں کہ پاکستان مسلم لیگ نواز نئے انتخابات میں فاروق لغاری کے امیدواروں کو 20% ٹکٹیں دینے کے لیے تیار تھی۔ تاہم، لغاری نے انکار کر دیا۔

میرا اپنا یہ خیال تھا کہ نواز شریف، شہباز شریف اور چوہدری نثار علی خان صدر لغاری کے ساتھ وہی کھیل کھیل رہے تھے جو بینظیر بھٹو نے فاروق لغاری اور آفتاب شیرپاؤ کے ساتھ مل کر 1993ء میں اسحاق خان کے ساتھ کھیلا تھا۔ جب نواز شریف اور اسحاق خان میں اقتدار کے لیے کشمکش بڑھی تو دونوں نے اس وقت کی اپوزیشن لیڈر بینظیر بھٹو سے رابطہ کیا کیونکہ یہ طے تھا کہ جس کے پلڑے میں بینظیر بھٹو اپنا وزن ڈالیں گی وہ جیت جائے گا۔ بینظیر کو نواز شریف یہ آفر کر رہے تھے کہ اگر وہ ان کی حکومت ڈس مس کرانے میں حصہ دار نہ بنیں تو ان پر اور آصف زرداری پر قائم ہونے والے مقدمات جو 1990ء میں اسحاق خان کے کہنے پر قائم کیے گئے تھے انہیں ختم کر سکتے ہیں اور ایک نیا آزاد الیکشن کمیشن بھی بنایا جا سکتا ہے تاکہ جب نواز شریف کے پانچ سال پورے ہوں تو انتخابات آزاد اور شفاف ہوں۔ دوسری طرف اسحاق خان اپنے داماد انور سیف اللہ کے ذریعے یہ آفر کر رہے تھے کہ اگر وہ قومی اسمبلی کی نشستوں سے مستعفی ہو جائیں جو صدر کو اسمبلیاں توڑنے کا جواز فراہم کریں گی تو وہ نئے الیکشن کے بعد انہیں دوبارہ وزیر اعظم قبول کرنے پر تیار ہوں گے۔ اس کے بدلے میں بینظیر بھٹو سے یہ یقین دہانی چاہتے تھے کہ 1993ء میں ان کی صدارتی معیاد ختم ہو رہی تھی لہٰذا انہیں پانچ سال کے لیے مزید صدر بنایا جائے گا۔ صدر اسحاق اور نواز شریف میں اختلافات اس وجہ سے بھی پیدا ہوئے تھے کہ وہ چاہتے تھے کہ نواز شریف صدارتی انتخابات سے چھ ماہ پہلے ہی باقاعدہ یہ اعلان کر دیں کہ وہ ان کے صدارتی امیدوار ہوں گے۔ نواز شریف حکومت کے انٹیلی جنس بیورو کے سربراہ بریگیڈیئر امتیاز احمد نے بھی یہ بات مجھے خود بتائی تھی کہ نواز شریف اور غلام اسحاق خان کے درمیان اصل اختلافات اسی بات سے شروع ہوئے تھے کہ وزیر اعظم اسحاق خان کو پانچ سالوں کے لیے مزید صدر بنانے کی گارنٹی دینے کو تیار نہ تھے۔ یوں غلام اسحاق خان نے نواز شریف کو سزا دینے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کام کے لیے وہ بینظیر

بھٹو کی مدد چاہتے تھے۔ بینظیر بھٹو کے لیے یہ بڑا مشکل وقت تھا کہ وہ کس کا ساتھ دیں۔ ایک طرف اگر وہ صدر اسحاق کا ساتھ دیتیں تو نہ صرف نواز شریف کو 1990ء میں اسی صدر اسحاق، اسلم بیگ اور جنرل حمید گل کے ساتھ مل کر ان کی 6 اگست کو حکومت برطرف کرانے پر نہ صرف اب ان کی حکومت واپس کرا کے سزا دی جا سکتی تھی بلکہ نئے انتخابات کی وجہ سے وہ فوری طور پر ملک کی وزیر اعظم بھی بن سکتی تھیں اور آصف زرداری بھی فوری طور پر رہا ہو سکتے تھے جبکہ نواز شریف کا ساتھ دینے میں بینظیر کو دو سال مزید انتخابات کا انتظار کرنا پڑتا۔ یوں غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ صدر اسحاق کا ساتھ دے کر ایک تیر سے کئی شکار کیے جا سکتے ہیں۔ تاہم، کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ صدر اسحاق خان کا ساتھ دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ پیپلز پارٹی نے اصولوں پر سمجھوتا کر کے ایک ایسے شخص کا ساتھ دیا جس نے بینظیر بھٹو اور آصف زرداری کو کرپشن چارجز پر برطرف کر کے جیل میں ڈال دیا تھا۔ کسی سیانے نے مشورہ دیا کہ اتنی معمولی سی بات کو اتنے بڑے کاز کے سامنے رکاوٹ نہ بننے دیں اور یوں یہ طے پایا کہ اسی کرپٹ شخص کو صدر اسحاق خود اپنی کابینہ کا ممبر بنا کر اور اس سے حلف لے کر ایک طرح کی اسے کلین چٹ فراہم کر دیں گے۔ یوں آسمان نے یہ نظارہ بھی دیکھا کہ جس آصف زرداری کو اسحاق خان کے کہنے پر کرپشن الزامات میں تین سال جیل میں رکھا گیا تھا اسی صدر نے اسے اپنے ہاتھوں سے حلف دیا۔ ان مذاکرات کے درمیان صدر اسحاق یہ گارنٹی چاہتے تھے کہ انہیں دوبارہ صدر بنایا جائے گا۔ بینظیر بھٹو نے بھی یہ گولی صدر اسحاق کو دے دی کہ وہ انہیں دوبارہ صدر منتخب کریں گی۔ صدر اسحاق بھی یہ گولی اس لیے نگل گئے کیونکہ 1988ء میں بینظیر بھٹو نوابزادہ نصر اللہ خان کے مقابلے میں انہیں اپنا صدارتی امیدوار بنا چکی تھیں لہٰذا شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ تاہم، صدر اسحاق خان یہ بات بھول گئے تھے کہ ان پانچ سالوں میں بینظیر بھٹو نے بھی بہت کچھ سیکھ اور سمجھ لیا تھا۔ انہیں بھی اب سیاست کے گر آ گئے تھے۔ اسحاق خان یہ بھول گئے تھے کہ 1988ء میں جنرل اسلم بیگ اور جنرل حمید گل پاکستان کو چلا رہے تھے اور پانچ سال بعد پلوں کے نیچے سے بہت سارا پانی بہہ چکا تھا۔ اگرچہ اسحاق خان کو یقین تھا کہ فوج کے ایک پٹھان سپہ سالار عبدالوحید کاکڑ اپنے ایک پٹھان بھائی غلام اسحاق خان کا ساتھ دیں گے تاہم یہ ممکن نہ ہو سکا۔ یوں نواز شریف کی برطرفی اور ملک میں نئے انتخابات کے بعد جب نئے صدر کے انتخابات کا مرحلہ آیا اور غلام اسحاق خان پشاور سے دوڑے دوڑے اپنے کاغذات نامزدگی داخل کرانے آئے تو پتہ چلا کہ

[illegible] بچی تھی۔ اپنے داماد انور سیف اللہ کے ایف سیون میں واقع گھر میں بیٹھ کر اس زمانے کی بے ثباتی، دھوکے بازی اور سیاسی چالبازیوں کو روتے رہے۔ تاہم، وہ یہ بھول گئے تھے کہ ان کے ساتھ وہی کچھ ہوا تھا جو وہ دوسروں کے ساتھ کرتے آئے تھے۔ سیاست کے سینے میں نہ دل ہوتا ہے اور نہ خون کے رشتے دیکھے جاتے ہیں۔ یہ تو چالیں ہوتی ہیں۔ جو چل گیا وہ جیت گیا جو پیچھے رہ گیا وہ اپنی باری کا انتظار کرے یا پھر پشاور میں واقع اپنے گھر کی لائبریری میں بیٹھ کر ٹالسٹائی کا مشہور ناول War and peace کو نئے سرے سے پڑھے اور اپنی یادداشتوں کو قوم کی امانت سمجھ کر قلمبند کرنے کی بجائے ایک رات خاموشی سے اپنے بستر میں خدا کو پیارا ہو جائے۔

یہی وجہ تھی کہ نواز شریف بھی فاروق لغاری کے ساتھ وہی کھیل کھیل رہے تھے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ لغاری کے ساتھ وہی کچھ ہو رہا تھا جو انہوں نے اسحاق خان کے ساتھ ہوتے ہوئے اپنی نظروں سے دیکھا تھا۔ تاہم، انسان میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ انہی حالات میں برا کسی اور شخص کے ساتھ ہوا تھا وہ اس کے ساتھ نہیں ہوگا یا اپنے اوپر بڑھتے ہوئے غیر ضروری اعتماد کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو خدا کے بعد سب سے طاقتور شخص سمجھنا شروع کر دیتا ہے اور جب منہ کے بل گرتا ہے تو اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ یہی کچھ نواز شریف کے وزیر اعظم بننے کے بعد فاروق لغاری کے ساتھ ہوا۔ وہی نواز شریف جو بینظیر حکومت گرانے کے لیے فاروق لغاری کو دوسری مرتبہ صدر بنانے کے لیے تیار تھے، ان ہی شاہد حامد کے ہاتھ انہوں نے پیغام بھجوایا تھا کہ بہتر ہے کہ وہ صدارت سے مستعفی ہو جائیں وگرنہ پارلیمنٹ کے ذریعے ان کا احتساب کر کے انہیں گھر بھیج دیا جائے گا۔

صدر غلام اسحاق خان اور فاروق لغاری ایک بات بھول گئے تھے کہ ان کے بارے میں یہ بات طے تھی کہ اگر وہ ان لوگوں کے وفادار ثابت نہیں ہوئے جنہوں نے انہیں صدر بنوایا تھا تو بھلا ان سے دوسرے لوگ وفا کی کیا توقع رکھیں۔ شاید یہ بات چنگیز خان کے بارے میں مشہور ہے کہ جب بغداد شہر کے حکمران کے خلاف چند لوگوں نے اس کے فوجیوں کی مدد کی اور فتح کے بعد ایک قطار میں کھڑے ہو کر اپنے انعام کا انتظار کرنے لگے تو اس نے ایک تاریخی فقرہ کہہ کر ان سب کی گردنیں اڑانے کا حکم دیا تھا کہ جو لوگ اپنی مٹی اور اپنے لوگوں کے وفادار نہیں وہ بھلا کسی اور کے کیا وفادار ہوں گے۔

کچھ عرصے بعد فوج آگے بڑھ کر اقتدار پر قبضہ کر لے۔ بہانہ یہ بنایا جائے گا کہ فاروق لغاری کی کمزور کابینہ کرپٹ سیاستدانوں کا احتساب کرنے میں ناکام رہی تھی۔

جہاں ایک طرف آرمی چیف اور چیف جسٹس ملک میں انتخابات ملتوی کرانا چاہ رہے تھے وہاں کابینہ کے چند وزیر اور صوبائی گورنر بھی لغاری پر مسلسل یہ زور ڈال رہے تھے کہ وہ انتخابات نہ کرائیں بلکہ پہلے احتساب کیا جائے۔ فوجی قیادت بہت زیادہ بے چین تھی اور وہ ہر صورت ملک میں انتخابات ملتوی کرانا چاہ رہی تھی۔ جب لغاری پر دباؤ بڑھ گیا تو ایک دن فاروق لغاری کو جی ایچ کیو بلایا گیا جہاں انہوں نے کور کمانڈروں کو پانچ گھنٹے تک اس بات پر دلائل دیئے کہ ملک میں وقت پر انتخابات ہونا کتنے ضروری تھے۔ سول اور ملٹری حکمرانوں کے درمیان ان اختلافات کی بنیاد پر نیشنل سیکیورٹی کونسل کا آئیڈیا سامنے آیا۔ یوں فاروق لغاری اس ملک کے پہلے صدر تھے جنہوں نے فوج کے سیاست میں باقاعدہ رول کو تسلیم کیا۔

میں نے شاہد حامد سے پوچھ ہی لیا کہ اگر بینظیر بھٹو، آصف زرداری اور پارلیمنٹ کے وہ تمام ارکان جنہوں نے فاروق لغاری کو ووٹ دے کر صدر بنوایا تھا، وہ کرپٹ تھے تو پھر فاروق لغاری نے خود استعفیٰ کیوں نہیں دیدیا۔ اگر انہیں ووٹ دینے والے کرپٹ تھے تو پھر انہیں بھی اقتدار میں رہنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ کیا فاروق لغاری پر اخلاقی اور سیاسی طور پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنے تمام کرپٹ ساتھیوں کے ساتھ گھر چلے جاتے۔ انہوں نے ایک عجیب روایت قائم کی کہ جنہوں نے ان کو صدر بنوایا تھا وہ تو کرپٹ تھے اور موصوف خود اپنے آپ کو بہت ایماندار سمجھتے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ شاہد حامد کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

شاہد حامد اپنے ماضی کی یادوں میں ڈوبے ہوئے بولتے رہے۔ بینظیر بھٹو حکومت ختم ہو چکی تھی۔ نئے نئے منصوبے بن رہے تھے کہ اچانک ایک دن پتہ چلا کہ فاروق لغاری اور جہانگیر کرامت میں اختلافات پیدا ہو چکے ہیں۔ بینظیر بھٹو نے اپنی برطرفی سپریم کورٹ میں چیلنج کر دی تھی۔ سپریم کورٹ کے متوقع فیصلے سے ایک دن پہلے بحث کرنے کے لیے ایک میٹنگ بلائی گئی تھی۔ اس میٹنگ میں فاروق لغاری اور جنرل جہانگیر کرامت بھی شریک تھے۔ اس میٹنگ کا ایک ہی بات موضوع تھا کہ سپریم کورٹ کیا فیصلہ دے گی۔ سب کی نظریں شاہد حامد کی طرف اٹھیں کیونکہ ان دنوں وہ اس کیس کو براہ راست ڈیل کر رہے تھے۔ شاہد حامد نے بڑے اعتماد کے ساتھ اس میٹنگ کے شرکاء کو بتایا کہ سپریم کورٹ چھ کے مقابلے میں ایک ووٹ سے بینظیر بھٹو حکومت کی برطرفی کے فیصلے کو برقرار رکھے گی۔

میٹنگ کے شرکاء میں سے اچانک کسی ایک نے ایک انتہائی تکلیف دہ سوال پوچھ لیا کہ اگر سپریم کورٹ نے بینظیر بھٹو حکومت کو بحال کر دیا تو کیا ہوگا۔ ابھی سوال پوچھنے والے کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ فاروق لغاری نے بڑی اونچی آواز میں کہا کہ پھر وہ کل صبح ہی صدارت سے استعفیٰ دے دیں گے۔ فاروق لغاری کی اس بات نے اس میٹنگ میں بیٹھے ہوئے سب لوگوں کو سخت حیران کر دیا۔ ان میں سے کوئی بھی ان سے اس طرح کی بات کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ فاروق لغاری نے ان سب لوگوں کو ایک بہت بڑا واضح پیغام دے دیا تھا کہ وہ ان سب کو انتقام سے بھری بینظیر بھٹو کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود چولی زیریں جا کر ڈیرہ لگا لیں گے۔ اس میٹنگ کے شرکاء کو یہ احساس ہوا کہ فاروق لغاری ایک خود غرض انسان ہیں اور آنے والے دنوں میں ان کے دوستوں کے درمیان اسی ایک بات سے پیدا ہونے والے اختلافات شدید ہوتے گئے اور آخر ایک دن وہ ایوان صدر میں اتنے تنہا رہ گئے کہ نواز شریف کے ایک پیغام پر انہیں استعفیٰ دے کر گھر جانا پڑا۔

میں نے بات کا رخ دوسری طرف موڑا اور شاہد حامد سے پوچھا کہ اس بات میں کتنی صداقت ہے کہ فاروق لغاری نے بینظیر بھٹو کی پارٹی کو ہرانے کے لیے انتخابات میں دھاندلی کرائی تھی۔

شاہد حامد نے مجھے ایک عجیب سی بات بتائی۔

انتخابات کے نتائج نے ایوان صدر کے مکینوں کو بھی حیران کر دیا تھا کیونکہ وہ بھی یہ توقع نہیں کر رہے تھے کہ نواز شریف دو تہائی اکثریت لے کر الیکشن جیت جائیں گے۔ اس حیرانی کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ الیکشن سے کچھ دن پہلے آئی ایس آئی نے اپنی ایک رپورٹ ایوان صدر بھیجی تھی جس میں 2 فروری 1997ء کو ہونے والے انتخابات کے بارے میں سیاسی جماعتوں کے امیدواروں کے ہارنے اور جیتنے پر پیشن گوئیاں کی گئی تھیں۔ آئی ایس آئی کے بقول نواز شریف کی پارٹی کو نوے اور سو کے درمیان جبکہ بینظیر بھٹو کو پچاس اور ساٹھ کے درمیان سیٹیں ملنے کی توقع تھی۔ تاہم، جب رزلٹ آنا شروع ہوئے تو ایوان صدر کے مکین آہستہ آہستہ حیران اور پھر پریشان ہونا شروع ہو گئے کیونکہ وہ تو یہ توقع کر کے بیٹھے تھے کہ آئی ایس آئی نے جو کہہ دیا تھا وہ فائنل تھا۔ ایک بات واضح تھی کہ پیپلز پارٹی کے مایوس کارکن

ووٹ ڈالنے کے لیے اپنے گھروں سے نہیں نکلے تھے۔

میں نے بات آگے بڑھانے کی غرض سے شاہد حامد سے پوچھا کہ جب نواز شریف وزیر اعظم بن گئے تو پھر لغاری اور ان کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔ شاہد حامد بولے کہ شروع میں دونوں کے درمیان تعلقات بہت اچھے تھے۔ ایک پرائیویٹ ڈنر کا اہتمام کیا گیا جس میں فاروق لغاری، بیگم نسرین نواز شریف اور شاہد حامد شریک ہوئے۔ صدر لغاری نے نواز شریف کو اکانومی پر بریفنگ دی۔ شاہد جاوید برکی نے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے ساتھ طے پانے والے معاہدوں کی تفصیلات بتائیں۔ نواز شریف چاہتے تھے کہ شاہد جاوید برکی ملک کے وزیر خزانہ کے طور پر کام کرتے رہیں لیکن ورلڈ بینک کے اس ملازم نے انکار کر دیا۔ اسی ڈنر پر شاہد حامد نے نواز کو دفاع اور قانونی معاملات پر بریفنگ دی۔ نواز نے شاہد حامد کو بھی اپنی کابینہ میں وفاقی وزیر بنانے کی پیشکش کی۔ تاہم، فاروق لغاری چاہتے تھے کہ وہ پنجاب کے گورنر بن جائیں۔ جب کہ شاہد حامد کی یہ خواہش تھی کہ وہ فیڈرل منسٹر بن جائیں تا کہ وہ نواز اور لغاری کے درمیان ایک پل کا رول ادا کر سکیں۔ شاہد حامد نے محسوس کیا کہ فاروق لغاری کی شخصیت میں ایک بہت بڑی کمزوری تھی جس کا نام ڈیرہ غازی خان کی مقامی سیاست تھا۔ ایوان صدر میں بیٹھ کر بھی وہ اپنے حلقے کی چھوٹی موٹی سیاست میں ملوث رہتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ڈیرہ غازی خان ان کی انگلیوں پر ناچتا رہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب نواز شریف وزیر اعظم بنے تو لغاری نے ذاتی طور پر پنجاب کے وزیر اعلیٰ شہباز شریف سے یہ درخواست کی تھی کہ ڈیرہ غازی خان ان کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی اجازت دی جائے۔ جب ایک دن فاروق لغاری کی مقامی سیاست کے حوالے سے چھوٹی موٹی باتوں پر شاہد حامد تھوڑا سا جھنجلاہٹ کا شکار ہوئے تو صدر صاحب نے انہیں ایک طعنہ مارا:

"شاہد حامد صاحب! آپ چونکہ اقتدار میں کسی سیاسی جدوجہد یا عمل کے ذریعے نہیں آئے لہٰذا آپ کو اس بات کا احساس نہیں ہے کہ جب تک مقامی سیاست میں اس طرح کی چھوٹی موٹی چیزیں نہ کی جائیں، انتخابات نہیں جیتے جا سکتے۔"

شاہد حامد اپنے پرانے دوست کے احترام میں خاموش تھے لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ وہ یہ بات کہنا چاہ رہے تھے کہ کس طرح ایوان صدر میں بیٹھ کر بے نظیر بھٹو حکومت کو کرپشن اور بیڈ گورننس کے الزامات پر برطرف کرنے والے موصوف کس طریقے سے اپنے مخالفین کو تھانہ کچہری اور پٹواریوں کے ذریعے تنگ کر

کے ووٹ پکے کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ تاہم لگتا ہے کہ مخالفین کو ذلیل کرنے کے باوجود بھی فاروق لغاری اپنی گرتی ہوئی مقبولیت کو اپنے حلقے میں نہیں سنبھال سکے اور 2008ء کے الیکشن میں وہ شخص جو 1988ء میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر ایک لاکھ سے زائد ووٹوں کی لیڈ سے جیتا تھا، وہ بمشکل تین دفعہ اپنے حلقے میں ووٹ دوبارہ گنوا کر ایم این اے بن سکا۔

شاہد حامد نے مجھے بتایا کہ جب نواز شریف وزیر اعظم بنے تو فاروق لغاری خود چاہتے تھے کہ صدر کے اسمبلی توڑنے کے اختیارات کو ختم ہونا چاہیے۔ شاید لغاری یہ بات سمجھ چکے تھے کہ ایک صدر صرف ایک دفعہ اسمبلی توڑ سکتا ہے۔ اگر وہ دوبارہ یہ کوشش کرے گا تو اس کا حشر بھی وہی کچھ ہو گا جو غلام اسحاق خان کا ہوا تھا۔ جب 6 اگست 1990ء کو غلام اسحاق خان نے بے نظیر بھٹو کی حکومت توڑی تھی تو فوج، عوام، میڈیا اور سیاستدانوں نے زیادہ ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا کہ شاید بے نظیر بھٹو کا زیادہ قصور تھا۔ تاہم، جب تین سال بعد مارچ، اپریل 1993ء میں غلام اسحاق خان نے وہی کام نواز شریف کے ساتھ کیا تو پھر سب نے یہی سمجھا کہ صدر کے ساتھ ہی کچھ مسئلہ ہے جو سیاسی حکومتوں کو نہیں چلنے دے رہا۔ جب تک اس کی چھٹی نہیں ہو گی ملک کا نظام آگے نہیں چلے گا اور یوں غلام اسحاق خان کو سول ملٹری بیوروکریسی کی تمام تر حمایت کے باوجود استعفیٰ دے کر گھر جانا پڑ گیا تھا۔ یہی بات شاید فاروق لغاری کے ذہن میں بھی تھی کہ وہ اپنا اختیار ایک دفعہ استعمال کر چکے تھے۔ اب کی دفعہ ان کے ساتھ کوئی کھڑا نہیں ہو گا۔

جب فاروق لغاری نے اپنی اس خواہش کا اظہار جنرل جہانگیر کرامت کے سامنے کیا تو صدر صاحب بڑے حیران ہوئے جب آرمی چیف نے یہ فرمایا کہ جناب آپ کو یہ 58-2b ختم کرنے کی اتنی جلدی کیوں ہے۔ صدر لغاری کے لیے یہ پیغام بڑا واضح تھا کہ جناب آپ کے لیے استعمال کرنے کا وقت ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ آرمی چیف شاید بے نظیر کی طرح نواز شریف کی چھٹی بھی صدر لغاری کے ذریعے کرانا چاہ رہے تھے۔

نواز شریف صدر لغاری کے اس اختیار کو بڑے احسن طریقے سے ختم کرانے کے موڈ میں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے چوٹی زیریں جا کر صدر لغاری کو ان کی اسمبلیاں توڑنے کے اختیارات ختم کرنے کے مسئلے پر اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا۔ جب میٹنگ شروع ہوئی اور نواز شریف نے یہ بات لغاری

کہے گئے کہ وہ پارلیمنٹ کے ذریعے صدر صاحب کے اسمبلیاں توڑنے کے اختیارات کو ختم کرنا چاہ رہے ہیں تو لغاری صاحب نے فوراً کہا کہ بالکل ٹھیک ہے۔ نواز شریف نے اسلام آباد واپس آ کر پارلیمنٹ کے اجلاس سے اس کلاز کو ختم کرا کے لغاری صاحب کے ہاتھ سے آرمی چیف اور دیگر اہم تعیناتیاں کرنے کی پاور اپنے ہاتھ میں لے لیں تو یکدم سب لوگوں کو محسوس ہوا کہ لغاری صاحب اور نواز شریف میں تعلقات کافی بگڑ چکے ہیں۔

اس سے پہلے جب نواز شریف چوٹی زیریں جا رہے تھے تو گورنر شاہد حامد بھی ان کے ساتھ تھے۔ راستے میں نواز شریف نے شاہد حامد کو بتایا کہ آپ لغاری صاحب کو یہ بات بتائیں کہ ہم ان کی قابلیت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ دوسری دفعہ بھی ملک کے صدر بنیں۔ تاہم، لغاری صاحب کے ساتھ ہونے والی میٹنگ سے پہلے شاہد حامد نے نواز شریف کو بتایا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آرمی چیف کون مقرر کر رہا ہے صدر یا وزیراعظم کیونکہ جونہی ایک جنرل آرمی چیف بنتا ہے تو وہ فوری طور پر چیف آف آرمی سٹاف بن جاتا ہے۔ اس کی ہمدردیاں پھر اپنے ادارے کے ساتھ ہوتی ہیں نہ کہ صدر یا وزیراعظم کے ساتھ!

شاہد حامد نے اس بات کا اعتراف کیا کہ 58-2b کے ختم ہونے سے صدر اور وزیراعظم کے اب تک اچھے تعلقات میں یقیناً فرق پڑا۔ شاہد حامد کو اس بات پر قطعاً کوئی شبہ نہیں تھا کہ نواز شریف اور لغاری کے درمیان اس کلاز کا خاتمہ بالآخر آنے والے دنوں میں دونوں کے درمیان شدید اختلافات اور صدر لغاری کے استعفیٰ پر ہوا۔

شاہد حامد نے اس بات کو بھی تسلیم کیا کہ الیکشن ہونے سے پہلے فاروق لغاری نے نواز شریف کو بہت بڑی فیور کی تھی، یعنی جب امیدواروں کی قابلیت کے مسئلے پر چند چیزیں جو نواز شریف کو الیکشن لڑنے سے روک سکتی تھیں، انہیں ختم کر دیا گیا۔ نواز شریف اور خالد انور نے شاہد حامد سے یہ بات کی تھی کہ فاروق لغاری کو کہیں کہ وہ کسی امیدوار کی الیکشن لڑنے کی شرائط میں سے یہ بات نکال دیں کہ وہ تمام لوگ انتخابات لڑنے کے اہل نہیں تھے جو کسی ایسی مل یا کمپنی کے مالک تھے جو کسی بینک کی مقروض ہو۔ نواز شریف یہ چاہتے تھے کہ اس قانون میں سے کنٹرول اور مل مالک کے الفاظ نکال دیے جائیں۔ جب یہ بات نگران کابینہ کے سامنے رکھی گئی تو تمام وزیر دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئے۔ کچھ وزیروں کا خیال تھا کہ نواز شریف بڑے لیڈر تھے لہٰذا ان کی یہ بات مان لینی چاہیے تاکہ وہ الیکشن لڑ سکیں جبکہ باقی وزیر اس بات کے خلاف تھے کیونکہ ان کے خیال میں اگر صرف نواز شریف کے لیے اس قانون میں تبدیلی کی گئی تو فاروق لغاری اور ان کی نگران کابینہ کی ساکھ بُرے طریقے سے خراب ہوگی۔

شاہد حامد نے بتایا کہ ان کا خیال تھا کہ شاید نواز شریف خود اس کلاز سے بُرے طریقے سے متاثر ہوں گے۔ نواز شریف کا جواب سن کر شاہد حامد حیران رہ گئے۔ نواز نے انہیں بتایا کہ دراصل اس کلاز سے انہیں ذاتی طور پر تو کوئی نقصان نہیں ہے، لیکن اگر اسے نہ ہٹایا گیا تو چوہدری شجاعت حسین الیکشن نہیں لڑ سکیں گے۔

صدر لغاری نواز شریف کی اس درخواست پر غور کرنے کے لیے تیار ہو گئے اور "اصولوں کی بنیاد" پر ان تمام لوگوں کو الیکشن لڑنے کی اجازت دے دی گئی جو ان کمپنیوں یا ملوں کے مالک تھے جن کے ذمے بینکوں کے کروڑوں یا ارب روپے کے قرضے واجب الادا تھے۔

الیکشن ہو گئے تھے۔ نواز شریف وزیراعظم بن چکے تھے۔ 58-2b کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ لوگوں نے سکھ کا سانس لیا تھا کہ شاید اب سیاسی انتشار ختم ہو چکا ہے۔ تاہم، کسی کو یہ علم نہیں تھا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرانے والی ہے۔ صدر لغاری کے نواز شریف سے بھی عدلیہ کے مسئلے پر اسی طریقے کے اختلافات شروع ہونے والے تھے جیسے کہ بینظیر بھٹو سے ہوئے تھے جو پیپلز پارٹی حکومت کی برطرفی پر جا کر ختم ہوئے۔ دھیرے دھیرے فاروق لغاری کو یہ احساس ہونا شروع ہو گیا کہ نواز شریف بھی سارے اختیارات اپنے ہاتھوں میں لینا چاہ رہے تھے۔ وہ اختلافات جو دراصل وزیراعظم نواز شریف اور چیف جسٹس سجاد علی شاہ کے درمیان شروع ہوئے تھے اس کی لپیٹ میں فاروق لغاری بھی آ گئے حالانکہ شروع میں فاروق لغاری کا ان دونوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ نواز شریف اور سجاد علی شاہ کے درمیان اختلافات اس وقت شروع ہوئے جب وزیراعظم نے ملک بھر میں انٹی ٹیرارسٹ کورٹس بنا کر عدلیہ کے سامنے ایک نیا ادارہ کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ سجاد علی شاہ نے نواز شریف کو بتایا کہ وہ نئی عدالتیں نہ بنائیں کیونکہ موجودہ قوانین کے تحت بھی دہشتگردوں کو سزا دی جا سکتی ہے۔ ابھی اس مسئلے کی گرد نہیں بیٹھی تھی جب سپریم کورٹ میں ججوں کی تعداد پر ایک نیا تنازعہ کھڑا ہو گیا۔ نواز شریف لاہور ہائی کورٹ کے پانچ ججوں کو سپریم کورٹ کا جج مقرر کرنے کے خلاف

درمیان بڑھتے ہوئے اختلافات کی کہانیوں سے باخبر تھے۔ ایک دن جنرل جہانگیر کرامت نے شاہد حامد کو فون کیا اور ان سے ان دس ججوں کے بارے میں قانونی رائے مانگی جنہوں نے سجاد علی شاہ کے خلاف بغاوت کی تھی۔ شاہد حامد نے جہانگیر کرامت کو وضاحت کے ساتھ سمجھایا کہ دس ججوں کی بغاوت کے بعد سجاد علی شاہ کو اب گھر جانا ہوگا۔ شاہد حامد کی بات سن کر جہانگیر کرامت نے کہا کہ جی ایچ کیو کی لیگل برانچ نے بھی انہیں یہی رائے دی ہے کہ سجاد علی شاہ کو اب جانا پڑے گا۔

فاروق لغاری اور نواز شریف کے درمیان اختلافات بہت آگے بڑھ چکے تھے۔ نواز شریف کا خیال تھا کہ چیف جسٹس سجاد علی شاہ ان کی جس انداز میں توہین کر رہے ہیں اس کے پیچھے فاروق لغاری کا ہاتھ ہے جبکہ فاروق لغاری کا یہ خیال تھا کہ نواز شریف اور بینظیر بھٹو کے درمیان کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ دونوں عدلیہ کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتے ہیں۔

نواز شریف نے آخر ایک دن یہ فیصلہ کر لیا کہ اب وہ فاروق لغاری کے خلاف پارلیمنٹ میں قرارداد لا کر ان کی صدارت سے چھٹی کرائیں گے۔ جب شاہد حامد کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ بھاگے بھاگے چوہدری نثار اور شہباز شریف کے پاس گئے اور انہیں کہا کہ وہ لغاری کے ساتھ یہ سلوک نہ کریں۔ تاہم، شاہد حامد یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ ان سے زیادہ جنرل جہانگیر کرامت کی بات سنی گئی جنہوں نے فاروق لغاری کو پارلیمنٹ کے ہاتھوں ذلیل ہو کر گھر جانے سے بچا لیا اور بات لغاری کے استعفیٰ پر ختم ہوگئی۔

فاروق لغاری کو اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ نواز شریف نے ججوں پر 'کام' کیا تھا لیکن شاہد حامد کو یہ بات کچھ نہیں آتی تھی کہ بھلا ایک ہی وقت میں ایک شخص دس ججوں پر کیسے کام کر سکتا تھا۔ ان کے خیال میں لوگ یہ بات کیوں بھول جاتے تھے کہ باقاعدہ ایک فل کورٹ منعقد ہوئی تھی اور سب سے سینئر جج نے اس کی صدارت کی اور متفقہ فیصلے کے تحت سجاد علی شاہ کو ہٹایا گیا تھا۔

جب جہانگیر کرامت کو اس بات کا پتہ چلا کہ فاروق لغاری استعفیٰ دینے والے ہیں تو انہوں نے انہیں اس بات سے منع کیا۔ فاروق لغاری نے نواز شریف کو پیغام بھیجا کہ وہ وسیم سجاد کو اس ملک کا قائم مقام صدر بنا دیں جن کا ضمیر چیف جسٹس سجاد علی شاہ کو ہٹانے کی سمری پر دستخط کرتے وقت ڈسٹرب نہیں کرے گا۔

فاروق لغاری کے ایوان صدر میں آخری دنوں کو یاد کرتے ہوئے شاہد حامد بولے کہ استعفیٰ سے کچھ دن قبل فاروق لغاری نے ان سے قانونی معاملات پر مشاورت بند کر دی تھی۔ اب اس کام کا فریضہ ان کے نئے دوست خواجہ طارق رحیم اور شہزادہ جہانگیر ادا کر رہے تھے۔

شاہد حامد نے گہری سانس لی اور کہا کہ اگرچہ چیف جسٹس کو ہٹانے کے معاملے پر وہ اپنے دوست فاروق لغاری کے ہم خیال نہیں تھے لیکن ان کے خیال میں لغاری کو استعفیٰ نہیں دینا چاہیے تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور سوال آیا اور میں نے تنہائی کے ماحول میں بڑھتی ہوئی خنکی کے درمیان شاہد حامد سے پوچھ لیا کہ جب ان کے دوست فاروق لغاری استعفیٰ دے رہے تھے تو کیا یہ ان کی بھی اخلاقی ذمہ داری نہیں بنتی تھی کہ جو شخص انہیں اتنا اوپر لے آیا تھا، جب وہ کسی صحیح یا غلط وجہ سے استعفیٰ دے رہا تھا تو انہیں بھی اپنے دوست کا ساتھ دینا چاہیے تھا۔ لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ہوا کا رخ بدلتے دیکھ کر شاہد حامد نے بھی فاروق لغاری کی ڈوبتی ہوئی کشتی میں بیٹھنے کی بجائے نواز شریف کے جہاز میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

میرا چبھتا ہوا اور تلخ سوال سن کر شاہد حامد نے انکشاف کیا کہ جس دن فاروق لغاری نے صدارت سے استعفیٰ دیا تھا اس دن دوسرے صوبائی گورنروں کی طرح انہیں بھی لاہور سے بلایا گیا۔ نواز شریف نے بڑی تفصیل سے ان سب لوگوں کو وہ حالات و واقعات بتائے جن کی وجہ سے فاروق لغاری کو آج استعفیٰ دینا پڑ گیا تھا۔ نواز شریف سے ملنے سے پہلے شاہد حامد ایئرپورٹ سے اترنے کے بعد سیدھے آرمی چیف جہانگیر کرامت سے ملنے گئے جہاں انہوں نے بیٹھ کر اس نئی صورتحال پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اس کے بعد وہ سیدھے نواز شریف سے ملنے چلے گئے۔ جب گورنرز سے نواز شریف کی میٹنگ ختم ہوئی تو شاہد حامد نے چپکے سے اپنی جیب سے استعفیٰ نکالا اور نواز شریف کے حوالے کر دیا۔ تاہم نواز شریف نے شاہد حامد کو کہا کہ وہ گورنر پنجاب کے طور پر کام کرتے رہیں۔ نواز نے شاہد حامد کو بتایا کہ وہ انہیں گورنر پنجاب کی پوزیشن سے اس لیے بھی نہیں ہٹائیں گے تاکہ کہیں یہ تاثر نہ پیدا ہو کہ وہ فاروق لغاری کے آدمی تھے لہٰذا ان کی بھی چھٹی کرا دی گئی۔

جب نواز شریف نے شاہد حامد کا استعفیٰ مسترد کیا تو انہوں نے وزیراعظم کو فاروق لغاری سے اپنے ہونے والی میٹنگ کے بارے میں بتایا جو انہیں ابھی جا کر کرنی تھی۔ یہ سن کر نواز شریف نے شاہد

ایسی ترتیب دستیاب ہے جس سے آپ ڈار کے اندر چھپی شخصیات کا با آسانی اندازہ کر سکتے ہیں۔

بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہوں گے کہ اسحاق ڈار اور نواز شریف جو دونوں کشمیری ہیں، گورنمنٹ کالج لاہور میں 1968ء میں کلاس فیلو بھی تھے۔ جب نواز شریف وزیر اعظم بنے تو انہوں نے اپنی برادری سے تعلق رکھنے والے اپنے اس کلاس فیلو کو بورڈ آف انویسٹمنٹ کا چیئرمین لگا دیا۔ جب غلام اسحاق خان نے 1993ء میں نواز شریف کی حکومت برطرف کی تو انہوں نے اسحاق ڈار کو یہ پیشکش کی کہ وہ اپنے عہدے پر کام کرتے رہیں۔ ایک اردو اخبار کے مالک کو یہ پیغام دے کر ان کے پاس بھیجا گیا لیکن اسحاق ڈار نے یہ پیشکش مسترد کر دی۔

نواز شریف کی برطرفی کے بعد اسحاق ڈار نے سیاست کو باقاعدہ جائن کر لیا۔ 1993ء میں لاہور میں ہونے والے بائی الیکشن میں انہوں نے ایم این اے کی سیٹ جیتی۔ سیٹ اس وقت جیتی جب اسلام آباد میں بینظیر بھٹو کی اور پنجاب میں ان کی پارٹی کی حکومت تھی۔ انہیں نواز شریف سے علیحدہ کرنے کے لیے ایک وفاقی وزیر کو ان کے پاس بھیجا گیا اور اس کے بدلے میں بہت ساری پیشکشیں کی گئیں۔ ان کے انکار پر پیپلز پارٹی کو بڑا غصہ آیا۔ ان کے خلاف الیکشن ٹریبونل میں ایک پٹیشن فائل کر کے انہیں اس بات پر ڈس کوالیفائی قرار دے دیا گیا کہ وہ بورڈ آف انویسٹمنٹ کے چیئرمین ہونے کے ناطے دو سال تک الیکشن لڑنے کے اہل نہیں تھے۔ تاہم بعد میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے ایک فل بنچ نے اسحاق ڈار کے حق میں یہ کہہ کر فیصلہ دیا کہ کوئی بھی شخص اگر کسی سرکاری عہدے پر بغیر تنخواہ اور مراعات لیے کام کرتا ہے تو اس پر دو سال کی شرط لاگو نہیں ہوتی۔ کئی برسوں بعد سپریم کورٹ کے ایک جج نے اسحاق ڈار کو بتایا کہ انہیں آصف زرداری کے پریشر پر الیکشن ٹریبونل سے ڈس کوالیفائی کرایا گیا تھا۔

نواز شریف کو اسحاق ڈار کی یہ ادا بڑی پسند آئی۔ یہی وجہ تھی جب 1997ء میں وہ دو تہائی اکثریت سے جب دوبارہ اقتدار میں آئے تو انہوں نے ڈار کو اپنا وزیر تجارت مقرر کر دیا۔ وزیر بنتے ہی ڈار نے ان پانچ وجوہات کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا جو ہر سیاسی حکومت لوگوں کو رشوت کے طور پر استعمال کر کے اقتدار میں اپنے دن پورے کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ ان کے نزدیک وہ پانچ چیزیں جو رشوت کے طور پر استعمال کی جاتی رہی تھیں ان میں وزیر اعظم کا صوابدیدی اختیار کہ وہ کسی کو بھی پلاٹ الاٹ کر سکتے تھے، ٹیکسٹائل کوٹے میں صوابدیدی اختیارات، صدر، وزیر اعظم، آرمی چیف اور گورنرز کا ڈیوٹی فری

گاڑیاں امپورٹ کرنے کا استحقاق، اسپیشل امپورٹ ایکسپورٹ پرمٹس اور کیش ایڈوانس گرانٹس شامل تھیں۔

اسحاق ڈار نے سب سے پہلے ٹیکسٹائل کوٹہ ختم کیا۔ مرسیڈیز گاڑیوں کی ڈیوٹی فری امپورٹ ختم کر دی گئی اور ساتھ ہی امپورٹ ایکسپورٹ اسپیشل پرمٹس بھی بند کر دیے گئے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان کے اس فیصلے کا اطلاق سب سے پہلے اس وقت کے صدر رفیق تارڑ اور آرمی چیف جنرل پرویز مشرف پر ہوا ورنہ ان سے پہلے جو بھی اقتدار میں آیا اس نے ڈیوٹی فری گاڑیاں ضرور منگوائیں۔ بقول ڈار کے نواز شریف نے دونوں دفعہ وزیر اعظم ہونے کے باوجود ڈیوٹی فری گاڑیاں نہیں منگوائیں۔ جونہی اسحاق ڈار نے صوابدیدی اختیارات کے تحت ٹیکسٹائل کوٹے کو ختم کیا ان سے طاقتور سیاستدان، ایم این ایز اور وہ بزنس مین ناراض ہو گئے جو ماضی میں ان مراعات سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔ پہلی دفعہ ملک میں ٹیکسٹائل کوٹے کی الاٹمنٹ نیلامی کے ذریعے کی گئی اور 3.3 بلین روپے میں یہ کوٹے بیچے گئے جبکہ بینظیر بھٹو کے دور میں ان کوٹوں سے صرف 73 کروڑ روپے کمائے گئے تھے۔

جونہی ڈار کے اس فیصلے کا لوگوں کو پتہ چلا تو وہ دوڑے دوڑے نواز شریف کے پاس گئے اور ان کے خلاف شکایتوں کا ایک انبار لگا دیا گیا۔ تاہم، نواز شریف نے اسحاق ڈار کو کھل کر سپورٹ کی اور یوں 1998-99 میں آنے والی ٹریڈ پالیسی کے ذریعے سیاست میں کوٹوں کی کرپشن کو ختم کر دیا گیا۔

ایک دن نواز شریف نے اسحاق ڈار کو بلایا اور ان سے کہا کہ وہ انہیں سرتاج عزیز کی جگہ ملک کا نیا وزیر خزانہ مقرر کر رہے ہیں۔ اسحاق ڈار کے لیے یہ ایک نئی خبر تھی۔

میں یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ آخر نواز شریف نے سرتاج عزیز کو ہٹا کر ڈار کو وزیر خزانہ لگانے کا فیصلہ اچانک کیوں کر لیا تھا۔

اسحاق ڈار نے دھیرے دھیرے ان تمام رازوں سے پردہ اٹھانا شروع کر دیا تھا جن کی تلاش میں میں ان سے ملنے کے لیے ان کے پاس آیا تھا۔

جس دن پاکستان نے مئی 1998ء میں نیوکلیئر ٹیسٹ کیے اس کے ساتھ ہی پاکستان کے مالی معاملات بگڑنا شروع ہو گئے۔ اس وقت کی معاشی ٹیم کے لیے عالمی اداروں کی طرف سے لگائی گئی پابندیوں کے بعد معاملات کو سنبھالنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ جس دن پاکستان نے نیوکلیئر بم کا تجربہ کیا اس

ہوئے میں آپ کو صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ نومبر 1998ء میں اس وقت کے [illegible] پاشا اور سیکرٹری فنانس معین افضل کو برخاست کرنے کی بھی وجہ تھی۔

میں کافی دیر تک ششدر ہو کر اسحاق ڈار کو دیکھتا رہا جب وہ ان تمام رازوں سے پردہ اٹھا رہے تھے کہ کیسے جاوید پاشا اور معین افضل نے اپنے ملک کے دو ارب ڈالر کے اثاثوں کو چند گھنٹوں میں آئی ایم ایف کو ڈکلیئر کروا دیا تھا۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کیسے عالمی ادارے اپنے پاکستانی ایجنٹوں کے مفادات کا خیال رکھتے ہیں۔ وہی شخص جسے نواز شریف نے قومی راز افشا کرنے پر ڈس مس کیا تھا وہ مشرف حکومت میں سیکرٹری جنرل فنانس کے عہدے پر تعینات ہوا۔ آئی ایم ایف نے انہیں ان کا انعام دلوا دیا تھا۔

ڈالروں کی بڑھتی ہوئی قلت نے اسحاق ڈار کو مجبور کیا کہ وہ امریکہ سے F-16 طیاروں کی رکی ہوئی رقوم کی ادائیگیاں کرانے کے لیے بل کلنٹن حکومت پر دباؤ ڈالیں۔ 2 دسمبر 1998ء کو نواز شریف بل کلنٹن سے وائٹ ہاؤس میں ملے۔ ان کے ساتھ سرتاج عزیز، اسحاق ڈار، شہباز شریف اور مشاہد حسین بھی تھے۔ بل کلنٹن نے نواز شریف کو کہا کہ وہ F-16 کے باقی پیسوں میں سے ستر فیصد واپس لے لیں، باقی تیس فیصد امریکہ اپنے پاس رکھے گا اور اس معاملے کو یہیں ختم سمجھا جائے۔ اسحاق ڈار نے جب یہ آفر سنی تو وہ تیس فیصد نقصان کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ انہوں نے بل کلنٹن سے کہا کہ سر! جب یہ خبر پاکستان پہنچے گی کہ امریکہ نے پاکستان کے F-16 طیاروں کی تیس فیصد رقم بغیر کسی وجہ کے رکھ لی ہے تو اس کا کوئی اچھا اثر عوام پر نہیں ہو گا کیونکہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بل کلنٹن اور نواز شریف اچھے دوست ہیں اور ایک دوست دوسرے کے ساتھ اس طرح کی ناانصافی نہیں کر سکتا۔

بل کلنٹن نے بڑی حیرانی سے اسحاق ڈار کی بات سنی اور بولے کہ امریکہ کی سپریم جوڈیشل کونسل نے انہیں جو ایوارڈ دی تھی اس کے تحت وہ اتنا کچھ انہیں آفر کر سکتے تھے اور اس سے زیادہ کا ان کے پاس اختیار نہیں تھا۔ کلنٹن نے بتایا کہ ان کے پاس کانگریس میں بھی اکثریت نہیں تھی جہاں سے وہ سپریم جوڈیشل کونسل کے فیصلے کے خلاف پاکستان کو F-16 طیاروں کی سو فیصد رقوم کی واپسی کا فیصلہ کرا دیتی۔

ڈار نے تجویز پیش کی کہ اس کا دوسرا حل یہ ہے کہ اس وقت پاکستان کو گندم اور کارن کی بڑی اشد ضرورت ہے۔ ان دنوں حکومت پاکستان یہ دونوں چیزیں خریدنے کے لیے ٹینڈرز کر رہی ہے لہٰذا

امریکہ یہ دونوں چیزیں کسی معاہدے کے تحت پاکستان کو ادھار میں دے سکتا ہے۔ آخر بل کلنٹن یہ بات مان گئے کہ امریکہ پاکستان کو 140 ملین ڈالر کی گندم اور کارن فراہم کرے گا۔

وزیر خزانہ بننے کے بعد ڈار کا کردار بہت زیادہ وسیع ہو گیا تھا۔ ان کے پاس اب فوجی سامان کی خریداری کے معاہدے بھی آنے لگے جن کے لیے وزارت خزانہ نے ادائیگیاں کرنی تھیں۔ ایک دن ڈار کو پتہ چلا کہ اس وقت کے چیف آف آرمی سٹاف جہانگیر کرامت سوئٹزرلینڈ سے پانچ انٹی ایئر کرافٹ گنز لینا چاہ رہے ہیں جس کے ساتھ پاکستان کا ایک بہت بڑا پروٹوکول وہاں موجود ہے جس کے تحت دونوں ممالک مشترکہ طور پر انٹی ایئر کرافٹ گنز تیار کریں گے۔ اس معاہدے کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ تھی کیونکہ سوئٹزرلینڈ کے ایک مینوفیکچر نے حال ہی میں ترکی اور چین کے ساتھ اس طرح کے معاہدے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس پروٹوکول کے تحت اگر پاکستان اس مینوفیکچر کو پانچ انٹی ایئر کرافٹ گنز مینوفیکچر کرنے کا آرڈر دیتا تو وہ پاکستان میں بھی ان گنز کی تیاری شروع کر سکتے تھے۔ اسحاق ڈار کا خیال تھا کہ اگر اس معاہدے کو استعمال کرتے ہوئے پاکستان میں انٹی ایئر کرافٹ گنوں کی تیاری شروع کر دی جاتی تو بڑے آرام سے اس فوجی اسلحے کو چین اور ترکی جیسے ملکوں کو ایکسپورٹ کر کے کئی ملین ڈالر کمائے جا سکتے تھے۔ اسحاق ڈار نے سب سے پہلے سعودی عربیہ کے ساتھ بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ کراؤن پرنس عبداللہ اور ملائیشیاء کے وزیر اعظم مہاتیر محمد سے بات چیت کی گئی۔ ان دونوں نے انتہائی مثبت جواب دیا اور کہا کہ اگر پاکستان میں انٹی ایئر کرافٹ گنز کی تیاری شروع ہو گئی تو وہ یقیناً پاکستان کو ملین ڈالرز کے آرڈرز دیں گے۔

جب ڈار نے یہ ساری بات چیت سعودی عربیہ اور ملائیشیاء سے شروع کی تو اس کے بعد جہانگیر کرامت اب کسی غیر ملکی مینوفیکچر کو انٹی ایئر کرافٹ گنیں تیار کرنے کا آرڈر نہیں دے سکتے تھے لیکن ساتھ ہی افسوسناک بات یہ ہوئی کہ جنرل جہانگیر کرامت نے ان گنوں کی تیاری کا آرڈر ہیوی مکینیکل کمپلیکس کو بھی نہیں دیا جس سے پاکستان کو اچھا خاصا نقصان ہوا کیونکہ ان گنوں کو سوئٹزرلینڈ کی مدد سے تیار کر کے سعودی عرب، ملائیشیاء اور دیگر ممالک کو ایکسپورٹ کیا جا سکتا تھا۔

میں ڈار سے پوچھنے کے لیے بے چین تھا کہ آخر کارگل آپریشن پر کون جھوٹا اور کون سچا تھا۔ تقریباً چھ ماہ پہلے چوہدری شجاعت نے مجھے ہی ایک انٹرویو دے کر پاکستانی سیاست میں ایک نئی بحث

انہیں گھر سے نکلتے وقت سکول جانے سے پہلے تلاشی کے مراحل سے گزرنا پڑتا۔ گھر کی خواتین کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔

"کیا میں غدار تھا" اسحاق ڈار نے بڑی تلخی سے مجھ سے سوال پوچھا۔

میں چپ رہا۔

25 اپریل سے لے کر 6 دسمبر 2000ء تک فوج نے اسحاق ڈار سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ وہ اپنے گھر میں قید رہے۔ آخر ایک دن لیفٹیننٹ جنرل محمود ان سے ملنے کے لیے ان کے گھر لاہور آئے۔ جنرل محمود نے ڈار صاحب کو بتایا کہ جنرل مشرف کے بعد اگر کوئی سب سے مصروف شخص تھا تو وہ تھے لیکن پھر بھی وہ ان سے ذاتی طور پر ملنے لاہور آئے ہیں۔ جنرل محمود نے اسحاق ڈار کو بتایا کہ آرمی کی ٹاپ لیڈرشپ ان کی ملک کے لیے کی گئی خدمات کو مانتی ہے اور وہ جاننا چاہتے تھے کہ ڈار صاحب کے اب سیاسی منصوبے کیا ہیں۔ اسحاق ڈار نے بڑے طنزیہ لہجے میں جنرل محمود کو جواب دیا کہ جی ہاں! آپ درست فرماتے ہیں اس ملک کے لیے اتنی خدمات دینے کا انعام مجھے 12 اکتوبر کے بعد قید میں ڈال کر پہلے ہی دے دیا گیا تھا۔

جنرل محمود نے وضاحت کی کہ اصل [illegible] ڈار صاحب کو نواز شریف کے سب سے زیادہ قریب سمجھا جاتا تھا اور ایک طرح سے وہ ان کے اہم مشیر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سب کا خیال تھا کہ یہ شخص ہی [illegible] اسحاق ڈار نے نواز شریف اور ان کی [illegible] سے بے پناہ فائدہ پہنچائے ہوں۔

ڈار صاحب نے جنرل محمود کو بتایا کہ 25 اپریل کو جنرل امجد نے انہیں خود ایک [illegible] [illegible] 2 [illegible] [illegible] ان کے خلاف [illegible] گئے تھے۔

جنرل محمود نے ڈار صاحب کو بتایا کہ وہ ان سے ملنے کے لیے اس وقت آئے ہیں جب ان کے خلاف نیب [illegible] تحقیقات مکمل کر لی گئی ہیں اور انہیں یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ اسحاق ڈار کے خلاف انہیں کوئی ایک بھی ایسی چیز نہیں ملی جس پر وہ کوئی اعتراض کرتے۔ اسی لیے وہ ذاتی طور پر ملنے کے لیے ان کے گھر آئے ہیں۔ صرف جنرل مشرف کو اس میٹنگ کا علم ہے۔

تاہم جنرل محمود نے ڈار صاحب سے نہیں کہا کہ وہ نواز شریف کو چھوڑ دیں۔

25 دسمبر 2000ء کو آئی ایس آئی پنجاب کے چیف نے ڈار صاحب کو مطلع کیا کہ 27 دسمبر کو انہیں اور مشاہد حسین کو رہا کر دیا جائے گا۔ ڈار صاحب کو کہا گیا کہ وہ یہ بتائیں کہ 28 دسمبر کو عید کی نماز کہاں پڑھنا پسند کریں گے تاکہ ان کے لیے سکیورٹی کا انتظام کیا جا سکے۔

اگلے دن 26 دسمبر کو ایک آئی ایس آئی آفیسر میاں محمد اظہر کو ان سے ملوانے کے لیے لے آئے۔ اسحاق ڈار کو یوں محسوس ہوا کہ ملک کا وزیراعظم ان سے ملنے کے لیے گھر آیا ہے۔ میاں اظہر کو اس طرح پروٹوکول دیا گیا جا رہا تھا جیسے وہ اس وقت ملک کے وزیراعظم ہوں۔ میاں اظہر بھی ایسے ہی ایکٹ کر رہے تھے جیسے وہ واقعی بغیر حلف اٹھائے اس ملک کے وزیراعظم تھے۔ ادھر ادھر کی باتوں میں وقت ضائع کیے بغیر میاں اظہر نے اسحاق ڈار کو کہا کہ وہ جنرل مشرف کے زیر سایہ بننے والی سیاسی پارٹی میں شامل ہو جائیں۔ اسحاق ڈار نے انکار کیا اور میاں اظہر کو یاد دلایا کہ ان دونوں کو سیاست میں لانے والے نواز شریف تھے اور اس وقت نواز شریف کو چھوڑنا مناسب نہیں ہوگا۔

اسحاق ڈار کا انکار سن کر میاں اظہر نے ایک لمبی وضاحت پیش کی کہ انہوں نے نواز شریف کو کیوں چھوڑا تھا۔ میاں اظہر نے ڈار کو بتایا کہ ان کے پاس آنے کی ایک اور وجہ بھی تھی کہ جنرل مشرف انہیں ذاتی طور پر پسند کرتے ہیں۔ میاں اظہر نے جب بات بنتے نہیں دیکھی تو انہوں نے اسحاق ڈار پر طنز کیا کہ جناب اب نواز شریف ڈیل کر کے سعودی عرب جا رہے تھے تو ایک لمحے کے لیے بھی انہوں نے اسحاق ڈار اور دیگر ساتھیوں کا نہیں سوچا اور آج وہ بیٹھے نواز شریف سے وفاداری کا ڈھول پیٹ رہے ہیں۔ میاں اظہر دو گھنٹے تک اسحاق ڈار کے ساتھ رہے اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ بات نہیں بنی تو لوٹ گئے۔

میاں اظہر نے جا کر جنرل مشرف کو ان کے خلاف انتہائی نیگیٹو رپورٹ پیش کی۔ فروری 2001ء میں دی نیوز کے ایڈیٹر انویسٹی گیشن رپورٹ طارق بٹ نے یہ ساری رپورٹ اخبار میں شائع کر دی۔

یہ رمضان کا آخری روزہ تھا۔ ڈار صاحب ابھی افطاری سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ آپریٹر نے انہیں بتایا کہ ان کے لیے جدہ سے ٹیلی فون کال ہے۔ فون پر دوسری طرف نواز شریف تھے۔ نواز شریف نے جنرل محمود کے خلاف سخت الفاظ استعمال کیے اور ڈار صاحب کو بتایا کہ اس پنجابی جرنیل نے ان کے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔ ڈار نے بھی نواز شریف کی ہاں میں ہاں ملائی۔

اسحاق ڈار کو پتہ نہیں تھا کہ ان کی ٹیلی فون پر ہونے والی ساری گفتگو ریکارڈ کی جا رہی تھی۔ نواز شریف کی اس کال کا یہ نتیجہ نکلا کہ انہیں اس رات رہا کرنے کے بجائے مزید آٹھ مہینے تک گھر پر قید رکھا گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ جنرل محمود کو نواز شریف اور اسحاق ڈار کے درمیان ہونے والی اس گفتگو کا ٹرانسکرپٹ پیش کیا گیا تھا۔ ڈار کے خیال میں ان کے ساتھ ہونے والی تمام زیادتیوں کے ذمہ دار جنرل محمود تھے ورنہ انہیں جنرل امجد کے ساتھ 20 اپریل کو ہونے والی میٹنگ کے بعد رہا کیا جا رہا تھا۔

اپنی رہائی کے بعد اسحاق ڈار نے جو پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے ٹیلی فون اٹھایا اور جنرل امجد کو فون کیا جو اس وقت نیب سے ہٹا کر کور کمانڈر ملتان لگا دیے گئے تھے۔ اسحاق ڈار نے انہیں سخت لہجے میں بتایا کہ قیامت والے دن خدا کے سامنے ان کا گریبان پکڑ کر ضرور انصاف مانگیں گے کیونکہ 20 اپریل کے بعد ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کے وہ ذمہ دار تھے۔ جنرل امجد یہ بات سن کر تھوڑے سے نرم ہوئے۔ انہوں نے اسحاق ڈار کو ملتان آنے کی دعوت اور ساتھ یہ بھی کہا کہ 20 اپریل کے بعد ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے وہ ذمہ دار نہیں تھے۔

جب اسحاق ڈار قید میں تھے تو انہیں کچھ سینئر ملٹری آفیسروں نے یہ مشورے دیے تھے کہ وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ ڈار صاحب کا خیال تھا کہ جنرل محمود ان کے اور چوہدری نثار کے خلاف دل میں کوئی ذاتی بغض رکھتے ہیں اس لیے ان دونوں کی رہائی نہ ہونے میں ان کا اہم کردار تھا۔

مجھے پتہ تھا کہ اسحاق ڈار کے بیٹے کی منگنی نواز شریف کی بیٹی سے تازہ تازہ ہوئی تھی لہٰذا اگر کوئی شخص میاں صاحبان کے قریب ہونے کا دعویٰ کر سکتا تھا تو وہ ڈار صاحب تھے۔ لہٰذا اندر کی باتیں یقیناً انہیں پتہ ہوں گی۔

میں نے کہا کہ ڈار صاحب! آخر نواز شریف اور جنرل مشرف کے درمیان یہ ڈیل کیسے اور کیونکر ہوئی تھی کہ وہ پاکستان چھوڑ کر چلے گئے۔

ڈار صاحب نے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا اور پھر رازوں پر سے پردہ اٹھانا شروع کیا۔

سعودی کراؤن پرنس عبداللہ نواز شریف کو پسند کرتے تھے اور ان کی رہائی کے لیے کوششیں کر رہے تھے۔ شاہ عبداللہ کی نواز شریف کے لیے پسندیدگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ریاض

میں ہونے والی ایک میٹنگ کے دوران کراؤن پرنس نے نواز شریف کو اپنا بھائی کہہ کر بلایا تھا۔ دوسرے سعودی عرب خصوصاً اور باقی مسلم دنیا عموماً ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی سے نہ بچانے پر اپنے آپ کو آج بھی مجرم سمجھتی ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ نواز شریف کا انجام بھی بھٹو کی طرح ہو۔ سعودی عرب نے پہلے قطر کے وزیر خارجہ سے کہا کہ وہ جنرل مشرف کی فوجی حکومت سے رابطہ کریں اور نواز شریف کی رہائی کے لیے مذاکرات شروع کریں۔ قطر کے وزیر خارجہ نے سعودی عرب کو بتایا کہ جنرل مشرف کی حکومت نواز شریف کو رہا کرنے پر تیار نہیں تھی۔ شاہ عبداللہ نے ہمت نہیں ہاری۔ انہوں نے لبنان کے وزیراعظم رفیق حریری سے بات کی اور ساتھ میں اپنے بیٹوں کو ان کے ساتھ لگایا کہ وہ پاکستان کی فوجی حکومت سے کوئی ڈیل طے کریں۔ تاہم، بات پھر بھی نہیں بن رہی تھی۔ جب سعودی قیادت نے یہ دیکھا کہ جنرل مشرف کسی والے سے بھی کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہیں تو آخر ایک دھمکی اسلام آباد کو بھیجی گئی کہ آج کے بعد وہ ادھار کی صورت میں دیا جانے والا تیل بند کر دیا جائے گا اگر انہوں نے نواز شریف کو رہا نہ کیا۔

جو کام قطر کا وزیر خارجہ، لبنان کا وزیراعظم اور سعودی شاہ کے اپنے بیٹے بھی نہیں کر سکے تھے وہ ادھار کی اس دھمکی نے کر دکھایا۔

ان مذاکرات میں پہلی کامیابی اس وقت ہوئی جب جنرل مشرف نے سعودیوں سے کہا کہ وہ شریف فیملی کے چاروں افراد سے یہ کہیں کہ وہ ملک سے اپنا میڈیکل علاج کرانے کے لیے جانا چاہتے ہیں۔ یوں اس درخواست پر نواز شریف اور ان کی فیملی کو میڈیکل گراؤنڈز پر ملک سے باہر بھیجا گیا۔

برسوں بعد جب اسحاق ڈار نواز شریف سے جدہ میں ملے تو نواز شریف نے انہیں بتایا کہ انہوں نے جنرل مشرف سے کوئی براہ راست ڈیل نہیں کی تھی۔ جنرل مشرف ابھی بھی سعودی حکمرانوں سے یہ درخواست کرتے رہتے تھے کہ وہ شریف فیملی کو سعودی عرب سے کہیں نہ جانے دیں۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستانی ایمبیسی کو بھی منع کر دیا گیا تھا کہ وہ شریف فیملی کے لوگوں کے پاسپورٹ کی تجدید نہ کریں تاکہ وہ وہاں سے باہر نہ جاسکیں۔

ڈار صاحب کے بقول سعودی حکمرانوں نے پہلے دن ہی پاکستان کی فوجی قیادت کو ایک بڑا سخت پیغام بھیجا تھا کہ نواز شریف کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ ڈار صاحب نے دعویٰ کیا کہ یہ ساری ڈیل سعودیوں نے جنرل مشرف سے خود طے کی تھی۔ نواز شریف اس پوزیشن میں ہرگز نہیں تھے کہ وہ جیلوں

میں تو اپنے دیگر ساتھیوں کو اس ڈیل میں شامل کرا کے اپنے ساتھ لے جانے ... نواز شریف ان سب کو اپنے ساتھ لے کر سعودی عرب کیوں نہیں گئے تھے۔ اس کا جواز بہت کم بنتا ہے۔

میں نے ڈار صاحب سے پوچھا کیا کبھی انہوں نے نواز شریف سے جنرل مشرف کے ساتھ ہونے والی اس ڈیل پر کوئی سیر حاصل گفتگو کی تھی۔ وہ بولے کہ ہاں ان کی نواز اور شہباز دونوں سے اس بارے میں بات ہوئی تھی۔ دونوں کا یہی خیال تھا کہ فوجی حکومت نے سب سے زیادہ ٹارگٹ انہیں کیا تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اگر وہ اس ملک سے چلے جائیں تو ممکن ہے کہ جیلوں میں بند ان کے دوسرے ساتھیوں کو بھی رہائی مل جائے۔

میں نے ڈار صاحب سے پوچھا کہ ان کے بیٹے کی نواز شریف کی بیٹی سے منگنی کیسے ہوئی تھی۔

وہ بولے کہ اگست 2003 میں دونوں خاندانوں کے بڑوں نے یہ فیصلہ کیا تھا۔

میں نے کہا کہ ڈار صاحب! آپ کے خیال میں نواز شریف حکومت کی سب سے بڑی غلطی کیا تھی جس کی وجہ سے اس ملک میں 12 اکتوبر کا مارشل لاء لگا۔ وہ بولے کہ سب سے بڑی غلطی تو یہ تھی کہ فوری طور پر ... کرنا چاہیے تھا۔ دوسرے احتساب کے نام پر جاری مہم نے تو انصاف پر بھی ... خلاف تھی۔ نواز شریف حکومت کو سب کا احتساب کرنا چاہیے تھا۔

میں نے اسحاق ڈار صاحب سے آخری سوال پوچھا کہ ان کی زندگی میں سب سے بڑا نقصان کیا ہوا تھا۔ وہ بولے کہ جو حشر میرے خاندان کے ساتھ وردی میں ملبوس لوگوں نے کیا تھا اس کے بعد سب سے زیادہ شدید صدمہ ہوا تھا۔ اب میرے بچے اس ملک میں ایک غیر جمہوری ماحول میں رہنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ میری زندگی کا یہ سب سے بڑا نقصان تھا۔

فیصل صالح حیات

فیصل صالح حیات سے میری پہلی ملاقات 2002ء کے انتخابات کے بعد میر ظفر اللہ جمالی کی حکومت بننے کے بعد ہوئی تھی۔ جس میں وہ پیپلز پارٹی کو تین دہائیوں کے بعد چھوڑ کر جنرل مشرف کے ساتھ مل گئے تھے۔ اس وقت وہ جنرل مشرف کی حکومت کے وزیر داخلہ تھے۔

میری ان سے ملاقات پارلیمنٹ کے کیفے ٹیریا میں ہوئی تھی جہاں وہ بہت سارے صحافیوں میں گھرے بیٹھے ان کے تیز و تند سوالات کے جواب دے رہے تھے۔ وہ پیپلز پارٹی کو توڑ کر بنائے گئے پیٹریاٹ گروپ کے خلاف میری خبروں سے بڑے نالاں تھے۔ مجھے ان کی ناراضگی کا پتہ جنگ گروپ کے مالک میر شکیل الرحمن صاحب کے مجھے کیے گئے ٹیلی فونز سے چلتا رہتا تھا۔ میر صاحب نے دو تین دفعہ یہ بات کہی تھی کہ فیصل صالح حیات میری رپورٹنگ کی وجہ سے مجھ سے ناراض ہیں۔

جب میں نے فیصل صالح حیات کو پارلیمنٹ کے کیفے ٹیریا میں دیکھا تو سوچا کہ جا کر ان سے ملتا ہوں اور ان کا نقطہ نظر جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں خوشگوار موڈ کے ساتھ ان کی میز پر گیا۔ وہ مجھے شکل سے نہیں پہچانتے تھے۔ میں نے ان سے اپنا تعارف کرایا۔ انہوں نے مجھے کوئی خاص اہمیت نہیں دی جس سے مجھے تھوڑا سا جھٹکا لگا کہ کیا وہ واقعی مجھے نہیں جانتے تھے یا جان بوجھ کر نظر انداز کر رہے تھے بلکہ ان کے خیال میں جو وزیر جنگ گروپ کے مالک میر شکیل الرحمن کو براہ راست فون کر کے اس کے

رپورٹر کے خلاف شکایت کر سکتا ہوں، بھلا ایک رپورٹر سے وقت لگانے کی کیا ضرورت تھی۔

میں نے ان دنوں پی پی کی سیاسی رپورٹنگ شروع کی تھی اور ضرورت سے زیادہ ہی جوش تھا۔ میں بھی شاید دوسرے رپورٹرز کی طرح یہ یقین کر بیٹھا تھا جنہیں تازہ تازہ شناخت ملنا شروع ہوتی ہے اور وہ ضرورت سے زیادہ اپنے آپ کو کوئی چیز سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ ہر جگہ اونچی آواز میں سوال کرتے اور تکرار کرنا اپنا بنیادی فرض سمجھتے ہیں اور یہ تصور کر لیتے ہیں کہ شاید اس سے انہیں بڑا رپورٹر مان لیا جائے گا۔ میں نے بھی وہی وقت کیا اور فیصل صالح حیات سے کسی بات پر تکرار شروع کر دی جس سے میرے اور ان کے درمیان تھوڑی سی تلخی پیدا ہو گئی۔

فیصل نے تلخ کلامی کا سلسلہ ختم کرتے ہوئے مجھے کہا کہ آپ اب تک ہمارے سیاسی گروپ کے خلاف خبریں اور صرف ہمارے خلاف خبریں شائع کر رہے ہو۔ بہتر ہو گا کسی وقت میرے پاس آ کر مجھ سے ہماری پالیسی سمجھو اور اس کے بعد جو مرضی چاہے لکھو۔

میں نے فیصل صالح حیات کی اس بات سے اتفاق کیا کہ ایک رپورٹر کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر گروپ سے ملے اور ان کی سوچ سے آگاہ ہو تاکہ جب وہ لکھنے کے لیے بیٹھے تو اس کے ذہن میں ایک بہتر تصویر ہونی چاہیے۔

کچھ دنوں بعد میں نے فیصل صالح حیات کو فون کیا۔ ان سے وقت لے کر گیا۔ انہوں نے مجھے دوسرے دن صبح اپنی وزارت داخلہ کے دفتر میں بلا لیا۔

ان کے دفتر میں بیٹھ کر میں نے دیوار پر لگے ایک بورڈ پر لکھے وہ نام پڑھنے شروع کیے جو اس سے پہلے اس وزارت کے وزیر رہ چکے تھے۔ فیصل صالح حیات کا نمبر 33 تھا۔ ان سے پہلے سکندر مرزا، ملک فیروز خان نون، ذوالفقار علی بھٹو، جنرل ضیاء کے پاس بھی وزارت داخلہ کا چارج رہا تھا۔

میں نے نام پڑھنے کے بعد فیصل صالح حیات سے کہا کہ اتنے بڑے بڑے لوگوں کے پاس وزارت داخلہ رہی ہے اور آج وہ اس کرسی پر بیٹھے ہیں تو انہیں کیا محسوس ہوتا ہے۔

فیصل صالح حیات نے انگلی کے اشارے سے مجھے کہا کہ یہ نمبر 16 پر لکھا ہوا نام پڑھو۔

میں نے وہ نام پڑھا جو ذوالفقار علی بھٹو کا تھا۔

فیصل صالح حیات نے باقی 32 ناموں کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھے کہا کہ مجھے اس بات پر بڑا فخر محسوس ہوتا ہے کہ کبھی اس وزارت کو میرا لیڈر ذوالفقار علی بھٹو چلا رہا تھا۔

ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے فیصل سے پوچھا کہ وہ سیاست میں کیسے داخل ہوئے۔ ان کا جواب سن کر مجھے حیرانی ہوئی کہ کبھی وہ لاہور میں اسلامی جمعیت طلباء کے رکن تھے۔ جلد ہی فیصل صالح حیات کو محسوس ہوا کہ وہ اس مذہبی جماعت کے سخت ماحول میں سیاست نہیں کر سکتے۔ انہوں نے طالب علموں کے ایک انقلابی گروپ نیشنل سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کو جائن کر لیا جس کے خیالات اور فلاسفی ان کے اپنے مذہبی اور فیوڈل بیک گراؤنڈ سے ہرگز نہیں ملتے تھے۔

وہاں سے فارغ ہوئے تو 1977ء میں فیصل صالح حیات نے پیپلز پارٹی جائن کر لی۔ پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن جیتا لیکن انہیں پارلیمنٹ میں بیٹھنے کے لیے دس سال انتظار کرنا پڑا کیونکہ جنرل ضیاء نے اس ملک پر مارشل لاء لگا دیا تھا۔

نصرت بھٹو فیصل صالح حیات کو بہت پسند کرتی تھیں کیونکہ وہ مرتضیٰ بھٹو کے کلاس فیلو تھے۔ فیصل کے انکل خالد خان کھرل کمشنر لاڑکانہ تھے اور وہ بھٹو صاحب کے ایک طرح سے فیملی فرینڈ تھے۔ یوں فیصل بھٹو فیملی کے بہت قریب تھے۔

فیصل صالح حیات کے لیے نصرت بھٹو کی پسندیدگی کی وجہ سے ان کا گھر میں آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ بیگم بھٹو ایک زبردست شخصیت کی مالک تھیں اور دل کی بہت اچھی تھیں۔ بینظیر بھٹو اور فیصل صالح حیات ایک دوسرے کے ہم عمر تھے لہٰذا ان کی بہت جلد ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی ہو گئی۔ ان دونوں نے اپنا سیاسی کیریئر بھی ایک ہی پارٹی سے اس وقت شروع کیا تھا جب پارٹی اپنی تاریخ کے بدترین دور سے گزر رہی تھی۔ ان دونوں نے ایک ساتھ سیاست سیکھی خصوصاً جب جنرل ضیاء الحق بندوق کی طاقت پر اس ملک پر حکومت کر رہے تھے۔ دونوں خاندانوں کے سیاسی تعلقات بہت جلد خاندانی تعلقات میں داخل ہو گئے۔ بھٹو صاحب بھی فیصل کو پسند کرتے تھے۔ ان دونوں خاندانوں کے درمیان جاری یہ تعلقات اٹھائیس سال بعد اس وقت ختم ہوئے جب فیصل صالح حیات نے 2002ء کے انتخابات کے بعد بینظیر بھٹو کے خلاف یہ کہہ کر بغاوت کی کہ وہ چھوٹے موٹے مفادات کے لیے اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھوں میں کھیل رہی تھیں۔ فیصل کے خیال میں ان کے اور بی بی کے درمیان جو چیز مشترک تھی وہ جنرل ضیاء کے خلاف جدوجہد اور جمہوریت کی بحالی تھی۔

ایک بات میں نے محسوس کی کہ بینظیر بھٹو کو چھوڑنے کے بعد بھی فیصل کے دل میں ابھی بھی ان کے لیے بے پناہ احترام موجود تھا۔ ان کے خیال میں بینظیر بھٹو ایک شاندار انسان اور لیڈر تھیں۔ ایک ایسی خاتون جو بے پناہ خوبیوں کی مالک تھی۔ تاہم فیصل کے خیال میں بینظیر بھٹو کی سیاست کو سمجھنے کے لیے ضروری تھا کہ ہم 1988ء سے پہلے کی بینظیر بھٹو اور اس کے بعد کی بینظیر کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے دیکھیں۔ جس سے یہ سمجھنے میں مدد ملے گی کہ کیسے ایک بہادر بینظیر بھٹو میں اتنی واضح تبدیلیاں آ گئی تھیں کہ وہ ایک دن اسٹیبلشمنٹ کے آگے جھک گئیں۔

بینظیر بھٹو یہ بات بھول گئی تھیں کہ لوگ پیپلز پارٹی سے اس لیے پیار کرتے تھے کہ یہ اینٹی اسٹیبلشمنٹ پارٹی تھی۔ یہ ایک ایسی پارٹی تھی جو اپنی اپروچ میں لبرل سیکولر اور ماڈرن تھی اور پاکستان کے لیے ایک جدید جمہوری معاشرے کی خواہاں تھی۔ ان اصولوں کے خواب حاصل کرنے کے رومانس میں پیپلز پارٹی کے ورکرز نے اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھوں بے پناہ اذیتیں برداشت کیں لیکن اسٹیبلشمنٹ نے بینظیر بھٹو پر اتنا پریشر ڈالا کہ وہ ان کے ساتھ کمپرومائز کرنے پر تیار ہو گئیں اور یوں ان لوگوں کی آنکھوں میں خواب مرجھا گئے جنھوں نے ان کی تکمیل کے لیے ایک لمبی جنگ لڑی تھی۔

فیصل نے کہا کہ وہ یہ بات مانتے ہیں کہ سیاست میں کمپرومائز کرنا پڑتے ہیں لیکن ایک اچھے سیاستدان کو ایک سیاسی کمپرومائز اور اندھا دھند کمپرومائز میں ایک لکیر کھینچنی پڑتی ہے۔ ہم سیاست میں ساری عمر ہمیشہ ان دونوں کمپرومائزز کے درمیان بیلنس کرتے رہتے ہیں۔ لیڈرز کو کبھی اپنے بنیادی اصولوں اور پالیسیوں پر کمپرومائز نہیں کرنا چاہیے۔ فیصل کے بقول پیپلز پارٹی کو 1988ء میں حکومت نہیں بنانی چاہیے تھی اور یہ بہت بڑی غلطی تھی کیونکہ پیپلز پارٹی نے پہلی دفعہ اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ بہت بڑا کمپرومائز کیا تھا۔ جمہوریت کے لیے اتنے برس قربانی دینے کے بعد اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ اتنا اندھا کمپرومائز پارٹی کو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اتنے بڑے کمپرومائز کے بدلے میں پیپلز پارٹی کو کچھ بھی نہیں ملا۔ اس وقت کی انتظامیہ نے پیپلز پارٹی کو فری ہینڈ نہیں دیا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے حکومت چلا سکتی۔ پیپلز پارٹی حکومت ہر وقت یہ بات ثابت کرنے میں لگی رہی کہ وہ اینٹی اسٹیبلشمنٹ پارٹی نہیں ہے اور اسی چکر میں وہ اپنے خواب، ویژن اور کمٹمنٹ کھو بیٹھی۔ فیصل نے مجھ سے پوچھا کہ آپ مجھے بتائیں کہ اگر پارٹی قیادت خود ہی اس طرح کے کمپرومائز کر کے ایک مثال قائم کرے گی تو پھر آپ اس پارٹی کے ورکروں سے کیا توقع کرتے ہیں کہ وہ اصولوں کی سیاست کریں گے۔

فیصل کے بقول بھٹو ازم اور پارٹی کی نظریاتی بنیادیں اسی دن ہی دفن ہو گئی تھیں جس دن 1988ء میں بینظیر بھٹو نے اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ کمپرومائز کیا تھا۔ اس کمپرومائز سے سارے پارٹی لیڈروں کو یہ پیغام بھیجا گیا کہ پارٹی اب اقتدار میں پہنچنے کے لیے رومانوی سیاست کے بجائے عملی سیاست کرے گی۔ اگرچہ تمام سیاستدانوں کا آخری مقصد اقتدار میں پہنچنا ہوتا ہے لیکن یہ مقصد اگر سیاسی عمل سے حاصل کیا جائے تو بہتر ہے نہ کہ اپنی پارٹی کی کلاسکی کو ختم کر کے جیسا کہ بینظیر بھٹو اور ان کی پارٹی نے کیا تھا۔ جس دن بینظیر بھٹو نے یہ کمپرومائز کیا اسی دن ہی پیپلز پارٹی کا امیج ایک پروگریسو اور لوگوں کی جماعت کے طور پر ختم ہو گیا تھا۔ 1977ء سے لے کر 88ء تک پیپلز پارٹی نے اینٹی اسٹیبلشمنٹ سیاست کی لیکن راتوں رات اس پارٹی نے اتنا بڑا یوٹرن لیا کہ لوگ حیران ہو کر رہ گئے۔ جب آپ نے ایک دفعہ کمپرومائز کر لیا تو پھر اس کے بعد ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا اور پھر چل سو چل۔

فیصل نے دعویٰ کیا کہ وہ ان چند سیاسی ورکروں میں سے ایک تھے جو بینظیر بھٹو کو 1986ء میں پاکستان واپس لائے تھے۔ انہیں اس بات کا اچھی طرح پتہ تھا کہ پیپلز پارٹی نے 1988ء میں کسی کو مجبور کر کے الیکشن نہیں کرائے تھے۔

فیصل کے خیال میں بینظیر بھٹو نے نوابزادہ نصراللہ خان کے مقابلے میں غلام اسحاق خان کی مدد کر کے دراصل ایم آر ڈی کی تحریک کو دھوکہ دیا تھا جس نے جنرل ضیاء کے مارشل لاء کے خلاف بڑی لمبی جدوجہد کی تھی۔ وہ لوگ جو اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ اس طرح کی اندھی ڈیل کے خلاف تھے انہیں بینظیر بھٹو نے ایک ایک کر کے سائیڈ لائن کر دیا۔ بینظیر بھٹو کے نزدیک اب سیاسی اصولوں کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی کیونکہ 1993ء میں انہوں نے اس غلام اسحاق خان کی مدد کی تھی جس نے 1990ء میں ان کی حکومت کو کرپشن چارجز پر ڈس مس کیا اور ان کی پارٹی کے لیڈروں پر مقدمات بنائے تھے۔ بینظیر بھٹو اس غلام اسحاق خان کے ہاتھوں میں کھیل رہی تھیں جو نواز شریف کو گھر بھیجنا چاہتے تھے۔

فیصل نے اس بات پر دکھ کا اظہار کیا کہ ایک اینٹی اسٹیبلشمنٹ پارٹی آخر میں محلاتی سازشوں کا حصہ بن کر رہ گئی۔

کی پروا کیے بغیر ایک سیاسی حکومت کے خاتمے پر ایک جنرل کو خوش آمدید کہتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

فیصل نے کہا کہ باقی باتیں چھوڑیں۔ انہیں تو اس بات کا بھی پتہ ہے کہ محترمہ 12 اکتوبر 1999 سے پہلے ہی جنرل مشرف کے ساتھ ڈیل کرنا چاہ رہی تھیں۔ یہ تو جنرل مشرف تھے جنہوں نے بینظیر کے ساتھ ڈیل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

فیصل نے کہا کہ اگر وہ نیب کے مقدمات کا سامنا کر سکتے تھے تو بینظیر بھٹو کیوں نہیں۔ سپریم کورٹ آف پاکستان نے ان کے بینک ان کیس میں ان کی ضمانت منظور کی تھی اور وہ وزیر ہوتے ہوئے بھی ابھی تک عدالت میں قانونی جنگ لڑ رہے تھے۔

فیصل نے الٹا مجھ سے پوچھا کہ آپ ہی مجھے بتائیں کہ بینظیر بھٹو اس ملک میں رہ کر اپنے خلاف قائم کیے گئے مقدمات کا سامنا کیوں نہیں کر سکتی تھیں۔ فیصل نے کہا کہ جنرل مشرف کے تین سالہ فوجی دور میں انہوں نے تکلیفیں اور مصیبتیں دیکھیں مگر انہوں نے اس کی کوئی شکایت نہیں کی کیونکہ ان کی اپنی پارٹی کے ساتھ کمٹمنٹ تھی۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی سیاسی پارٹی نے تحریک چلا کر جنرل مشرف سے انتخابات نہیں کروائے تھے۔ کسی سیاسی پارٹی کے پاس کوئی سٹریٹ پاور نہیں تھی۔ آپ باقی باتیں چھوڑیں۔ 11/9 کے بعد افغانستان پر امریکہ کے حملے کے بعد بھی جماعت اسلامی چند ہزار سے زیادہ لوگ سڑکوں پر نہیں لا سکی۔ جنرل مشرف نے نئے انتخابات کرانے کا قوم سے وعدہ کیا تھا جو اس نے پورا کیا۔ اس قوم نے جنرل ضیاء الحق کا کیا کر لیا تھا جب اس نے 90 دن میں انتخابات کا وعدہ کر کے 11 سال تک وردی پہن کر اس ملک پر حکومت کی۔

میں ابھی تک نہیں جان سکا تھا کہ آخر فیصل صالح حیات کو کس بات نے مجبور کیا تھا کہ وہ بینظیر بھٹو کا ساتھ چھوڑ کر جنرل مشرف کے ساتھ مل جائیں۔ فیصل صالح حیات کا بینظیر بھٹو کو چھوڑنے کا فیصلہ کوئی عام بات نہیں تھی۔ فیصل اس پارٹی کے لیے کئی سالوں تک شاہی قلعے کی اذیتیں بھگت چکے تھے۔ آخر کچھ تو ہوا ہوگا جس کی وجہ سے فیصل جیسا بندہ بھی اب بینظیر بھٹو سے مایوس ہو کر ایک آمر کی حکومت میں وزیر بننے پر تیار ہو گیا تھا۔

جب اکتوبر 2002ء میں اس ملک میں انتخابات ہوئے تو بینظیر بھٹو نے پارٹی کے لیڈروں کو

ڈسکس کرنے کے لیے دعوت پر بلایا۔ فیصل نے محترمہ کو بڑے واضح طور پر یہ بات بتائی کہ وہ اپنے تمام سیاسی کیریئر میں اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ کمپرومائز اور ڈیل کرتی آئی تھیں۔ ایک دفعہ اسی طرح کی صورت حال پھر پیدا ہو رہی تھی۔ اسٹیبلشمنٹ بینظیر بھٹو کو سب کچھ دینے کو تیار تھی لیکن اس کے بدلے میں وہ یہ چاہتی تھی کہ بینظیر بھٹو ملک سے باہر رہیں۔ فیصل نے محترمہ کو بتایا کہ پیپلز پارٹی اس پوزیشن میں ہے کہ وہ حکومت بنا سکے اور اس کو ہر حال میں حکومت بنانی چاہیے۔ فیصل نے بی بی سے پوچھا کہ ماضی میں بھی تو وہ بہت سارے ایسے سیاسی گروپوں کے ساتھ مل کر حکومت بناتی رہی ہیں جو انہیں پسند نہیں تھے تو اب کی بار اس میں کیا حرج ہے۔ فیصل کے خیال میں پیپلز پارٹی اور بینظیر بھٹو کے اصل سیاسی دشمن نواز شریف تھے نہ کہ پی ایم ایل کیو۔ فیصل نے بینظیر بھٹو کو وہ تمام نام گنوائے جو نواز شریف کے دور میں جیلوں میں بھیجے گئے۔ یوسف رضا گیلانی، مشتاق اعوان، آصف زرداری ان میں نمایاں تھے۔ یہ نواز شریف ہی تھے جنہوں نے پیپلز پارٹی کو دھوکہ دیا۔ 2 دسمبر 2000ء کو اے آر ڈی کے نام سے بینظیر بھٹو کے ساتھ ایک سیاسی اتحاد بنایا اور ٹھیک آٹھ دنوں بعد جنرل مشرف کے ساتھ ایک خفیہ ڈیل کر کے ملک سے چلے گئے۔ نواز شریف نے بڑی سمجھداری سے پیپلز پارٹی کی سیاسی طاقت کو جنرل مشرف کے ساتھ ڈیل کرنے کے لیے استعمال کیا۔

یہی وجہ تھی کہ فیصل چاہتے تھے کہ پی ایم ایل کیو کے ساتھ ڈیل کرنے میں بہت بڑا فائدہ تھا کیونکہ پی ایم ایل کیو کو کسی نظریے کی بنیاد پر تشکیل نہیں دی گئی تھی۔ اس پارٹی میں وہ لوگ شامل تھے جو اپنی سیٹیں جیت سکتے تھے اور انہیں طاقتور حلقوں نے ایک پارٹی میں اکٹھا کر دیا تھا۔ پیپلز پارٹی بڑے آرام سے اس کھچڑی حکومت میں اپنی مرضی سے حکومت کر سکتی تھی۔

فیصل نے بی بی سے پوچھا کہ وہ بتائیں کہ ٹکراؤ کی سیاست کر کے انہوں نے کیا حاصل کر لیا ہے۔ وہ ایک ڈیل کر کے بڑی آسانی سے پاکستان واپس آ سکتی ہیں۔ اس کے کچھ عرصے بعد وہ اپنے کیسز کو بھی عدالتوں سے سیٹل کرا سکتی ہیں جب ان کی اپنی پارٹی اقتدار میں ہوگی۔

فیصل کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ 1988ء میں بینظیر بھٹو نے اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ ٹکراؤ کی سیاست سے گریز کیا تھا لیکن اب وہ جنرل مشرف سے ٹکراؤ کرنے کے موڈ میں تھیں۔ 1988ء میں محترمہ نے ایک بار پاور پالیٹکس کے نظریے پر چلتے ہوئے اقتدار حاصل کیا تھا۔ وہ آنے والے برسوں میں بھی پاور

محسوس ہوا تھا۔

فیصل نے کہا کہ میں نے بینظیر بھٹو کو واضح طور پر یہ بات کہی تھی کہ میں آپ کی قیادت کو تو تسلیم کرنے کو تیار ہوں لیکن آپ کے ذاتی سٹاف کی قیادت کو نہیں۔

فیصل نے بڑے واضح انداز میں محترمہ کو بتایا تھا کہ آپ ان لوگوں کو پارٹی لیڈروں پر حاوی نہ ہونے دیں جن کا پارٹی کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جن کی پارٹی کے لیے کوئی کنٹری بیوشن نہیں۔ بینظیر بھٹو کے اس ذاتی سٹاف سے سب لوگ نفرت کرتے تھے کیونکہ انہوں نے پارٹی کو یرغمال بنایا ہوا تھا۔

میں نے فیصل سے کہا کہ انہوں نے ابھی تک مجھے یہ نہیں بتایا کہ وہ پارٹی کیوں چھوڑی جس کے لیے وہ شاہی قلعہ کی دیواروں سے سر ٹکراتے رہے تھے۔

فیصل نے ایک نئی کہانی سنائی۔

پیپلز پارٹی میں بیک وقت دو کام چل رہے تھے۔ ایک طرف پارٹی اصولوں کی بات کر رہی تھی اور میڈیا اور عوام کو یہ تاثر دیا جا رہا تھا کہ اس پارٹی سے بڑا اور کوئی مخلص اصول پسند نہیں تھا جبکہ دوسری طرف امین فہیم کو بینظیر بھٹو نے یہ ٹاسک دیا ہوا تھا کہ وہ جنرل مشرف سے ڈیل کریں۔ مولویوں پر مشتمل متحدہ مجلس عمل کے لیڈروں سے بھی بات چیت جاری تھی۔

فیصل نے کہا کہ وہ پانچ دفعہ ایم این اے کا الیکشن جیت کر آئے تھے اور ان کی وفاداری اور محنت کا سب کو علم تھا۔ لیکن جب جونیئر لوگوں کو ان کا باس بنایا گیا جنہیں پارٹی آفیئرز کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا تو ان کے دل میں پہلی دفعہ دراڑ پڑنا شروع ہو گئی تھی۔ ان کے دل میں بڑی دراڑ اس وقت پڑی جب امین فہیم کو بینظیر بھٹو نے یہ پیغام بھیجا کہ انہوں نے جنرل مشرف کے خلاف ایک سخت لائن لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ جب پارٹی کے گروپ نے ان سے یہ بات منوائی کہ جنرل مشرف پیپلز پارٹی کے بغیر اسلام آباد میں نئی سیاسی حکومت نہیں قائم کر سکتے تو فیصل صالح حیات نے فوراً یہ بھانپ لیا کہ اب اس ملک کا سیاسی نظام ڈوبنے والا ہے۔ وہ فوری طور پر اپنے چند دوستوں سے ملے اور انہوں نے پارٹی کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ فیصل اور ان کے دوست اس وجہ سے دوبارہ گھر نہیں جانا چاہتے تھے کیونکہ پیپلز پارٹی میں موجود کچھ لوگ انہیں اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ فیصل اور ان کے

ساتھیوں نے ڈوبتی جمہوریت کو بچانے کے نام پر ایک وردی والے ڈکٹیٹر کی جمہوریت کو ایک شخص کی آمریت پر ترجیح دیتے ہوئے اپنا ایک گروپ بنانے کا فیصلہ کیا۔

میں نے فیصل سے کہا کہ سیکرٹ ایجنسیوں نے پیپلز پارٹی کو توڑنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

فیصل نے بڑی سختی سے میری اس بات کی تردید کی کہ ان پر پریشر ڈال کر ان کی سیاسی وفاداریاں تبدیل کرائی گئی تھیں۔ ان کے بارے میں سب کو علم تھا کہ وہ ایسے سیاستدان نہیں تھے جن پر دباؤ ڈال کر اپنی مرضی کا کوئی کام کرایا جا سکتا تھا۔ وہ ماضی میں کئی دفعہ فوجی آمروں کے خلاف لڑتے ہوئے جیل جا چکے تھے۔ وہ تمام لوگ جنہوں نے پیپلز پارٹی چھوڑی تھی ان کے کردار اور محنت کے بارے میں سب لوگوں کو اچھی طرح علم تھا۔ فیصل تو یہاں تک بھی کہہ گئے کہ جنرل مشرف کے ساتھ پیپلز پارٹی کے سارے لیڈر ڈیل کرنے کے لیے پر تول رہے تھے لیکن ہم نے ڈیل اس لیے کی کہ ہم ایک کمزور سیاسی نظام کو چلتا دیکھنا چاہتے تھے۔

میں نے فیصل سے پوچھا کہ ان کی جنرل مشرف سے پہلی ملاقات کب ہوئی تھی تو وہ بولے کہ جب انہوں نے میریٹ ہوٹل میں اپنا ایک نیا سیاسی گروپ بنانے کا اعلان کیا تو وہ جنرل مشرف سے ملنے گئے اور انہیں اپنی حمایت کا یقین دلایا۔

فیصل نے اس بات کو تسلیم کیا کہ وہ ایک باوردی صدر کے حق میں نہیں تھے لیکن اس وقت ملک کی صورتحال کچھ ایسی تھی کہ اس وقت ایک باوردی صدر کا ہونا ضروری تھا۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے فیصل نے کہا کہ وہ جنرل مشرف سے ملنے والے پیپلز پارٹی کے پہلے لیڈر نہیں تھے جو پرویز مشرف سے اس لیے ملاقاتیں کرتے تھے تاکہ نواز شریف حکومت کو گرایا جائے۔ پیپلز پارٹی کے ہی لیڈر جنرل وحید کاکڑ اور جنرل آصف نواز سے بھی ملتے تھے تاکہ نواز شریف حکومت ختم کرائی جا سکے۔ پیپلز پارٹی کے یہ لیڈران تو جنرل جہانگیر کرامت سے بھی ملنے کے لیے آرمی ہاؤس جاتے تھے۔

فیصل نے بتایا کہ پیپلز پارٹی اب منافقوں کی ایک جماعت بن چکی تھی۔ بینظیر بھٹو نے انتخابات سے پہلے جنرل مشرف سے ڈیل کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت کسی کو ایل ایف او کا کوئی خیال نہیں تھا۔ اب جب ان کی ڈیل نہیں ہو سکی تو یہ پارلیمنٹ میں جمہوریت کے بہت بڑے چیمپئن بن کر ابھرے ہیں۔ باقی باتیں چھوڑیں۔ اب متحدہ مجلس عمل کو دیکھ لیں۔ اس کے وزیر اعلیٰ نے ایل ایف او

کے تحت حلف اٹھایا ہوا ہے۔ صوبوں میں تو پی ایم ایل کیو کے ساتھ اقتدار شیئر کیا ہوا ہے اور وہاں انہیں ایل ایف او پر کوئی اعتراض نہیں ہے جبکہ اسلام آباد اور قومی اسمبلی میں انہوں نے آسمان سر پر اٹھایا ہوا ہے۔

فیصل نے کہا کہ اگر محترمہ اتنی ہی اصولی لیڈر تھیں تو پھر انہوں نے پی پی پی کے آگے ایک اور پی کیوں لگوایا اور یوں اپنی پارٹی کو انتخابات سے پہلے الیکشن کمیشن میں اس کا نام بدل کرا کے رجسٹر کرایا۔

فیصل نے جب یہی بات بینظیر بھٹو سے پوچھی تو محترمہ نے انہیں جواب دیا تھا کہ یہ ایک حکمت عملی کے تحت کیا گیا ہے۔

فیصل نے مجھ سے پوچھا کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ اب اسی حکمت عملی کا مظاہرہ کیوں نہیں کیا جا رہا تھا۔ اگر پی پی 1985ء کے انتخابات کا بائیکاٹ اس وجہ سے کر سکتی تھیں کہ ایک آمر کے تحت ہونے والے انتخابات انہیں قبول نہیں تھے تو پھر 2002ء میں ہونے والے انتخابات میں اسی وجہ سے بائیکاٹ کیوں نہیں کیا گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بینظیر بھٹو ابھی بھی کمپرومائز کر رہی تھیں اور آنے والوں دنوں میں بھی وہ کمپرومائز کریں گی۔ والی باتیں جھوٹی ہیں۔ بینظیر بھٹو نے تو اپنی پارٹی کو لوکل باڈی الیکشن لڑنے کی اجازت بھی دی اور اب وہ اس سسٹم کے خلاف باتیں بھی کر رہی ہیں۔

فیصل نے کہا ہم لوگوں سے یہ جھوٹ بولتے رہے تھے کہ بینظیر بھٹو 2002ء کے الیکشن سے پہلے پاکستان واپس آ جائیں گی۔ ہم سب کو پتہ تھا کہ محترمہ نے واپس نہیں آنا تھا۔ ہم پھر بھی تمام لوگوں کے سامنے جھوٹ بولتے رہے اور آخر میں جب وہ نہیں آئیں تو ہم عوام اور میڈیا کے سامنے بیوقوف بن کر رہ گئے۔

فیصل نے کہا کہ بینظیر بھٹو کو یہ سمجھنے کی ضرورت تھی کہ اب پارٹی کو ای میل کے ذریعے نہیں چلایا جا سکتا تھا۔ ان کا پاکستان میں ہونا ضروری تھا۔

میں نے فیصل کو بتایا کہ یہ سننے میں آتا ہے کہ پیپلز پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی بینظیر بھٹو کو پاکستان آنے سے منع کرتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ پاکستان نہیں آ رہی تھیں۔

فیصل مسکرائے اور بولے کہ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ بینظیر بھٹو کے سامنے سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کی کیا اوقات تھی۔

میں نے فیصل کو ٹوکا اور کہا کہ عام لوگوں میں یہ بھی تاثر ہے کہ شاید پیپلز پارٹی کے اندر جو

پیٹریاٹ گروپ بنایا گیا تھا اس میں بینظیر بھٹو کی مرضی شامل تھی۔

فیصل نے کہا یہ سب جھوٹ ہے۔ لیکن وہ اس بات پر ابھی بھی قائم تھے کہ یہ گروپ بینظیر بھٹو کی واپسی کی راہ ہموار کرے گا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ بینظیر واپس آنے کو تیار نہیں تھیں۔

میں نے فیصل سے پوچھا کہ اب جب وہ اس ملک کے وزیر داخلہ ہیں۔ اگر بینظیر بھٹو واپس آئیں تو کیا وہ انہیں جیل میں ڈالیں گے۔

فیصل نے اس کا بڑا ڈپلومیٹک جواب دیا اور کہا کہ بینظیر بھٹو کے خلاف مقدمات نیب نے قائم کیے ہیں اور اس کا ان کی وزارت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تمام کیسز بینظیر کے خلاف سیف الرحمن نے نواز شریف کے دوسرے دور اقتدار میں فائل کیے تھے اور آج تک مسلم لیگ نواز کے کسی بھی لیڈر نے پیپلز پارٹی یا بینظیر بھٹو سے معافی نہیں مانگی تھی۔

میں نے فیصل سے کہا کہ اب جبکہ وہ جنرل مشرف کے اقتدار کا حصہ ہیں تو آصف زرداری کو رہا کیوں نہیں کراتے جو ان کے بقول سیف الرحمن کے بنائے ہوئے جھوٹے مقدمات کی وجہ سے جیل میں پڑے ہوئے تھے۔

ایک مجبور فیصل نے ایک دفعہ پھر مجھے روایتی اور ڈپلومیٹک سا جواب دیا کہ وہ اپنی حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آصف زرداری کا انصاف پر مبنی ٹرائل کیا جائے۔ ایک وزیر داخلہ ہونے کے ناطے وہ زرداری صاحب کو جیل میں جتنی سہولتیں فراہم کر سکتے تھے انہوں نے اپنے اس پرانے دوست کو پہلے ہی فراہم کر دی تھیں۔ وہ بار بار یہ کہتے تھے کہ آصف زرداری کا فیئر ٹرائل ہونا چاہیے۔

فیصل نے اس بات کو تسلیم کیا کہ انہوں نے کمپرومائز کرنے کے بعد ہی پیپلز پارٹی کو چھوڑا تھا۔ وہ کمپرومائز کرنے والے کوئی پہلے اور آخری لیڈر نہیں تھے۔ پوری کی پوری پیپلز پارٹی کمپرومائز کرتی رہی تھی۔

فیصل نے کہا کہ اگر ہم ماضی میں ایک سو دفعہ کمپرومائز کر چکے ہیں تو ایک اور کمپرومائز کرنے میں کیا حرج تھا۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے فیصل نے کہا کہ اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ پارٹی کے لیڈروں کو کمپرومائز کرنا بینظیر بھٹو نے سکھایا تھا۔

فیصل کی یہ مایوس کر دینے والی بات سن کر میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاکستان میں

سیاسی مفاہمت بالکل ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ فیصل نے بغیر جھجک کے مجھے کہا کہ ہاں، یہ بات درست ہے کہ پاکستان میں سیاسی مفاہمت کی موت واقع ہو گئی تھی۔

فیصل نے بتایا کہ ہم سیاسی مفاہمت کی کیا بات کریں، جب ماضی میں ایک دوسرے کے خلاف پیپلز پارٹی پیٹریاٹ اور ... ایک ہی ... میں اکٹھے بیٹھے تھے۔

میں نے فیصل صالح حیات کے انٹرویو سے اٹھنے سے پہلے ان سے ایک آخری سوال پوچھا کہ کیا وہ پارٹی میں کبھی دوبارہ شامل ہونا پسند کریں گے جس کے لیے انہوں نے کئی برس شاندار ... تھے۔ میں گزرے ہوئے دنوں کی ... اس پارٹی کو ... جنرل مشرف کے اس خوبصورت ... پر افسردہ ... نے مجھے جواب دیا کہ اب میں کبھی دوبارہ زندگی میں بینظیر بھٹو کی پارٹی میں نہیں جاؤں گا۔ اب میری اپنی ایک پارٹی ہے اور اپنی ایک علیحدہ سیاسی شناخت ہے۔

OOO

اس انٹرویو کے کچھ عرصے بعد فیصل اور گجرات کے چوہدریوں پرویز الٰہی اور چوہدری شجاعت کے درمیان ٹھن گئی۔ چوہدری پرویز الٰہی نے حسب عادت پنجاب میں ہر اس لیڈر کو تنگ کرنا شروع کر دیا جس کے بارے میں انہیں ذرا سا بھی شک تھا کہ وہ جنرل مشرف کے قریب تھا یا کل کلاں کو ان کے وزیر اعظم بننے کی خواہش کی تکمیل کے آگے تھوڑی سی بھی مزاحمت کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ پیپلز پارٹی پیٹریاٹ کے ارکان سب سے زیادہ پرویز الٰہی کے نشانے پر آئے۔ ان کے علاوہ فاروق لغاری، راؤ سکندر اقبال، فیصل صالح حیات، ڈاکٹر شیر افگن خان نیازی، ہمایوں اختر، جہانگیر خان ترین اور دیگر ایسے لیڈران تھے جن پر ہر وقت وزیر اعلیٰ پرویز الٰہی کی نظر کرم ضرورت سے زیادہ رہتی۔ تاہم، باقی لیڈروں کے برعکس فیصل صالح حیات ڈٹ کر چوہدریوں کے مقابلے میں کھڑے تھے۔ وہ دوسروں کی نسبت ان چوہدریوں کی کوئی خوش آمد نہیں کرتے تھے۔ فیصل کا خیال یہ تھا کہ جب ان سب کو جنرل مشرف کے دربار سے ہی فیض ملتا تھا تو پھر درمیان میں اپنی قیمت چوہدری پرویز الٰہی اور چوہدری شجاعت حسین جیسے پاور بروکر سے کیوں لگوائی جائے۔ اگر خوشامد کرنی ہی ہے تو جنرل مشرف کی کیوں نہ کی جائے۔ چوہدریوں کو فیصل کی اس عادت سے بڑی چڑ تھی۔ فیصل انہیں اس وجہ سے بھی ناپسند تھے کہ

ان کے پاس وزارت داخلہ کا قلمدان تھا جو نواز شریف کے پچھلے دور میں ہمیشہ چوہدری شجاعت کے پاس رہتا تھا۔ شاید اسی وزارت کی بدولت چوہدری شجاعت حسین کو منڈی بہاؤالدین، گجرات اور اس کے نواحی علاقوں سے ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو بیرون ملک چوری چھپے دیگر ملکوں میں بھیجنے کا الزام بھی لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ چوہدری شجاعت کو فیصل کی موجودگی میں وزارت داخلہ کو استعمال کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا جو ماضی میں میسر تھا۔ چوہدری شجاعت کو فیصل کو نیچا دکھانے کا سب سے اچھا موقع اس وقت ملا جب جنرل پرویز مشرف نے میر ظفر اللہ جمالی کو ہٹا کر چوہدری شجاعت کو چند ماہ کے لیے نگران وزیر اعظم بنایا تاکہ شوکت عزیز الیکشن جیت کر ان کی جگہ لے سکیں۔ انہی دنوں کالم نگار نذیر ناجی صاحب نے لاہور سے ایک کالم لکھا جس میں انہوں نے اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ سابق وزیر داخلہ شاید انسانی سمگلنگ میں ملوث تھے اور برطانیہ نے حکومت پاکستان کو اس بارے میں ایک باقاعدہ خط لکھا تھا۔ اس کالم کا یہ فائدہ ہوا کہ فیصل صالح حیات کو دوسری دفعہ وزارت داخلہ نہیں ملی۔ جب شوکت عزیز نے نئی کابینہ بنائی تو انہیں وزیر ماحولیات بنا دیا گیا۔ فیصل صالح حیات بھی چوہدری نثار علی خان کی طرح ہیں۔ ان کے بارے میں کوئی ایسی چیز چھپ جائے جو انہیں پسند نہ ہو تو وہ بھی جب تک اس کا جواب نہ دے دیں آرام سے نہیں بیٹھتے۔

شوکت عزیز کی کابینہ بننے سے ایک دن پہلے فیصل صالح حیات کا مجھے فون آیا۔ وہ اس مسئلے پر اپنا انٹرویو دینا چاہ رہے تھے۔ انہوں نے اس انٹرویو میں گجرات کے چوہدریوں پر شدید حملے کیے اور مجھے ان پولیس آفیسروں کے نام دیے جنہیں انہوں نے وزیر داخلہ کے طور پر ایف آئی اے سے انسانی سمگلنگ کے الزامات پر نکالا تھا اور اگلے روز ہی پنجاب حکومت نے انہیں صوبے میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز کر دیا تھا۔ فیصل نے اس انٹرویو میں پوری تفصیلات بتائیں کہ کیسے چوہدری صاحبان بھی اس انسانی اسمگلنگ میں ملوث رہے تھے۔

جونہی اگلی صبح یہ انٹرویو چھپا، دوپہر کے وقت مجھے فیصل صالح حیات کا فون آیا۔ وہ بڑے افسردہ موڈ میں تھے اور بولے کہ ابھی صدر مشرف سے مل کر آ رہا ہوں۔ ان کے موڈ سے لگتا تھا کہ بات بہت بڑی الجھ رہی تھی۔ صدر نے اس بات پر خفگی کا اظہار کیا تھا کہ انہیں دی نیوز کو انٹرویو دینے کی کیا ضرورت تھی کیونکہ اس سے ان کی حکومت میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے ایک دوسرے سے اختلافات بڑھ

بھلا فیصل جیسا سمجھدار سیاستدان اس موقع کو کیسے ضائع جانے دیتا۔ وہ مسکراتے ہوئے کھڑے ہوئے اور بولے کہ جناب اسپیکر یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ جس رپورٹر کے بارے میں آپ کہہ رہے ہیں کہ وہ بلیک میلر ہے اس کے بارے میں دو دن پہلے ہی آپ کے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے اسی جگہ کھڑے ہو کر فرمایا تھا کہ وہ ان کا ذاتی دوست ہے۔ کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ یوسف رضا گیلانی صاحب اپنے وزیروں کے خلاف خود ہی خبریں لگوا رہے ہیں۔

اس کے بعد رضا صاحب کی حالت دیکھنے والی تھی اور فیصل صالح حیات مسکراتے ہوئے قومی اسمبلی کے ہال سے باہر نکل گئے۔

امین فہیم

اکتوبر 2002ء کے الیکشن کے بعد امین فہیم کو پہلی دفعہ یہ یقین ہو گیا تھا کہ اگر وہ اب کی دفعہ وزیراعظم نہ بنے تو پھر وہ کبھی نہیں بن سکیں گے۔ اس سے بہتر موقع ان کی زندگی میں نہیں آ سکتا تھا۔ پیپلز پارٹی قومی اسمبلی کے انتخابات میں پی ایم ایل کیو کے بعد زیادہ سیٹیں لے چکی تھی۔ پی ایم ایل کیو کو ہاؤس میں سادہ اکثریت نہیں مل سکی تھی۔ حکومت بنانے کے لیے ضروری تھا کہ جنرل پرویز مشرف پیپلز پارٹی کے ساتھ ایک نیا سیاسی اتحاد تشکیل دیں۔ اگر پیپلز پارٹی اس اتحاد میں شریک ہونے سے انکار کرتی تو پھر جنرل مشرف کو پارلیمنٹ توڑ کر نئے سرے سے الیکشن کرانا پڑتے۔ یہی وجہ تھی کہ جنرل پرویز مشرف ہر قیمت پر پیپلز پارٹی کے ساتھ اتحاد کر کے امین فہیم کو وزیراعظم بنانے پر تیار ہو گئے۔ اب صرف بینظیر بھٹو کی ایک چھوٹی سی ہاں کی ضرورت تھی۔ بینظیر بھٹو نے امین فہیم کو لندن بلا لیا تھا۔ اس ملاقات میں یہ طے ہونا تھا کہ بینظیر بھٹو امین فہیم کو وزیراعظم بنانے پر تیار تھیں یا نہیں۔

لندن جانے سے قبل آئی ایس آئی کے افسران کے ساتھ امین فہیم کی ملاقاتیں بڑھ گئی تھیں۔ ایک مرحلہ تو یہ بھی آیا کہ ان مذاکرات میں آصف علی زرداری بھی شامل ہو گئے اور اس وقت کے ڈی جی آئی ایس آئی جنرل احسان الحق اور ڈپٹی ڈی جی آئی ایس آئی میجر جنرل احتشام ضمیر کے ساتھ خفیہ ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔

ایک رات امین فہیم آصف زرداری کو پولی ہسپتال کے کمرے سے اس طرح چوری چھپے آئی ایس آئی کے جرنیلوں سے ملانے لے گئے کہ سیکیورٹی پر تعینات گارڈز کو بھی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ یہ ملاقات اتنی خفیہ رکھی گئی تھی کہ اس کا بینظیر بھٹو کو بھی علم نہیں تھا۔ کسی کام سے بینظیر بھٹو نے آصف زرداری کو واشنگٹن سے کال کیا تو ان کا فون بند ملا۔ ایک دو اور لوگوں سے بی بی نے پوچھنے کی کوشش کی تو بھی انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ بینظیر بھٹو کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ سمجھیں کہ جنرل مشرف نے ان کے خاوند کو ہسپتال سے اغوا کرا لیا ہے اور زرداری صاحب کی جان خطرے میں ہے۔ زرداری صاحب کو اغوا کر کے جنرل مشرف ان پر اپنی مرضی کی ڈیل مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ اسی پریشانی کے عالم میں بینظیر بھٹو نے واشنگٹن میں مشہور صحافیوں شاہین صہبائی، خالد حسن، انور اقبال اور دیگر کو فون کر کے آصف زرداری کے اغوا کی خبر دینا شروع کر دی۔ ساتھ میں یہ بھی کہا کہ اگر آصف زرداری کو کچھ ہوا تو اس کے ذمہ دار جنرل پرویز مشرف ہوں گے۔

پاکستان میں اس وقت رات کے بارہ بج چکے تھے۔ میں ابھی بھی اپنے دفتر میں موجود تھا۔ اچانک ایم ایس این میسنجر پر شاہین صہبائی صاحب، جو واشنگٹن میں تھے، نے مجھے ہیلو کہا اور بولے رؤف تمہارے لیے ایک بہت بڑی خبر ہے۔ اگر تم چاہو تو یہ کل صبح کی تمہاری لیڈ سٹوری بن سکتی ہے۔ وہ مجھے بتانے لگے کہ بینظیر بھٹو اس وقت شدید ہراساں ہیں کیونکہ آصف زرداری پولی ہسپتال کے کمرے سے غائب ہو چکے ہیں اور کسی کو کوئی علم نہیں کہ انہیں کون وہاں سے اغوا کر کے لے گیا ہے۔

میں یہ خبر سن کر واقعی چونک گیا۔ شاہین صاحب سے دو چار اور ٹپس لیے۔ کہیں سے آصف زرداری صاحب کے ساتھ رہنے والے ڈاکٹر قیوم سومرو کا موبائل نمبر لیا۔ ڈاکٹر قیوم سے گفتگو کر کے مجھے احساس ہوا کہ انہیں پتہ تھا کہ زرداری صاحب کو کون کہاں لے گیا ہے۔ دراصل بینظیر بھٹو کو آصف زرداری اور امین فہیم دونوں کے فون بند مل رہے تھے لہٰذا وہ پریشان ہو گئی تھیں اور جلد بازی میں انہوں نے صحافیوں کو فون کرنا شروع کر دیے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد بینظیر بھٹو کو یہ پیغام پہنچ گیا تھا کہ زرداری صاحب اس وقت جنرل احسان سے ملاقات کر رہے ہیں اور مستقبل کی حکومت اور وزیراعظم کے نام پر مذاکرات ہو رہے ہیں۔ اب بینظیر بھٹو پچھتا رہی تھیں کہ انہوں نے کیوں اتنی جلدی صحافیوں کو فون کرنا شروع کر دیا تھا جس سے بات تھوڑی ہی بگڑ گئی تھی۔

تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

میں نے فوری طور پر اس کی خبر بنائی جو اگلے دن دی نیوز کی لیڈ سٹوری تھی جس سے عام پبلک اور سیاسی لیڈروں کو احساس ہوا کہ مذاکرات اب بہت سنجیدہ مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں اور اسی لیے آصف زرداری کو آئی ایس آئی کے سیف ہاؤس میں رات کے اندھیرے میں جنرل احسان اور دیگر جرنیلوں سے ملاقات کے لیے لے جایا گیا تھا۔

اس ملاقات میں ہی جنرل مشرف کے جرنیلوں نے بینظیر بھٹو کو یہ فائنل آفر دی تھی کہ وہ امین فہیم کو پاکستان کا وزیراعظم بننے دیں۔ چوہدری شجاعت حسین کے ساتھ مل کر ایک کابینہ بنے گی جس میں پیپلز پارٹی کو بھی حصہ دیا جائے گا۔ سندھ کی وزارت اعلیٰ بھی پیپلز پارٹی کو دی جائے گی۔ پنجاب میں چوہدری حکمرانی کریں گے لیکن وہاں بھی پیپلز پارٹی کو کچھ وزارتیں دی جا سکتی ہیں۔ صوبہ سرحد مولویوں کے حوالے کر دیا تھا جبکہ بلوچستان میں پی ایم ایل کیو اور مولویوں نے مل کر حکومت بنانی تھی۔ یوں جنرل مشرف بڑی سمجھداری سے ماسوائے نواز شریف کی پارٹی کے تمام سیاسی جماعتوں کو اپنے ساتھ اقتدار شیئر کرانے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ نواز شریف کی جماعت صرف اپوزیشن میں رہ جاتی اور بھلا بیس کے قریب ایم این اے 342 کے ہاؤس میں جنرل مشرف کے لیے کیا مسائل پیدا کر سکتے تھے۔ نواز شریف اور بینظیر بھٹو ملک سے باہر تھے اور یوں جنرل مشرف کے اقتدار کو دور دور تک کہیں سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

جنرل مشرف نے اپنے تئیں ایک بڑا خوبصورت پلان بنایا تھا لیکن اس کا سارا دارومدار بینظیر بھٹو اور مخدوم امین فہیم کی لندن میں ہونے والی ملاقات پر تھا۔

لندن جا کر امین فہیم نے بینظیر بھٹو کے سامنے یہ سارا پلان رکھا اور بتایا کہ جنرل صاحب انہیں وزیراعظم بنانا چاہتے ہیں۔ ان کی یہ بھی شرط تھی کہ بینظیر بھٹو تین سال تک پاکستان واپس نہیں آئیں گی۔

بینظیر بھٹو مسکرائیں اور انہوں نے امین فہیم جنہیں وہ سیکرٹ ایجنسیوں اور جنرل مشرف سے مذاکرات کے لیے استعمال کر رہی تھیں سے پوچھا کہ مخدوم صاحب مجھے یہ تو بتائیں کہ اس پوری ڈیل میں میرے لیے کیا ہے؟

امین فہیم چپ رہے۔

بینظیر بھٹو کو ساری گیم سمجھ میں آ چکی تھی۔ جنرل مشرف سب کچھ اپنے لیے لینا چاہ رہے تھے۔ بینظیر بھٹو کو ان کے خاوند آصف زرداری کو جیل سے رہا کر کے دبئی بھیجنے کی آفر کر کے وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ پیپلز پارٹی کو اتنے بڑے تعاون کے نتیجے میں اس کی ساری قیمت ادا کر رہے تھے۔

یوں بینظیر بھٹو کے لیے اس پوری ڈیل میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کے لیے وہ جنرل مشرف کی شرائط ماننے پر تیار ہو جاتیں۔ یوں یہ ڈیل لندن میں ہی دم توڑ گئی تھی۔

اس کے بعد جنرل مشرف کے لیے دو آپشن رہ گئے تھے۔ یا تو وہ اسمبلیاں توڑ دیں اور نئے الیکشن کرائیں یا پھر پیپلز پارٹی کو توڑ دیں۔ نئے الیکشن کرانا اتنا آسان کام نہیں تھا۔ چند دنوں میں جنرل مشرف کی سیکرٹ ایجنسیوں نے پیپلز پارٹی توڑ دی۔ جو کام جنرل ضیا نہیں کر سکے تھے وہ جنرل مشرف نے کر دکھایا۔

جب میری امین فہیم سے اپریل 2003ء میں پیپلز پارٹی کے زیرو پوائنٹ پر واقع میڈیا سنٹر میں ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے بھی سوال پوچھا کہ آپ کی سیکرٹ ایجنسی کے لوگوں سے خفیہ ملاقاتوں پر بہت سے لوگوں کو اعتراضات تھے اس کے باوجود بھی آپ وزیراعظم نہیں بن سکے۔

امین فہیم بولے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اکتوبر کے انتخابات کے بعد اس ملک کا نیا وزیراعظم بن رہے تھے۔ حتیٰ کہ ایک پیغام بھی انہیں پہنچا دیا گیا تھا کہ اگر یہ مذاکرات کامیاب ہو گئے تو وہ اپنے آپ کو وزیراعظم سمجھیں۔

[illegible]

امین فہیم کا خیال تھا کہ [illegible] نے ان کے خلاف سازش کی تھی۔ انہوں نے جنرل مشرف کے کانوں میں [illegible]

[illegible]

جنرل مشرف کو جائن کرنے کا خیال نہیں آیا۔

پیپلز پارٹی کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار کرنے کے لیے امین فہیم نے مجھے ایک لمبی کہانی سنائی۔

امین فہیم ذوالفقار علی بھٹو سے اس وقت ہی متاثر ہو گئے تھے جب وہ پہلی دفعہ ان سے راولپنڈی میں ملے تھے۔ بھٹو صاحب اس وقت جنرل ایوب خان کی کابینہ میں وزیر خارجہ تھے۔ امین فہیم کا خیال تھا کہ بھٹو صاحب جیسے بندے کے پاس ایک نوجوان کے لیے ٹائم نہیں ہوگا۔ جب وہ بھٹو صاحب سے ملنے کے لیے ان کے دفتر پہنچے اور انہیں بتایا گیا کہ مخدوم طالب المولا کا بیٹا ان سے ملنے کے لیے آیا ہے تو وہ اپنے دفتر سے باہر آ کر انہیں ریسیو کرنے آئے۔ انہوں نے ایک بہت ضروری میٹنگ کینسل کر دی تاکہ وہ انہیں ٹائم دے سکیں۔

ایک نوجوان مخدوم کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی کہ بھٹو صاحب جیسا لیڈر سارے کام چھوڑ کر ان کے پاس بیٹھا تھا۔ امین فہیم بھٹو صاحب کے اس انداز کو کبھی نہ بھول سکے۔ یہ بات صرف یہیں ختم نہیں ہوئی۔ امین فہیم کے والد مخدوم طالب المولا جب بھی اسلام آباد قومی اسمبلی کے اجلاس میں آتے تو اپنے ساتھ امین فہیم کو ضرور لاتے۔ امین فہیم وزیٹرز گیلری میں بیٹھے ہوتے۔ جونہی اجلاس ختم ہوتا بھٹو صاحب سیدھے وہاں سے امین فہیم کی طرف آتے اور ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر نہ صرف ان سے باتیں کرتے بلکہ باہر بھی لے جاتے۔

ایک دن امین فہیم لندن میں تھے کہ انہیں بھٹو صاحب کا پیغام آیا۔ انہوں نے اس نوجوان کو [illegible] بتایا کہ وہ ایک سیاسی پارٹی بنانا چاہتے ہیں۔ بھٹو صاحب نے اپنی نئی پارٹی کے بارے میں [illegible]

[illegible] بھٹو صاحب پارٹی کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ جب یہ میٹنگ ختم ہوئی تو بھٹو صاحب نے امین فہیم سے کہا کہ آپ کے ساتھ یہ ساری گفتگو کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے والد کو میری [illegible]

پارٹی میں لے کر آئیں گے۔

امین فہیم نے بھٹو صاحب سے وعدہ کر لیا۔

امین فہیم بھٹو صاحب کے ذوق سے بہت متاثر تھے اور یہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ اپنے کپڑے کہاں سے خریدتے ہیں۔ بھٹو صاحب نے امین فہیم کو ہانگ کانگ میں ایک چینی شاپ کے بارے میں بتایا کہ جب بھی وہاں جاؤ تو شرٹس وہاں سے خریدنا اور ہاں، میرے لیے بھی لانا نہ بھولنا۔ بھٹو صاحب اپنے جوتے لندن سے خریدتے تھے اور کبھی انہوں نے کسی سنگل شاپ سے ٹائی نہیں خریدی تھی۔

جب امین فہیم نے پاکستان واپس آ کر اپنے باپ سے بات کی کہ وہ بھٹو کی پارٹی کو جائن کریں تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ وہ خود ایک بہت بڑے فیوڈل تھے۔ وہ بھلا کسی اور فیوڈل کی پارٹی میں شامل کیوں ہوتے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ پیدائشی مسلم لیگی تھے اور کسی مسلم لیگی کے لیے اپنی سیاسی وابستگیاں تبدیل کرنا مناسب نہیں تھا۔

امین فہیم اصرار کرتے رہے کیونکہ وہ بھٹو صاحب سے وعدہ کر چکے تھے۔

امین فہیم اپنے باپ کو اس بات پر قائل کرنے میں لگے رہے کہ نئی سیاسی پارٹی جائن کرنے سے انہیں کیا کیا فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ آخر کار انہوں نے اپنے باپ کو قائل کر لیا۔

امین فہیم نے بھٹو صاحب کو پیغام بھیجا کہ ان کا مشن پورا ہو گیا ہے۔

بھٹو صاحب نے فوری طور پر غلام مصطفیٰ جتوئی اور پیر غلام رسول جیلانی کو مخدوم آف ہالا بھیجا تاکہ وہ طالب المولا کو نئی پارٹی جائن کرنے کی دعوت دے سکیں۔ مخدوم طالب المولا کی پیپلز پارٹی میں شمولیت پر بہت خوشیاں منائی گئیں کیونکہ بھٹو صاحب کا خیال تھا کہ ہالا کے مخدوموں کے پارٹی میں شامل ہونے سے انہوں نے سندھ میں تقریباً آدھی سے زیادہ سیاسی جنگ جیت لی ہے۔

ابھی پیپلز پارٹی کو بنے ہوئے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ ملک میں ہونے والے نئے انتخابات میں الیکشن میں حصہ لینے کے مسئلے پر پارٹی میں دو دھڑے بن گئے۔ پارٹی کے اندر ایک ایسا گروپ تھا جو کمٹڈ سوشلسٹ لیڈروں پر مشتمل تھا جس میں ڈاکٹر مبشر حسن، جے رحیم، معراج محمد خان، شمیم خان اور میر علی احمد تالپور جیسے لوگ شامل تھے۔ وہ روس اور چین کی طرز پر انقلاب لا کر اقتدار میں آنے کے حق میں تھے۔ وہ اس بات کے خلاف تھے کہ پیپلز پارٹی کو انتخابات میں حصہ لینا چاہیے۔

دوسرا گروپ جس کی قیادت مخدوم آف ہالا کر رہے تھے، وہ انتخابات میں حصہ لینے کے حامی تھے۔

بھٹو صاحب نے مخدوم آف ہالا کی حمایت کر دی اور یوں انتخابات لڑنے کا فیصلہ کیا گیا۔

بھٹو صاحب نے اپنی انتخابی مہم سندھ سے شروع کی اور امین فہیم کو اپنے ساتھ رکھا۔ وہ ہر جگہ بھٹو صاحب کے ساتھ جلسے جلوسوں میں شریک ہوتے رہے۔

جب الیکشن کا رزلٹ آیا تو سب لوگ ششدر رہ گئے۔ امین فہیم کا خیال تھا کہ ان کا کام ختم ہو گیا تھا۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے جاپان چلے گئے۔ وہ ابھی دنیا گھومنا پھرنا چاہتے تھے۔

امین فہیم ابھی اپنی نئی منزل پر پہنچے ہی تھے کہ انہیں جام صادق علی کی کال آئی۔ بھٹو صاحب چاہتے تھے کہ امین فہیم ان کی ایک خالی کی ہوئی نشست پر ضمنی انتخابات میں حصہ لیں۔ شروع میں امین فہیم نے مزاحمت کی تاہم واپس آ کر الیکشن لڑا اور جیت گئے۔ انہیں سندھ کے گورنر ممتاز بھٹو کا فوڈ اور ایگریکلچر ایڈوائزر مقرر کیا گیا۔ کچھ عرصے بعد امین فہیم کو اسلام آباد لے آیا گیا جب بھٹو صاحب اس ملک کو نیا آئین بنانے کی تیاریوں میں مصروف تھے، وہ آئین بننے کے تمام مراحل میں شریک رہے۔ بھٹو صاحب نے انہیں وزیر مملکت برائے کیبنٹ ڈویژن اور پارلیمانی امور بنا دیا۔

میں اس دوران خاموشی سے بیٹھا یہ سب کچھ سنتا رہا تھا۔ جونہی امین فہیم نے پیپلز پارٹی کے ساتھ شروع کیے گئے اپنے سیاسی سفر کی کہانی ختم کی، میں نے ان سے پوچھا کہ سیاست میں اتنا اچھا سٹارٹ لینے کے باوجود بھٹو صاحب کا اتنا برا انجام کیوں ہوا؟

امین فہیم شاید اتنی جلدی اس سوال کی توقع نہیں کر رہے تھے۔ وہ خاصی دیر خاموش رہے۔ اپنے آپ کو تھوڑا سنبھالا اور پھر انہوں نے بولنا شروع کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بیرونی طاقتوں نے بھٹو صاحب پر اپنا دباؤ بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ ملکی معاملات چلانے کے لیے بھٹو صاحب کو چند غلط مشورے بھی دیے گئے۔ دراصل وہ لوگ بھٹو صاحب کے اس انجام کے ذمہ دار تھے جو شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار تھے۔

میں نے امین فہیم سے ان لوگوں کے نام پوچھنے کی کوشش کی لیکن وہ یہ بتانے کے لیے تیار نہیں ہوئے اور کہنے لگے کہ اب وہ اپنے دوستوں کو ناراض نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو پہلے ہی

بریگیڈیئر امتیاز نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوئی تھیں۔ وہ امین فہیم کے پیچھے لگے رہے۔ آخر امین فہیم مان گئے لیکن انہوں نے بریگیڈیئر امتیاز کے سامنے یہ شرط رکھی کہ وہ اس صورت میں سندھ حکومت میں شامل ہوں گے اگر ان کے ساتھ جام صادق علی اور غلام علی نظامانی کو بھی وزیر بنایا جائے۔ جام صادق علی ان دنوں لندن میں جلاوطنی کے دن گزار رہے تھے۔

بریگیڈیئر امتیاز نے انہیں وزیر بنانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ بھارتی ایجنٹ ہیں۔ یہ علیحدہ بات تھی کہ بعد میں اسی اسٹیبلشمنٹ اور سیکرٹ ایجنسیوں نے اسی بھارتی ایجنٹ جام صادق علی کو 1991-93 میں سندھ کا وزیر اعلیٰ بنا کر پیپلز پارٹی کے خلاف استعمال کیا۔

جب جنرل ضیاء کو مخدوم طالب المولا کے انکار کا پتہ چلا تو انہوں نے خود ان سے ملنے کی خواہش کی لیکن مخدوم طالب المولا نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا۔

جب یہ ساری بات چیت آگے پروان نہ چڑھ سکی تو امین فہیم امریکہ چلے گئے جہاں 17 اگست 1988ء کو انہوں نے جنرل ضیاء کے طیارے کے حادثے کی خبر سنی۔

امین فہیم فوری طور پر پاکستان لوٹ آئے۔ پیپلز پارٹی نے انتخابات میں اکثریت حاصل کی۔ اسٹیبلشمنٹ نے ایک دفعہ پھر اپنا کھیل شروع کر دیا۔ وہ بھٹو خاندان میں سے کسی کو بھی وزیر اعظم بنانے پر تیار نہیں تھے۔ اب کی دفعہ اسٹیبلشمنٹ امین فہیم کو توڑ کر ملک کا وزیر اعظم بنانا چاہتی تھی۔ ایک دن امین فہیم کو پتہ چلا کہ فرزند راولپنڈی شیخ رشید احمد جو اس وقت سیاست میں اتنے نہیں جانے جاتے تھے اور چوہدری انور عزیز ان سے ملنے کے لیے آ رہے تھے۔ ان دونوں نے اس وقت کے آرمی چیف جنرل اسلم بیگ اور صدر غلام اسحاق خان کا ایک پیغام انہیں دیا کہ وہ بینظیر بھٹو کو چھوڑ کر اس ملک کے نئے وزیر اعظم بن جائیں۔ امین فہیم کو بتایا گیا کہ انہیں سندھ سے قابل اعتماد بندے کی ضرورت ہے۔ آرمی چیف اور صدر بینظیر بھٹو کے بجائے انہیں وزیر اعظم بنانا چاہتے ہیں۔ ان دونوں نے یہ تجویز دی کہ وہ پارٹی کے اندر ایک فارورڈ بلاک بنائیں لیکن امین فہیم نے انکار کر دیا۔

میں نے امین فہیم سے پوچھا کہ جب آپ کے خاندان نے پیپلز پارٹی کے لیے اتنی قربانیاں دی تھیں اور وہ بھٹو فیملی کے وفادار بھی رہے پھر بھی بینظیر بھٹو نے انہیں اس ملک کا وزیر اعظم نہیں بننے دیا۔

امین فہیم نے قہقہہ لگایا اور بولے کہ جب ان کی بینظیر بھٹو صاحبہ سے 11 اکتوبر 2002ء کو لندن میں ملاقات ہوئی تھی تو محترمہ نے انہیں پیپلز پارٹی حکومت بنانے کا پورا اختیار دے دیا تھا۔ محترمہ نے امین فہیم سے کہا تھا کہ وہ پی ایم ایل کیو کی لیڈر شپ سے پاور شیئرنگ معاہدے کے لیے گفتگو شروع کریں۔ امین فہیم کو اس وقت شدید مایوسی ہوئی جب ان مذاکرات میں ان کے سامنے یہ شرط رکھی گئی کہ وزیر اعظم بننے کے بعد بینظیر بھٹو سے کوئی رابطہ نہیں رکھیں گے۔

میں نے کہا کہ مخدوم صاحب! عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ بینظیر بھٹو نہیں چاہتی تھیں کہ پیپلز پارٹی میں سے کوئی سندھی لیڈر وزیر اعظم بنے کیونکہ اس کے بعد ان کی اپنی بارگیننگ پوزیشن ہمیشہ کے لیے کمزور ہو جاتی۔

امین فہیم نے بڑی شدت سے اس تاثر کو مسترد کیا اور کہا کہ بینظیر بھٹو واقعی انہیں وزیر اعظم بنانا چاہتی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ آصف علی زرداری کو 2002ء کے انتخابات کے بعد حکومت بنانے کے لیے ہونے والے مذاکرات میں شامل کیا گیا تھا۔

میں نے کہا کہ امین صاحب! یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کے بیٹے کو بھی سندھ کا وزیر اعلیٰ نہ بنوانے میں بینظیر بھٹو کا بڑا ہاتھ تھا حالانکہ جنرل مشرف اور آپ کے ساتھی ان کے بیٹے کو یہ عہدہ دینے کے لیے تیار تھے۔

امین فہیم نے یہ کہہ کر پھر بینظیر بھٹو کا دفاع کیا کہ ایسی بات ہرگز نہیں تھی۔ جب انہیں جنرل مشرف کی طرف سے یہ پیشکش کی گئی کہ وہ اپنے بیٹے کو سندھ کا چیف منسٹر بنوا لیں تو انہوں نے محترمہ سے رابطہ کر کے یہ ساری بات انہیں بتائی تھی۔ محترمہ نے انہیں کہا تھا کہ وہ اپنی پارٹی کے لوگوں کو اعتماد میں لے لیں اور سب لوگ تقریباً اس پر راضی بھی ہو گئے تھے۔ جنرل مشرف اور پیپلز پارٹی کے درمیان ڈیل تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ جنرل مشرف نے ان کے بیٹے کو وزیر اعلیٰ سندھ بنانے کی منظوری دے دی تھی۔ چوہدری شجاعت حسین اور وزیر اعظم ظفر اللہ جمالی نے کراچی پہنچ کر ایک پریس کانفرنس میں ان کے بیٹے کو چیف منسٹر بنانے کا اعلان کرنا تھا۔

اس پریس کانفرنس سے چند گھنٹے پہلے امین فہیم کو ایک ٹیلیفون کال آئی۔ انہیں کہا گیا کہ وہ اپنے بیٹے کو کہیں کہ اگر وہ وزیر اعلیٰ بننا چاہتے ہیں تو پہلے پیپلز پارٹی سے اعلان لاتعلقی کریں۔

امین فہیم سے میرا ایشو ابھرا کر 2008ء کے شروع میں ہوا جب فروری کے انتخابات کے بعد وہ اپنے آپ کو پاکستان کا وزیر اعظم سمجھنے لگ گئے تھے۔ اس میں ان کا قصور بھی نہیں تھا کیونکہ نوڈیرو میں بینظیر بھٹو کی شہادت کے بعد ہونے والی پہلی پریس کانفرنس میں آصف علی زرداری صاحب نے اپنے آپ کو بلاول بھٹو زرداری کے ساتھ کو چیئرپرسن منتخب کرا کر یہ اعلان کیا تھا کہ امین فہیم ان کے وزارت عظمیٰ کے امیدوار ہوں گے۔

29 دسمبر 2007ء کو نوڈیرو میں ہونے والی اس پریس کانفرنس میں میں بھی موجود تھا۔ میں وہاں بینظیر بھٹو کی شہادت کے بعد اپنے اخبار دی نیوز کے لیے رپورٹنگ کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ فروری کے انتخابات میں جب پیپلز پارٹی نے اکثریت حاصل کر لی تو امین فہیم نے اپنے آپ کو ملک کا وزیر اعظم سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے چالیس سال پرانے دوست سینیٹر انور بیگ نے امین فہیم کو اسلام آباد میں غیر ملکی سفیروں سے ملانا شروع کر دیا تھا۔ بہت سارے سفیر تو خود امین فہیم سے ملنا چاہتے تھے تاکہ وہ ملک کے نئے وزیر اعظم کو قریب سے دیکھ کر ان کے بارے میں اپنا ایک تاثر قائم کر لیں۔ انور بیگ کے ڈپلومیٹک انکلیو میں بہت زیادہ تعلقات تھے جس کا مظاہرہ انہوں نے اس وقت کر کے دکھایا جب بینظیر بھٹو پاکستان واپس آئیں اور انور بیگ نے پارلیمنٹ ہاؤس میں سو سے زیادہ غیر ملکی سفیروں کو ایک چھت تلے بینظیر بھٹو کی تقریر سننے کے لیے اکٹھا کر دیا تھا۔ بینظیر بھٹو بھی انور بیگ کے اتنے زیادہ تعلقات سے بہت متاثر ہوئی تھیں۔ اب جبکہ بینظیر بھٹو نہیں رہی تھیں تو انور بیگ نے اپنے دوست امین فہیم کو ڈپلومیٹک انکلیو میں متعارف کرانا شروع کر دیا تھا۔ اس میں انور بیگ کا قصور بھی نہیں تھا کیونکہ یہ آصف علی زرداری ہی تھے جنہوں نے نوڈیرو میں بیٹھ کر امین فہیم کو پاکستان کا نیا وزیر اعظم بنانے کا عندیہ دیا تھا۔ امین فہیم اور انور بیگ کے ذہن میں بھی یہ نہیں آ سکتا تھا کہ انتخابات کے بعد آصف علی زرداری صاحب کی ترجیحات یکدم بدل چکی تھیں۔ امین فہیم کو وزیر اعظم بنانے کا اعلان محض پارٹی کے اندر اپنے خلاف ہونے والی کسی بھی بغاوت کو رونما ہونے سے روکنا تھا۔ بینظیر بھٹو کے بعد اگر کوئی پارٹی کا لیڈر بن سکتا تھا تو وہ امین فہیم تھے جو اس وقت پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کے چیئرمین تھے۔ اگر نوڈیرو میں ہونے والی وہ میٹنگ جس میں بینظیر بھٹو کی وصیت پڑھ کر سنائی گئی اور زرداری صاحب نے پارٹی اپنے قبضے میں لے لی، میں امین فہیم بغاوت پر اتر آتے تو شاید آصف زرداری

صاحب کے لیے پارٹی پر قبضہ کرنا اتنا آسان نہ رہتا۔ یوں بڑی سمجھداری سے امین فہیم کو کسی بھی متوقع بغاوت سے باز رکھنے کے لیے آصف زرداری نے وقتی طور پر انہیں وزیر اعظم بنانے کا اعلان کیا لیکن بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ وہ ان کی ایک سیاسی چال تھی۔ لیکن امین فہیم آخری دن تک جب تک یوسف رضا گیلانی کے نام کا اعلان نہیں کیا گیا، اپنے آپ کو وزیر اعظم کا امیدوار سمجھتے رہے۔

جب انور بیگ امین فہیم کو سفیروں سے ملوا رہے تھے، اس وقت آصف زرداری صاحب ابھی بھی نوڈیرو میں موجود تھے۔ جب مجھے ان ملاقاتوں کا علم ہوا تو میں نے دی نیوز میں اس کی ایک سٹوری فائل کی۔ اور تو اور امریکی سفیر بھی انور بیگ کے گھر پر آ کر خصوصی طور پر امین فہیم سے ملی تھیں اور انہوں نے بھی ایک طرح سے اپنی طرف سے کلیئرنس چٹ دے دی تھی۔ انور بیگ اور امین فہیم نے اپنے تئیں ہوم ورک پورا کر لیا تھا۔ جب امریکن سفیر کو ان کے وزیر اعظم بننے پر اعتراض نہیں تھا تو باقی پھر پیچھے کیا رہ جاتا تھا۔ یوں امین فہیم کے وزیر اعظم بننے میں کچھ دن باقی رہ گئے تھے۔

جب یہ سٹوری چھپی تو مجھے انور بیگ نے فون کر کے کہا کہ کلاسرا صاحب! آپ نے تو امین فہیم کے وزیر اعظم بننے کے امکانات تقریباً ختم کر دیے ہیں۔ میں بڑا حیران ہوا تو وہ بولے کہ آج امین فہیم کی کچھ مغربی سفارتکاروں سے ملاقاتیں تھیں۔ اس خبر کے چھپنے کے فوراً بعد امین فہیم کو بتایا گیا تھا کہ وہ تمام ملاقاتیں چھوڑ کر فوری طور پر نوڈیرو پہنچیں۔ آصف زرداری صاحب ان سے کچھ صلاح مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ بیگ صاحب کا خیال تھا کہ یہ صلاح مشورہ محض بہانہ تھا۔ دراصل زرداری صاحب نہیں چاہتے تھے کہ امین فہیم غیر ملکی سفیروں سے ملیں۔

اس کا مطلب بڑا واضح تھا کہ آصف زرداری کا ذہن تبدیل ہو چکا تھا اور امین فہیم اب اس ملک کے نئے وزیر اعظم نہیں ہوں گے۔

وہی ہوا جس کا اندیشہ انور بیگ نے ظاہر کیا تھا۔ نوڈیرو سے واپسی پر امین فہیم کو اندازہ ہو چکا تھا کہ ان کی کہانی ختم ہو گئی ہے، لیکن انہوں نے بھی آخری لمحوں تک آصف زرداری پر اپنا باور رکھنے کا فیصلہ کیا۔

میں نے انہی دنوں میں امین فہیم کے حق میں خبریں دینا شروع کیں کیونکہ میرا خیال تھا کہ ان کے ساتھ زیادتی ہو رہی تھی۔ یہ آصف زرداری ہی تھے جنہوں نے انہیں خود وزیر اعظم بنانے کی بات کی

تھی اور انہیں اپنے عہدے سے ہٹنا پڑا تھا۔ ان دنوں میرے علاوہ تمام صحافی بھی ان کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ آصف زرداری صاحب چلا رہے تھے۔ کئی صحافی نے ان کے دو بیٹوں کو سوال کرتا تھا تو کئی ایڈیٹوریل کی تحریریں کرتی تھیں اور کوئی بھی ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دن رات ان کا پیچھا کر رہا تھا۔

امین فہیم اور آصف زرداری کے درمیان اختلافات بڑی تیزی سے بڑھتے جا رہے تھے۔ پیپلز پارٹی کے لوگوں کو بھی یہ اندازہ ہونا شروع ہو گیا تھا کہ ہوا کا رخ بدل گیا ہے۔ ایک دن زرداری صاحب نے اسلام آباد کے صحافیوں کو ایف۔ایٹ میں واقع زرداری ہاؤس میں شام کے کھانے پر بلایا۔ بڑے سے لے کر چھوٹے صحافی تک سب وہاں شریک ہوئے۔ ہمارا خیال تھا کہ زرداری صاحب شاید صحافیوں کے منہ سے کچھ باتیں سننا چاہتے تھے۔ یہ علیحدہ کہانی ہے کہ وہ دو گھنٹے تک خود ہی بولتے رہے اور انہوں نے کسی کو بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ کھانے کے بعد صحافی انہیں گھیرے کھڑے تھے۔ اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ یوسف رضا گیلانی اور شاہ محمود قریشی ان کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ زرداری صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ میرے خیال میں انہیں کس کو وزیراعظم بنانا چاہیے؟ میں نے ان سے کہا کہ صحافی ہونے کے ناطے یہ میرا کام نہیں ہے کہ میں انہیں مشورہ دوں کہ وہ کس کو وزیراعظم بنائیں یا کس کو نہ بنائیں۔ یہ بات انہیں اپنی پارٹی کے لوگوں سے پوچھنی چاہیے۔

زرداری صاحب نے اپنی روایتی مسکراہٹ کے درمیان مجھ سے پھر پوچھا کہ نہیں آپ مجھے بتائیں کہ میں کسے وزیراعظم بناؤں۔ میں نے پھر وہی عذر پیش کیا۔

اب کی بار زرداری صاحب نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو ہمیں مشورہ نہیں دینا چاہیے لیکن میں آپ سے خود پوچھ رہا ہوں لہٰذا آپ مجھے بتائیں۔

میرے لیے یہ بڑا مشکل مرحلہ تھا کیونکہ انہی دنوں یہ خبریں آنا شروع ہو گئی تھیں کہ آصف علی زرداری امین فہیم کے بعد احمد مختار، شاہ محمود قریشی اور یوسف رضا گیلانی میں سے کسی ایک کو وزیراعظم بنانا چاہتے تھے۔ گیلانی صاحب اور قریشی صاحب میرے سامنے کھڑے تھے۔ دونوں سے میرا اچھا تعلق تھا۔

میں نے زرداری صاحب سے کہا کہ میرے خیال میں انہوں نے خود ہی یہ اعلان کیا تھا کہ وہ

امین فہیم کو وزیراعظم بنائیں گے لہٰذا انہیں اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیے۔ تاہم میں نے زرداری صاحب کو یاد دلایا کہ انہوں نے اسی طرح ایک وعدہ یوسف رضا گیلانی سے بھی کر رکھا ہے۔

زرداری صاحب نے حیرانی سے میری طرف دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں کہ کونسا وعدہ؟

یوسف رضا گیلانی اور ارد گرد کھڑے صحافیوں نے مجھے چونک کر دیکھا۔ میں نے زرداری صاحب کو یاد دلایا کہ جب احتساب عدالت کے جج نے یوسف رضا گیلانی کو سات سال کی قید سنائی تھی تو وہ اس وقت عدالت میں موجود تھے۔ یہ زرداری صاحب ہی تھے جنہوں نے اونچی آواز میں یہ کہا تھا کہ جج صاحب! آپ یوسف رضا گیلانی کو نہیں بلکہ ملک کے مستقبل کے صدر پاکستان کو سزا سنا رہے ہیں۔

میں نے کہا زرداری صاحب! میرا خیال ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ آپ جج صاحب کو کہے ہوئے اپنے الفاظ پر عملدرآمد کرا سکتے ہیں۔

زرداری صاحب نے میری بات سنی اور فوراً بولے کہ ہاں مجھے یوسف رضا گیلانی سے کیا ہوا اپنا یہ وعدہ یاد ہے۔

اس کھانے سے ہم فارغ ہوئے تو سب پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ اب کسی صورت بھی امین فہیم اس ملک کے وزیراعظم نہیں بننے والے تھے۔ اب مقابلہ یوسف رضا گیلانی، شاہ محمود قریشی اور احمد مختار کے درمیان تھا۔

انہی دنوں حسین حقانی بھی امریکہ سے آئے ہوئے تھے اور ہر وقت وہ زرداری صاحب کے قریب موجود رہتے۔ انہوں نے کچھ عرصہ صحافت کی ہوئی تھی لہٰذا انہیں صحافیوں کی پروفیشنل کمزوریوں کا بھی علم تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کا گر بھی جانتے تھے۔ ان کے خلاف اخبارات میں خبریں آنا شروع ہو گئی تھیں اور وہ چاہتے تھے کہ کسی طریقے سے ان کا تدارک کیا جائے۔ میں بڑا حیران ہوا جب انہوں نے مجھے فون کیا اور بڑے اچھے طریقے سے بات چیت کی اور بڑی کھل کر کہا کہ وہ مجھے اندر کی بہت ساری سیاسی خبریں دے سکتے ہیں لیکن اس کے بدلے میں مجھے تھوڑی کی حد تک ان کے مفادات کا بھی خیال رکھنا پڑے گا۔

مجھے متاثر کرنے کے لیے انہوں نے کہا کہ میں آپ کو ایک ایسی خبر دے رہا ہوں جو کسی کے

پاس نہیں ہے۔ یہ حسین حقانی تھے جنہوں نے مجھے یہ خبر دی تھی کہ یوسف رضا گیلانی ہی اس ملک کے نئے وزیراعظم ہوں گے۔

ان دنوں جب یوسف رضا گیلانی کا نام دور دور تک سننے میں نہیں آتا تھا یہ حسین حقانی ہی تھے جنہیں اس بات کا علم تھا کہ یہ ساری بحث فضول تھی کہ کون وزیراعظم بنے گا۔ اگر کسی نے وزیراعظم بننا تھا تو وہ یوسف رضا گیلانی تھے۔

جس طریقے سے حسین حقانی نے مجھ سے خبروں کا سودا کرنے کی کوشش کی تھی وہ شاید میرے لیے قابل قبول نہیں تھا اور یوں اس ایک واقعے کے بعد میرا ان کا زیادہ رابطہ نہیں رہا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ میں نے یوسف رضا گیلانی کے وزیراعظم بننے کی خبر اخبار میں نہیں دی کیونکہ میرا خیال تھا کہ جب میں حسین حقانی کی خواہش پر ان کے چند مفادات کا خیال نہیں رکھ سکتا تھا تو پھر مجھے ان کی دی ہوئی اس خبر کو چاہے وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہیں تھی استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

امین فہیم بڑی تیزی سے اپنی پارٹی میں تنہا ہوتے جا رہے تھے۔ ان کے تمام ساتھی جن پر وہ بہت بھروسہ کرتے تھے وہ انہیں ایک ایک کرکے چھوڑتے جا رہے تھے۔ امین فہیم نے بھی آخری دم تک لڑنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ قومی اسمبلی میں وزیراعظم کا انتخاب لڑیں گے اور اس کے لیے انہیں آصف علی زرداری کی نامزدگی کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کے چیئرمین ہیں۔ امین فہیم کا خیال تھا کہ سندھ سے بیشتر ایم این اے ان کا ساتھ دیں گے۔ خصوصاً ان کو نوید قمر پر بڑا مان تھا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ہر دفعہ نوید قمر ان کی وجہ سے اپنے حلقے سے جیتتے تھے۔ اگر وہ نوید قمر کے حلقے میں موجود اپنے مریدوں کو انہیں ووٹ ڈالنے کا نہ کہیں تو نوید قمر کبھی نہیں جیت سکتے تھے۔

امین فہیم کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا جھٹکا اس وقت لگا جب نوید قمر نے ان کی نامزدگی کے کاغذات پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ نوید قمر جیسا شخص بھی انہیں اس مشکل مرحلے میں یوں چھوڑ جائے گا۔

اگر پیپلز پارٹی کے دوستوں کے ہاتھوں دھوکا کھانے میں کوئی کسر رہ گئی تھی تو وہ راجہ پرویز اشرف نے پوری کر دی۔ یہ وہی راجہ پرویز اشرف تھے جو سینیٹر انور بیگ کے گھر پر رات کو دی گئی پارٹی میں اکیلے اس وقت احتراماً کھڑے ہو جاتے جب امین فہیم باتھ روم جانے کی نیت سے صوفے سے

اٹھتے۔ جب امین فہیم باتھ روم سے واپس لوٹتے تو بھی راجہ پرویز اشرف ایک دفعہ پھر احتراماً کھڑے ہو جاتے تاکہ امین فہیم کو پتہ چلے کہ وہ ان کی دل سے کتنی عزت کرتے ہیں۔ تاہم جب امین فہیم کو ان کی ضرورت پڑی تو راجہ پرویز اشرف نے ان کا فون تک سننے سے انکار کر دیا۔

امین فہیم بھول گئے تھے کہ بینظیر بھٹو مر چکی تھیں۔ اب آصف علی زرداری پارٹی کے صدر ہیں اور نوید قمر اور راجہ پرویز اشرف جیسے لوگ نئے بادشاہ کے درباری بن چکے تھے۔ اگر اس وقت کوئی بھی شخص امین فہیم کے ساتھ اپنی پوری طاقت کے ساتھ کھڑا تھا تو یہ انور بیگ تھے۔ ان دونوں کی دوستی کراچی میں 1960ء کی دہائی میں شروع ہوئی تھی۔ اپنی دوستی کو یادگار رنگ دینے کے لیے دونوں نے اپنے بڑے بیٹوں کے نام نجیب رکھے تھے۔ آج ان دونوں کے بیٹے ان کی دوستی کی طرح اپنی عمر کی چالیس سے زیادہ بہاریں دیکھ چکے ہیں۔

انور بیگ کے اسلام آباد کے میڈیا اور ڈپلومیٹک انکلیو میں بے پناہ تعلقات تھے جس کا سارے کا سارا فائدہ امین فہیم کو ہو رہا تھا۔ انور بیگ کے ان تعلقات کی وجہ سے ہی امین فہیم کو عوام میں ہمدردیاں مل رہی تھیں اور یہ سمجھا جا رہا تھا کہ زرداری صاحب نے ان کے ساتھ زیادتی کی ہے۔

آصف علی زرداری کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ اس وقت امین فہیم کے ساتھ اگر کوئی شخص اپنی دوستی نبھا رہا ہے تو وہ سینیٹر انور بیگ ہیں۔ زرداری صاحب نے اپنے قریبی دوست فیصل بٹ کو ایک رات انور بیگ کے گھر بھیجا اور انہیں بڑا دوستانہ مشورہ دیا کہ وہ امین فہیم کی حمایت سے باز آ جائیں اس کے بدلے میں ان کا خیال رکھا جائے گا۔

انور بیگ اپنی پارٹی کے لیڈروں، نوید قمر اور راجہ پرویز اشرف کی طرح، سیاست نہیں سمجھتے تھے۔ انہیں یہ پتہ نہیں تھا کہ سیاستدان دوستیوں کے لیے نہیں بلکہ اقتدار کے لیے سیاست کرتے ہیں۔ انہوں نے بڑی شائستگی سے فیصل بٹ کو یہ کہا کہ وہ امین فہیم کے چالیس سال پرانے دوست ہیں اور اس مرحلے پر محض سیاسی مفادات کے لیے ان سے تعلقات ختم کرنا ان کے لیے مشکل ہے۔

یوں زرداری صاحب کا یہ پیغام ٹھکرا کر انور بیگ نے دوستی کے نام پر اپنا سیاسی کیریئر تباہ کر لیا تھا۔ ان کے نزدیک ان کی دوستی ان کے سیاسی کیریئر سے زیادہ اہم تھی۔

وقت آگے نکل گیا تھا۔ یوسف رضا گیلانی وزیراعظم بن چکے تھے۔ آصف علی زرداری ابھی

کہ انور بیگ سے ملنے ہالا گئے تھے۔ انہوں نے انور بیگ کو ایک پیغام بھیجا کہ وہ سینیٹ کی سیٹ سے استعفیٰ دے دیں۔ تاہم زرداری نے صورتحال کو سنبھال لیا۔ انہوں نے صدر صاحب کو بتایا کہ کچھ دنوں بعد انور بیگ صاحب ویسے بھی سینیٹ سے مارچ 2009ء میں ریٹائر ہو رہے ہیں۔ اگر ان سے اس وقت استعفیٰ لیا گیا تو یہی سمجھا جائے گا کہ انہیں امین فہیم کے ساتھ دوستی کی سزا دی جا رہی ہے۔ یوں زرداری صاحب کو یہ بات سمجھ میں آ گئی اور انہوں نے انور بیگ کے استعفیٰ پر زیادہ اصرار نہیں کیا۔

جب مارچ کے مہینے میں نئے سینیٹرز کے لیے انتخابات ہونے لگے تو انور بیگ ٹکٹ اپلائی کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کا دل اس وقت بے طرح ٹوٹ گیا جب انہیں یہ پتہ چلا کہ مخدوم امین فہیم نے ان کی بجائے سندھ سے دو تین اور لوگوں کا نام ٹکٹ کے لیے دیا تھا۔ انہیں اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان کا چالیس سال پرانا دوست ان کے ساتھ اس طرح کی حرکت کر سکتا ہے۔ تاہم کچھ لوگوں نے انور بیگ کو سمجھایا کہ انہیں پارٹی ٹکٹ کے لیے ضرور اپلائی کرنا چاہیے۔ یہ ضرور تھا کہ انہیں ٹکٹ نہیں ملے گا لیکن کم از کم یہ بوجھ پیپلز پارٹی کے کندھوں پر رہے گا کہ انہوں نے انہیں ٹکٹ دینے سے انکار کیا تھا۔ وہی ہوا آصف علی زرداری صاحب نے انور بیگ کو ٹکٹ دینے سے انکار کر دیا۔

کچھ عرصے بعد کسی دوست نے آصف علی زرداری سے انور بیگ کو ٹکٹ نہ دینے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک نہ رکھنے کی شکایت کی تو انہوں نے آگے سے یہ کہا کہ آپ اس بات پر شکر کریں کہ انور بیگ ابھی تک زندہ ہے۔

انور بیگ کے بعد یوسف تالپور بھی ان لیڈروں میں سے تھے جو امین فہیم کے حامی تھے اور وہ اپنی اس حمایت کو کھل کر بیان بھی کرتے۔

اسی اثناء میں یہ خبریں آنا شروع ہو گئیں کہ امین فہیم کے لیے اقتدار سے باہر رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ ان کے گھر سے ان پر یہ پریشر پڑنا شروع ہوا کہ وہ کس چکر میں پڑ گئے ہیں۔ بارہ سال بعد پیپلز پارٹی اقتدار میں آئی ہے۔ وہ دن رات بینظیر بھٹو کے لیے بھاگ دوڑ کرتے رہے تھے اور آج جب پھل کھانے کا وقت آیا تو وہ اقتدار سے باہر ہیں۔ گھر کے خرچ چلانا بھی ذرا مشکل لگ رہا تھا۔ اب انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آصف علی زرداری کو کیسے راضی کیا جائے۔ آخر مخدوم صاحب کی کراچی والی بیگم کو ایک طریقہ سمجھ میں آیا۔ انہوں نے سندھی روایات کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ کراچی سے جہاز پکڑا اور

پہنچیں ایوان صدر گئیں۔ اپنے بھائی آصف علی زرداری سے ملیں۔ اپنے خاوند کی غلطیوں پر ایک بہن کے ناطے سے معذرت کی۔ اب ایک سندھی بلوچ کے لیے یہ مشکل ہو گیا تھا کہ وہ مخدوم امین فہیم کی بیوی کی منت زاری کو نظر انداز کرتا۔

یوں ایک بلوچ سردار نے طالب المولیٰ کے اس بیٹے کو معاف کر کے وزیر بنا دیا جس نے کبھی اپنے باپ کو بھٹو کی پارٹی جائن کرنے کے لیے پتہ نہیں کتنے ترلے ڈال کر راضی کیا تھا اور بھٹو صاحب نے ایک بڑا تاریخی جملہ کہا تھا کہ مخدوم آف ہالا کا ان کی پارٹی میں آنے سے وہ سندھ میں اپنا آدھے سے زیادہ الیکشن جیت گئے ہیں۔ آج اسی مخدوم طالب المولیٰ کی بہو ذوالفقار علی بھٹو کے داماد سے اپنے شوہر کی جان بخشی اور اسے کسی مال بنانے والی وزارت کا وزیر بنانے کی درخواست کر رہی تھی۔

آصف علی زرداری

مجھے سیاستدانوں کے انکشافات پر مبنی سیاسی پروفائل کرتے ہوئے کچھ ماہ گزر گئے تھے۔ یہ سلسلہ بڑی تیزی سے دی نیوز کے قارئین میں پاپولر ہو رہا تھا۔ اردو اخبارات بھی ان پروفائلز میں سے سنسنی خیز خبریں نکال کر اور ان کا ترجمہ کر کے چھاپ رہے تھے۔ کالم نگار دوستوں نے بھی دھیرے دھیرے کالموں میں ذکر کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان سب کے لیے یہ نئی چیز تھی کہ ماضی کے سیاستدانوں کے سینوں میں اتنے راز چھپے ہوئے تھے جو اب دھیرے دھیرے باہر نکل رہے ہیں۔

آصف زرداری ان دنوں جنرل مشرف کے زیر عتاب تھے۔ غلام اسحٰق خان سے لے کر نواز شریف، فاروق لغاری اور اب جنرل مشرف نے آصف زرداری کو سیدھا کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا تھا۔ ہر ایک نے اپنے اپنے دور میں آصف زرداری پر کیسز بنائے۔ انہیں جیلوں میں رکھا اور انہیں اپنے تئیں سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ سرکاری وکیلوں اور ان مقدمات پر کروڑوں روپے خرچ کیے گئے۔ ایک دفعہ تو باقاعدہ آڈیٹر جنرل پاکستان نے اپنی ایک رپورٹ میں آصف زرداری پر بنائے گئے ان مقدمات پر خرچ ہونے والے کروڑوں روپوں کو قومی خزانے پر ایک بوجھ اور غیر قانونی قرار دیا تھا۔ جب میں نے وہ رپورٹ چھاپی تھی تو سینیٹر رضا ربانی نے پڑھ کر اس کی کاپی مجھ سے مانگی تھی۔ اب یہ نہیں پتہ کہ انہوں نے اس سرکاری دستاویز کا کیا استعمال کیا تھا۔

آصف زرداری کی میڈیا کے لوگوں کے ساتھ ایک عجیب سی Love and hate ریلیشن شپ رہی ہے۔ جب وہ جیل سے باہر ہوتے ہیں تو مجھ جیسے میڈیا کے لوگ اپنا تن من دھن صرف اس بات پر خرچ کر دیتے ہیں کہ وہ کسی طریقے سے انہیں دنیا کا سب سے بڑا کرپٹ شخص ثابت کر کے جیل بھجوا دیں۔ جب زرداری صاحب جیل جاتے ہیں تو کچھ عرصے بعد میڈیا کو پتہ چلتا ہے کہ دراصل انہیں تو تھوڑا اسٹیبلشمنٹ نے محض استعمال کیا تھا کیونکہ اب وہ انہیں جیل میں رکھ کر بینظیر بھٹو کو اپنی مرضی کی شرائط پر ڈیل کرنے کے لیے مجبور کر رہے تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے یہ احساس بڑھنا شروع ہو جاتا ہے کہ جناب آصف علی زرداری صاحب تو مرد حُر تھے۔ وہ نہ تو نواز شریف کے دور کے احتساب سیل کے انچارج سینیٹر سیف الرحمن کی طرح عدالتوں میں بھاں بھاں کر کے روتے تھے اور نہ ہی نواز شریف اور شہباز شریف کی طرح جنرل مشرف کو تحریری معافی نامے دے کر ایک ڈیل کے ذریعے سعودی عرب دس سال کے لیے فرار ہوتے تھے۔

آصف زرداری کی شکل میں ہمارے میڈیا کے پاس ایک ایسا دیومالائی کردار آ گیا تھا جو عدالتوں میں پیشیوں کے وقت نواز شریف یا سیف الرحمن کی طرح رونے دھونے کے بجائے چہرے پر ایک لمبی مسکراہٹ طاری کیے ہر ایک سے ملتا تھا۔ نواز شریف اور شہباز شریف کے ڈیل کر کے ملک سے چلے جانے کے بعد لوگوں کی آنکھوں میں آصف زرداری کی قدر و اہمیت اور بڑھ گئی تھی۔ بینظیر بھٹو اپریل 1999ء میں نواز شریف کی احتساب عدالتوں کے خوف سے پہلے ہی ملک چھوڑ کر جا چکی تھیں۔ بچے کھچے دو نمبری سیاستدان چوہدری شجاعت کی قیادت میں جنرل مشرف کے دربار میں پی ایم ایل کیو کی بنیادیں رکھ کر ایک فوجی ڈکٹیٹر کے ہاتھوں پر بیعت کرنا شروع ہو گئے تھے۔ یوں لوگوں اور میڈیا کو یہ محسوس ہوا کہ آصف زرداری کرپٹ سہی لیکن بزدل ہرگز نہیں ہے، جس نے ایک بہادر بلوچ کی طرح کوئی ڈیل کر کے ملک سے فرار ہونے کی بجائے اپنے ملک کی جیل میں رہنا پسند کیا تھا۔ یہ علیحدہ کہانی ہے کہ کچھ عرصے بعد آصف زرداری صاحب اس وقت کے ڈی جی ایم آئی ندیم تاج کے ساتھ خفیہ ملاقاتیں کر کے ایک ڈیل کے ذریعے رہا ہو کر نیویارک پہنچ گئے اور پھر وہ تین سال بعد دسمبر 2007ء میں پاکستان واپس لوٹے جب بینظیر بھٹو قتل ہوئیں اور اب وہ اس ملک کے صدر ہیں۔

میرے صحافی دوست محسن رضا نے دو تین دفعہ مجھے کہا کہ تم آصف زرداری کا ایک پروفائل

انٹرویو اپنے اخبار کے لیے کیوں نہیں کرتے۔ فرحت اللہ بابر نے بھی ایک دو موقعوں پر کچھ ایسی ہی بات کی۔ میں نے دونوں سے کہا کہ ٹھیک ہے، آپ میری زرداری صاحب سے ملاقات کرا دیں اور میں یقیناً یہ انٹرویو کروں گا۔ یوں جون 2003ء کی ایک تپتی دوپہر میں میں راولپنڈی کی احتساب عدالت کے احاطے میں پہنچ گیا جہاں آصف زرداری ایک درخت کے نیچے صحافیوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ پیپلز پارٹی کے پرانے جانثار کارکن قاسمی سلطان محمود بھی وہاں موجود تھے۔ محسن رضا اور شعیب بھٹہ نے میرا آصف زرداری سے تعارف کروایا۔ انہوں نے مجھے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ اتنی دیر میں حامد میر وہاں آ گئے۔ وہ دونوں وہاں سے اٹھ کر ایک فاصلے پر ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں گفتگو کرنے لگے اور میں صحافی دوستوں کے ساتھ ان کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ حامد میر سے گفتگو کر کے واپس لوٹے تو اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گئے۔ میرا ایک دفعہ پھر ان سے تعارف کروایا گیا۔ انہوں نے خاموشی سے مجھے دیکھا۔ میرے ہاتھ سے موبائل فون لے لیا۔ میں نے سمجھا وہ شاید کسی کو ٹیلی فون کرنا چاہ رہے ہیں۔ چند لمحوں تک وہ فون کو ٹٹولتے رہے اور پھر مجھے واپس کر دیا۔ ابھی مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر میری جیب سے پین نکال لیا۔ وہ اس پین کو موبائل فون کی طرح کچھ دیر چیک کرتے رہے اور پھر مجھے واپس کر دیا۔ مجھے فوری طور پر کچھ سمجھ نہ آئی کہ آخر زرداری صاحب میرا فون اور قلم کیوں چیک کر رہے ہیں۔ اچانک میرے ذہن میں فلیش ہوا۔ دراصل زرداری صاحب میری تلاشی لے رہے تھے۔ وہ یہ دیکھنا چاہ رہے تھے کہ میں موبائل فون پر ان کی گفتگو ٹیپ تو نہیں کر رہا تھا یا اسی طرح پین میں کوئی ایسی ڈیوائس تو نہیں لگی ہوئی تھی جس سے ساری بات چیت محفوظ ہو رہی تھی۔ مجھے ایک لمحے کے لیے بڑی شدید کوفت ہوئی۔ کوشش کے باوجود مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے زرداری صاحب کو کہہ دیا کہ سر! اصل بات تو یہ ہے کہ میں آپ کا انٹرویو نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آپ کے انتہائی قریبی دوستوں نے مجھے اس بات پر راضی کیا کہ مجھے آپ سے مل کر آپ کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی کہانی قلمبند کر کے اپنے اخبار میں چھاپنی چاہیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایک صحافی ہونے کے ناطے یہ میرا حق بنتا ہے کہ میں اپنی جیب سے کوئی بھی ٹیپ ریکارڈر نکال کر آپ کے سامنے رکھ دوں تاکہ جو بھی گفتگو ہو وہ ریکارڈ پر ہو۔ پھر مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں موبائل فون میں چپکے سے ریکارڈنگ آن کر کے اس ساری گفتگو کو محفوظ کر لوں۔

زرداری صاحب نے میری طرف دیکھا اور بولے کہ سائیں ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ پہلی دفعہ مجھ سے مل رہے ہیں۔ میں آپ کو نہیں جانتا آپ مجھے نہیں جانتے۔ میری اور آپ کی یہ پہلی ملاقات ہے۔ کسی پر اعتماد کرنے یا اس کا اعتماد جیتنے کے لیے وقت لگتا ہے۔ آپ آتے جاتے رہیں گے تو ہمیں آپ پر بھی بھروسہ ہو جائے گا۔

مجھے خیال آیا کہ اس میں آصف زرداری کا کوئی قصور نہیں تھا۔ جب آپ سات سال ہر وقت اپنے اردگرد پولیس کی وردیاں پہنے اجنبی لوگوں میں سوتے جاگتے ہیں اور آپ کو کوئی پتہ نہیں ہوتا کہ ان میں سے کون جاسوس ہے اور کون محض اپنی ڈیوٹی دے رہا ہے تو پھر انسان کا اس طرح کا رویہ ہو ہی جاتا ہے۔

باتوں باتوں میں میں نے ان کے پوچھنے پر بتایا کہ میں نے انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کیا ہوا ہے تو وہ تھوڑے سے حیران ہوئے اور مجھ سے پوچھا کہ پھر تم جرنلزم میں کیا کر رہے ہو۔

اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا وہ خود ہی بول پڑے کہ ہاں ٹھیک ہے کہ جب آپ زندگی میں کسی بھی شعبے میں جانا چاہتے ہیں تو پھر پریکٹیکل لائف آپ کو سب کچھ سکھا دیتی ہے۔

مجھے کسی نے بتایا تھا کہ آصف زرداری بڑی اچھی سرائیکی بول لیتے ہیں۔ اس لیے میں نے بھی ان کا اعتماد جیتنے کے لیے سرائیکی میں گفتگو شروع کی تو میں نے محسوس کیا کہ ان کا رویہ میری طرف کچھ بدل گیا ہے۔ انہوں نے تھوڑا ہی سہی لیکن مجھ پر اعتماد کرنا شروع کر دیا تھا۔

ایک بات واضح تھی کہ آصف زرداری کی شخصیت میں جیل جانے کے بعد بڑی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور مسکرا کر بولے کہ کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک Gladiator ہوں جو اپنے لوگوں کو ایک ظالم بادشاہ کے شکنجوں سے آزاد کرانے کے لیے ایک لمبی جنگ لڑ رہا ہے۔ وہ پیپلز پارٹی کے ایک ایسے جنگجو تھے جنہیں جب بھی پارٹی چاہے کسی بھی کام کے لیے استعمال کر سکتی ہے۔ چاہے وہ جیل کے اندر ہوں یا باہر۔

آصف زرداری سے جوں جوں باتیں ہونا شروع ہوئیں تو محسوس ہوا کہ وہ پیپلز پارٹی کے لیے ایک طرح کا مزاحمت کا نشان بن کر ابھرے تھے۔ ابھی بھی ان کے اردگرد سندھ اور پنجاب کے بہت سارے ورکرز کھانے پینے کی چیزیں لے کر بیٹھے ہوئے تھے۔ آصف زرداری ان مٹھائیوں کے ڈبوں

میں سے مٹھائی اٹھا کر ایک ایک ورکر کو خود کھلا رہے تھے۔ ان کی بات سن رہے تھے اور یوں تاثر دے رہے تھے جیسے وہ ہر ایک کے خیالات کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اس دوران وہ ٹیلی فون پر بھی مسلسل لوگوں سے بات چیت کر رہے تھے۔

آصف زرداری کو اپنے ورکروں اور دوستوں کے درمیان بیٹھا دیکھ کر میرے ذہن میں ایک ہی بات آ رہی تھی کہ ہو سکتا ہے کہ جیل کے آٹھ سالوں نے ان سے ہر چیز چھین لی ہو، لیکن انہوں نے اپنی مسکراہٹ کسی کو نہیں چھینے دی تھی۔ اس مسکراہٹ سے پارٹی کے لیڈروں اور ورکروں کو ایک ہی پیغام ملتا تھا کہ ابھی آصف زرداری نے ہتھیار نہیں ڈالے ہیں۔

جب میں نے آصف زرداری سے بات چیت کرنے کی کوشش کی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے زیادہ بات چیت کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ میں ان سے ان کی ابتدائی زندگی اور بعد کے سالوں کے ان پہلوؤں پر بات کرنا چاہ رہا تھا جو ابھی تک لوگوں کی آنکھوں سے پوشیدہ تھے۔ جب میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو وہ کچھ دیر مجھے دیکھتے رہے اور بولے کہ سائیں! یہ ساری باتیں دہرانے کا کیا فائدہ۔ یہ سب کچھ تو بہت پہلے چھپ چکا ہے۔ میں نے پھر بھی اپنی کوشش جاری رکھی لیکن وہ ہر سوال کا بڑا مختصر جواب دے کر بات کو ٹال جاتے۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ ان کے ذہن میں ابھی کچھ Reservations باقی تھیں اور وہ اتنی آسانی سے ایک ایسے صحافی پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں تھے جو ان سے زندگی میں پہلی دفعہ مل رہا ہو۔

باتوں باتوں میں، میں نے محسوس کیا کہ وہ چند صحافیوں سے خوش نہیں تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہ ان کے خلاف تیار ہونے والی سازش کا حصہ تھے اور ان کے خلاف جھوٹی کہانیاں چھاپتے رہے تھے۔ انہوں نے ایک پاکستانی ایڈیٹر کا بھی نام لیا جس نے اپنے اردو اخبار میں اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ وہ آصف زرداری کے امیج کو خراب کرنے والی مہم میں شریک تھا۔

آصف زرداری کے بقول جیل میں رہنے کا انہیں سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا تھا کہ ان کی شخصیت میں بہت زیادہ ٹھہراؤ آ گیا تھا جو ان میں 1996ء سے پہلے نہیں تھا۔ انہیں محسوس ہوتا تھا کہ ان کی شخصیت بدل گئی ہے۔ جیل میں لمبا عرصہ گزارنے کے بعد ان کی شخصیت پر کچھ اہم اور مثبت اثرات مرتب ہوئے تھے۔ اب وہ مذہب اور روحانیت کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ اب وہ کسی بھی بات کو غصے میں آئے بغیر اس کی تشریح کر سکتے ہیں اور کسی سے غصہ یا بغض بھی نہیں رکھتے ہیں۔

آصف زرداری بولے کہ تمہیں پتہ ہے کہ جیل کی زندگی قیدی کا روزانہ امتحان لیتی ہے۔ آپ کو روزانہ ان طاقتور لوگوں سے لڑ کر زندہ رہنا پڑتا ہے جنہوں نے آپ کو جیل میں ڈالا ہوا ہوتا ہے۔ تاہم، خدا نے ان کے اندر ایک ایسی طاقت بھر دی تھی جس کی وجہ سے وہ جیل کی زندگی کو بڑے صبر اور بہادری کے ساتھ جھیل رہے تھے۔ انہوں نے جیل میں آنے سے پہلے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ ان کے اندر اتنی بہادری آ جائے گی۔

میرے لیے حیرانی کی بات یہ تھی کہ آصف زرداری کے دل میں ان لوگوں کے خلاف کوئی شکایت یا بغض نہیں تھا جنہوں نے ان پر مقدمات بنا کر انہیں جیل میں ڈالا تھا۔ جب میں نے ان سے سیف الرحمٰن کے بارے میں بات کرنا چاہی جن کی وجہ سے آج وہ جیل میں بیٹھے تھے تو آصف زرداری صرف اتنا بولے کہ چھوڑو یار سیف الرحمٰن محض ایک ایس ایچ او تھا۔ اس طرح کے پولیس ایس ایچ اوز روزانہ پورے پاکستان میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی میری زندگی میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ اب کون ان کے بارے میں بیٹھ کر سوچتا رہے۔

میں نے ہمت نہیں ہاری اور دوسرا سوال داغا کہ کیا اس ایس ایچ او سیف الرحمٰن نے ان کے خلاف جھوٹے کیس بنانے پر ان سے معافی مانگی تھی تو آصف زرداری بولے کہ نہ صرف اس ایس ایچ او نے بلکہ اس کے ماسٹر نواز شریف نے بھی بقول ان کے یہ گناہ کرنے پر معافی مانگی تھی۔ چوہدری نوید نواز شریف کا ایک پیغام لے کر ان کے پاس کراچی جیل آئے تھے اور ان سے معافی مانگی تھی۔ نواز شریف نے چوہدری نوید کو کہا تھا کہ وہ آصف زرداری سے جا کر درخواست کریں کہ وہ انہیں معاف کر دیں۔

میں نے زرداری صاحب سے پوچھا پھر انہوں نے نواز شریف کی اس درخواست پر کیا کہا تھا۔ آصف زرداری نے روایتی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجائی اور بولے کہ میں نے اسی لمحے یہ سوچے بغیر کہ انہوں نے میرے ساتھ کیا کیا تھا انہیں معاف کر دیا۔

میں نے آصف زرداری کے مختصر جوابات کے باوجود ہمت نہیں ہاری اور ان سے بات چیت میں لگا رہا تا کہ ان کے ماضی کی کہانی اپنے قارئین کے سامنے لا سکوں۔

میں نے ان سے پوچھا کہ غلام اسحق خان سے لے کر نواز شریف، فاروق لغاری، جنرل پرویز مشرف اور اب حالی کی حکومتوں کے درمیان جیلوں میں ان سے کیا سلوک ہوتا رہا۔ ان تمام حکمرانوں میں ان کے ساتھ جیل میں سب سے بہتر سلوک کس نے کیا تھا۔

زرداری صاحب نے جواب دیا کہ جیل جیل ہوتی ہے چاہے اس میں آپ کو دنیا بھر کی تمام سہولتیں ہی کیوں نہ فراہم کردی جائیں۔ ان تمام حکمرانوں نے انہیں جیل میں توڑنے کی پوری کوشش کی لیکن اللہ کے کرم سے وہ اپنے پیروں پر کھڑے رہے۔

اچانک میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ زرداری صاحب کے بچوں نے اپنے قیدی باپ کے جیل جانے کے بعد اپنے آپ کو کیسے ایڈجسٹ کیا ہوگا۔ میرا سوال سن کر وہ بولے کہ میرے بچوں نے 1990ء سے لے کر اب تک مجھے زیادہ وقت جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہی دیکھا ہے۔ جب وہ بڑے ہو رہے تھے تو میں جیل بیٹھا تھا۔ انہیں یہ علم نہیں تھا کہ ان کے باپ کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ان کی سب سے چھوٹی بیٹی آصفہ ہر وقت یہ اصرار کرتی تھی کہ وہ دوسرے بچوں کے بابا کی طرح ہر وقت ان کے ساتھ کیوں نہیں رہتے۔ ایک جج انہیں رہا کرنے پر کیوں تیار نہیں ہے۔ ایک دن تو حالت یہ ہوگئی کہ آصفہ نے اپنے باپ کو کہا کہ آج تو وہ اسے اپنے ساتھ جج کے پاس لے کر جائیں۔ وہ اس سے خود لڑائی کرے گی کہ آخر وہ اس کے باپ کو چھوڑنے پر کیوں تیار نہیں ہے۔ آصفہ نے اپنے باپ سے کہا کہ کیا اس جج کو یہ احساس نہیں ہے کہ ہمیں آپ کی کتنی ضرورت ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ اپنے بچوں کی باتیں کرتے ہوئے آصف زرداری جو ابھی تھوڑی دیر پہلے مسلسل مسکرا رہے تھے وہ صرف سنجیدہ بالکل جذباتی ہو گئے تھے بلکہ ان کے اندر کا باپ یکدم اپنے ارد گرد بیٹھے صحافیوں اور سیاسی ورکروں کے درمیان سیاستدان پر حاوی ہو گیا تھا۔ زرداری صاحب [illegible]

ذرا چھوڑنی شروع ہونے لگی تو وہ اپنے پارٹی ورکرز کی اپنے لیے محبت اور ان کی قربانیوں کو یاد کرکے اپنے آپ کو حوصلہ دیتے۔

انہوں نے بات کا رخ بدلا اور مجھے بتانے لگے کہ تمہیں علم ہے کہ انہیں جیل میں رکھ کر بہت سارے لوگوں نے بڑے بڑے فائدے اٹھائے تھے۔ چاہے وہ پولیس والے ہوں، جیلر یا پھر جج۔ ان سبھوں نے ان طاقتور لوگوں سے بڑے بڑے فائدے اٹھائے تھے جو اسے جیل میں رکھنے کے خواہاں تھے۔ ان سب کو مجھے جیل میں رکھنے کے عوض اور مجھ پر تشدد کرنے کے لیے پروموشنز اور انعامات مل رہے تھے۔ بہت سارے لوگوں کی کمائیاں صرف اس لیے ہو رہی تھیں اور ان کے گھروں میں چولہا جل رہا تھا کہ انہوں نے زرداری کو جیل میں رکھا ہوا ہے۔

آصف زرداری مسکرائے اور بولے کہ باقی باتیں چھوڑیں۔ اور تو اور، اس ملک کے مختلف حکمران بھی انہیں جیل میں رکھنے کے عوض ملک پر حکمرانی کر رہے تھے۔ وہ اپنے اقتدار کو یہ جواز فراہم کر رہے تھے کہ انہوں نے آصف زرداری جیسے شخص کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے رکھا ہوا ہے۔

وہ کہہ رہے تھے کہ میرے لیے تو یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ انہیں جیل میں رکھ کر بہت سارے خاندانوں کا روٹی پانی چل رہا تھا ورنہ پانچ ارب کی اس آبادی میں ایک شخص کی کیا اہمیت ہے۔

میں نے زرداری صاحب سے پوچھ لیا کہ کیا انہوں نے کبھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے بیٹھ کر یہ نہیں سوچا کہ بہت ہو گیا تھا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ جیل سے باہر آنے کے لیے ایک ڈیل کر لیں۔

ان کا بے ساختہ جواب تھا نو۔

آصف زرداری کہنے لگے کہ جیل نے انہیں ایک عجیب سی توانائی دی ہے جو انہیں جھکنے پر نہیں طاقتور لوگوں سے لڑنے پر ہر وقت تیار رکھتی ہے۔ اصل بہادری یہ نہیں ہے کہ کسی کو پوری طاقت کے ساتھ کچل دیا جائے جیسا وہ جیل جانے سے پہلے خود بھی یہی سوچتے تھے۔ [illegible] جیل میں رہنے کے بعد انہوں نے یہ سیکھا ہے کہ اصل بہادری یہ ہوتی ہے کہ آپ اپنے سامنے کھڑے طاقتور شخص کے [illegible] کیسے برداشت کرتے ہیں [illegible]

وہ مجھے بتانے لگے کہ [illegible] 1978ء [illegible]

سوسائٹی ایک ایسے مرحلے سے گزر رہی ہے جس میں لوگ اب ڈکٹیٹرشپ سے سویلین رول کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ اس طرح کی یہ سیاسی تبدیلی پاکستان میں پہلی دفعہ نہیں ہو رہی ہیں بلکہ اگر دیکھا جائے تو دنیا کے دیگر ممالک میں بھی اس طرح کی لڑائیاں لڑی جا رہی ہیں۔ انسانی تاریخ میں ایسے بہت سارے لوگوں کو پھانسیاں دی گئیں جنہوں نے اپنے دور کے ڈکٹیٹرز اور طاقتور لوگوں کے خلاف بغاوتیں کی تھیں۔ بہت سارے ممالک میں تو ایسے لوگوں کو آگ میں جلایا بھی گیا۔ سو اگر آج ان کے ساتھ یہ سب سلوک روا رکھا جا رہا ہے تو اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں۔ ان کے بقول آزادی حاصل کرنے کے لیے بہت قربانیاں دینی پڑتی ہیں اور وہ بھی اپنے حصے کی قربانی دے رہے ہیں اور اس قربانی کے ذریعے وہ لوگوں کو ڈکٹیٹرشپ سے آزادی دلوانا چاہتے ہیں۔

آصف زرداری تھوڑا سا آگے جھکے اور مجھے دیکھ کر بولے کہ ڈکٹیٹرز سیاستدانوں کی توہین کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنے مقاصد کے لیے انہی سیاستدانوں کو استعمال بھی کرتے رہے ہیں۔ یہ اسٹیبلشمنٹ کا ایک پرانا طریقہ کار رہا ہے کہ عوام میں مقبول لیڈروں پر کرپشن کے چارجز لگا کر انہیں بدنام کر کے اقتدار [illegible] سیاستدانوں کے کھاتے میں ڈال [illegible] آپ میرا ایک کیس ہی دیکھ لیں کہ [illegible] کرنے کے لیے [illegible] کی ڈیوٹی لگائی گئی تھی۔ وہ [illegible] ثابت نہیں ہو سکی۔

میں نے پھر بات کا رخ موڑا اور ان سے پوچھا کہ زرداری صاحب! آپ کو کیسا لگتا ہے کہ آپ ایک ایسی خاتون کے شوہر ہیں جو اس ملک کی دو دفعہ وزیر اعظم رہی ہیں تو وہ بولے کہ یہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا اور اہم تجربہ تھا۔ وہ مجھے بتانے لگے کہ دنیا بھر میں وزیر اعظم کے خاوند یا ان کی بیویوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ شروع میں تو انہیں وزیر اعظم کا شوہر ہونے کی وجہ سے بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ سیاسی لیڈرز، [illegible] اور حتیٰ کہ وزرا بھی انہیں وزیر اعظم کا خاوند تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے۔ ان کے نزدیک وزیر اعظم کے شوہر ہونے کی جاب بہت مشکل تھی تاہم انہوں نے بہت جلد ان تمام نئی ذمہ داریوں کے ساتھ اپنے آپ کو ایڈجسٹ کر لیا۔

میں نے زرداری صاحب سے نسبتاً زیادہ مشکل سوال پوچھ لیا کہ بہت سارے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ انہوں نے بینظیر بھٹو کے لیے بے پناہ مسائل کھڑے کیے تھے اور دراصل اس خاتون نے ان کی وجہ سے بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کیا تھا۔ زرداری صاحب نے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا، تھوڑی دیر وہ چپ رہے اور پھر بولے کہ یہ سارا بھٹو فیملی کے مخالفین کا پروپیگنڈا ہے۔ ان کے بقول جنرل ضیاء کے سیکرٹری انفارمیشن جنرل مجیب الرحمٰن کا یہ کارنامہ تھا جنہوں نے بھٹو خاندان کے خلاف اجتماعی غلیظ مہم شروع کی تھی۔ جنرل مجیب کا مقصد یہ تھا کہ میرے ذریعے بھٹو فیملی کو بدنام کیا جائے اور پچھلے دس سالوں میں یہ کام بڑی خوبصورتی سے آگے بڑھایا گیا تھا، لیکن وہ یہ بات بھول گئے تھے کہ بھٹو ازم لوگوں کی روحوں میں آج بھی باقی ہے۔

میں نے ان سے کہا کہ پھر آج فیصل صالح حیات جیسے پارٹی کے پرانے لیڈر یہ کہہ کر کیوں پیپلز پارٹی چھوڑ رہے ہیں کہ بھٹو ازم اس دن دفن ہو گیا تھا جس دن بینظیر بھٹو نے 1988ء میں اس وقت کی اسٹیبلشمنٹ سے ڈیل کر کے اقتدار لے لیا تھا۔

آصف زرداری بولے کہ دراصل فیصل صالح حیات جیسے لوگ پارٹی کے ساتھ غداری کو جواز فراہم کرنے کے لیے اس طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ سب لوگ جانتے تھے کہ پیپلز پارٹی کے اس گروپ نے جنرل مشرف کے ہاتھ پر بیعت اس لیے کی تھی کہ انہیں اقتدار چاہیے تھا اور وہ غداری کے مرتکب ہوئے تھے۔ اب انہیں بھٹو ازم اور پارٹی لیڈرشپ میں ہر طرح کی خامیاں نظر آئیں گی۔ یہ تو کوئی انوکھی بات نہیں تھی اور نہ ہی پہلی دفعہ کسی لیڈر نے بھٹو کی پارٹی سے غداری کر کے اس طرح کا جواز پیش کیا تھا۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے زرداری صاحب نے مجھے ایک واقعہ سنایا کہ جب ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے خلاف فوج نے بغاوت کی تو مولانا کوثر نیازی نے بھی یہی کچھ کیا تھا۔ انہوں نے بھٹو سے غداری کر کے جنرل ضیاء کو جائن کر لیا۔ مولانا کوثر نیازی نے اس وقت بھی یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ بھٹو کی جان بچانے کے لیے جنرل ضیاء کا ساتھ دے رہے تھے۔ کوثر نیازی اکثر کہتے تھے کہ پیپلز پارٹی کے لیڈر بھٹو کو قتل کرنا چاہتے تھے اور وہ بھٹو کی جان بچائیں گے۔

''تو کیا کوثر نیازی نے بھٹو کی جان بچالی تھی'' آصف زرداری نے مجھ سے پوچھا۔

میں چپ رہا تو وہ بولے کہ پیپلز پارٹی کے یہ اٹھارہ ایم این ایز جنہوں نے 2002ء کے الیکشن کے بعد اپنی پارٹی چھوڑ کر جنرل مشرف کو جائن کیا، انہوں نے بھی یہی دعویٰ کیا تھا کہ وہ بینظیر بھٹو کو

واپس پارٹی میں آ سکتے ہیں تو وہ پھر بھٹو کو واپس لے آتے ہیں۔ یہ لوگ محض اپنے فائدے اور مفادات کی خاطر سیاست کر رہے ہیں۔

میں نے زرداری صاحب سے پوچھا کہ اگر ایسی بات تھی کہ یہ لوگ پارٹی کے ساتھ غداری کرتے رہے ہیں تو پھر پارٹی لیڈرشپ انہیں دوبارہ اپنی پارٹی میں کیوں شامل کرتی رہی ہے۔ جب یہ لوگ مشکل وقت میں پارٹی چھوڑ گئے تھے تو پھر اچھے وقتوں میں انہیں واپس کیوں لایا گیا۔

آصف زرداری کے پاس اس بات کا بھی جواب موجود تھا۔ وہ کہنے لگے کہ آپ اس بات کو بھی سراہیں کہ یہ پیپلز پارٹی کی خوبصورتی ہے نہ کہ کوئی بری بات۔ لوگ اس پارٹی میں آتے ہیں، جائن کرتے ہیں، پھر اسے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور پھر کچھ عرصے بعد واپس آ کر اسے پھر جائن کرتے ہیں کیونکہ انہیں پتہ ہے کہ سیاسی طور پر زندہ رہنے کے لیے صرف ایک ہی جماعت ہے جس کا نام پیپلز پارٹی ہے۔

میں بھی اتنی آسانی سے ہتھیار ڈالنے والا نہیں تھا۔ میں نے زرداری صاحب سے ایک اور بات پوچھی کہ پیپلز پارٹی پیٹریاٹ کے ایم این ایز یہ الزام لگا رہے تھے کہ 1988ء سے لے کر اب تک پیپلز پارٹی کی قیادت ہمیشہ کمپرومائز کرتی رہی ہے اور فوجی قیادت کے ہاتھوں کھیلتی رہی ہے۔

زرداری صاحب بھی اتنی آسانی سے ہار ماننے والے نہیں تھے۔ وہ کہنے لگے کہ میاں دیکھو، پیپلز پارٹی ایک جمہوری پارٹی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہر طاقتور شخص اس پارٹی کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ جنرل اسلم بیگ سے لے کر جنرل پرویز مشرف تک سب نے یہ کوششیں کی ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم جو سیاسی فیصلے کرتے ہیں وہ کسی کمپرومائز کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ لوگ اب یہ سمجھتے ہیں کہ جرنیلوں کے ساتھ کمپرومائز کر کے پیپلز پارٹی کمزور ہوئی ہے۔

وہ بولے کہ آپ کو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ایکٹرز تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور پارٹی کے لیڈرز مختلف لوگوں سے مختلف ایشوز پر بات چیت اور ڈائیلاگ کرتے رہتے ہیں۔ یہ سب ایک سیاسی گیم ہوتی ہے۔ اس کا ہرگز مطلب کمپرومائز نہیں ہوتا۔ وہ کہنے لگے کہ ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جمہوری طاقتیں کبھی بھی بات چیت یا مذاکرات کی آفرز کو نہیں ٹھکراتیں۔

میں نے بات کا رخ ایک دفعہ پھر نیب کے زرداری صاحب پر بنائے گئے کیسز کی طرف کر دیا۔ وہ بولے کہ نیب کا ادارہ احتساب کے نام پر بنایا گیا اور وہ محض جنرل مشرف کا ایک سیاسی ہتھیار تھا جس کے ذریعے وہ اپنے سیاسی مخالفین کو ہراساں کر رہے تھے۔ نیب ان کی رہائی کے بدلے ایک مخصوص قیمت مانگ رہا ہے جو ان کی پارٹی لیڈرشپ نہ تو افورڈ کر سکتی ہے اور نہ ہی دینے کو تیار ہے۔ جنرل مشرف اس کو رہا کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن اس کے بدلے وہ پیپلز پارٹی کی قیادت کو کہہ رہے ہیں کہ وہ ایل ایف او کو تسلیم کریں اور پھر ایک وردی والے صدر کو بھی مان لیں۔ یہ ہے ساری کہانی۔ لیکن میں نے جھکنے سے انکار کر دیا ہے اور اب جیل کی سلاخوں کے پیچھے بیٹھا اس کی قیمت چکا رہا ہوں۔

زرداری صاحب کہنے لگے کہ دیکھو! شروع میں تمام پارٹیز نے ایل ایف او کے خلاف بڑا رولا ڈالا جیسا کہ ایم کیو ایم نے لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا ان سب نے ایل ایف او کو تسلیم کر لیا۔ تمام سیاسی پارٹیوں نے یہ ڈرامہ کھیلا اور اپنی اپنی قیمت لے کر جنرل مشرف کے ساتھ شامل ہوتے گئے۔ باقی باتیں چھوڑو۔ یہی دیکھ لو کہ جمالی کی کابینہ میں بیٹھے وزیروں کی اکثریت پر نیب نے مقدمات بنائے ہوئے تھے لیکن ان کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتا۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! جب آپ کو پتہ ہے کہ آپ کے مخالفین آپ کے ذریعے بینظیر بھٹو کو بلیک میل کرتے ہیں تو پھر آپ اقتدار سے دور کیوں نہیں رہتے تا کہ ان کے لیے اور آپ کی پارٹی کے لیے مشکلات پیدا نہ ہوں۔ انہوں نے الٹا مجھ سے سوال پوچھ لیا کہ وہ کیوں اپنی پارٹی کی حکومت سے دور رہیں خصوصاً جب لوگوں نے انہیں ووٹ دے کر ایم این اے یا سینیٹر بنایا ہو۔ دوسروں کی طرح ان کا بھی یہ سیاسی استحقاق تھا اور اس میں کوئی بھی ایسی برائی نہیں تھی اگر وہ بینظیر بھٹو کی حکومت میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہوں۔ ان کی اپنی بہن نے بھی قومی اسمبلی کا الیکشن اس وقت جیتا جب وہ جیل میں بیٹھے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جب لوگ انہیں بیگناہ سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ حکومت کریں تو پھر کسی کو اس پر کیا اعتراض! لوگ عدالتوں کے الزامات پر یقین نہیں رکھتے کہ انہوں نے کوئی کرپشن کی تھی لہٰذا وہ انہیں ہر دفعہ ووٹ ڈالتے ہیں اور ان کے لیے سیاست میں رہنے کے لیے یہ ایک وجہ ہی کافی ہے۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! چلیں مان لیتے ہیں کہ غلام اسحٰق خان، نواز شریف اور جنرل

مشرف نے آپ پر جھوٹے کیس بنائے ہوں گے کیونکہ وہ آپ کے سیاسی مخالف تھے۔ لیکن آپ کے پاس اس بات کا کیا جواز ہے کہ آپ کی اپنی ہی پارٹی کے لیڈر، فاروق لغاری جنہیں صدر بنانے کے لیے آپ خود ووٹ مانگتے رہے تھے، نے آپ کی حکومت پر کرپشن کے الزامات لگا کر اس کو برطرف کیا تھا، انہی کے بنائے ہوئے مقدمات کی وجہ سے وہ آج جیل میں بیٹھے ہیں۔

زرداری صاحب نے کہا کہ فاروق لغاری نے دراصل پارٹی کو دھوکہ دیا تھا۔ وہ ایک دھوکے باز شخص ہے جس نے ملک کی تمام سیاسی طاقتوں کو دھوکہ دیا تھا۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! کہا تو یہ بھی جاتا ہے کہ بینظیر بھٹو اور فاروق لغاری کے درمیان اختلافات آپ کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے جو آخرکار بینظیر بھٹو کی حکومت کے خاتمے کی وجہ بنے۔

میرا اگلا سوال ابھی تک پیپلز پارٹی پیٹریاٹ کے گروپ کی طرف تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا انہیں ایجنسیوں نے مجبور کیا تھا کہ وہ پیپلز پارٹی کے ساتھ سیاسی غداری کریں۔ وہ بولے کہ وہ اس بارے میں سو فیصد یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ ان کا خیال ہے جب تک خود کوئی ٹوٹنے کے لیے تیار نہ ہو کوئی کسی کو نہیں توڑ سکتا۔ پیپلز پارٹی کا یہ گروپ خود اقتدار میں جانے کا خواہش مند تھا اور انہوں نے اپنی ان کمزوریوں کا سارا الزام پیپلز پارٹی کی لیڈرشپ کے کندھوں پر ڈالنے کی کوشش کی۔ یہ سب لوگ اقتدار کے بھوکے تھے اور اقتدار میں جانے کے لیے مختلف حیلے بہانے کر رہے تھے۔ انہوں نے یہ سب کچھ پارٹی اور جمہوریت کو بچانے کے نام پر کیا کیونکہ اس ملک میں لوگوں کے غم و غصے سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ اپنی پارٹی سے غداری کرتے وقت اس طرح کی کہانیاں لوگوں کو سنائیں۔

میں نے بات کا رخ ایک اور طرف موڑا اور ان سے پوچھا کہ ان کے خیال میں ان کی پارٹی لیڈرشپ [illegible]

[illegible]

بلکہ ان کی پارٹی لیڈرشپ نے کی تھیں۔

انہوں نے میرے چہرے کے تاثرات دیکھے تو اپنی پارٹی کی پچھلی دو حکومتوں کی کارکردگی کو بیان کرنے لگے۔ وہ بولے باقی باتیں چھوڑیں۔ آپ صرف یہ دیکھیں کہ پیپلز پارٹی کے دور میں غربت کتنی کم تھی اور آج کتنی بڑھ گئی ہے۔ آپ کو سب باتیں واضح ہو جائیں گی۔

میں نے کہا زرداری صاحب! فرض کرتے ہیں کہ اگر آج آپ کو جیل سے رہا کر دیا جائے تو کیا آپ سیاست میں رہیں گے یا پھر ملک چھوڑ دیں گے۔ وہ بولے کہ رہائی کے بعد وہ پہلے اپنا علاج کرانے کے لیے ملک سے باہر جائیں گے لیکن ان کی کوشش ہوگی کہ وہ پاکستانی سیاست میں اپنا کردار ادا کرتے رہیں۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! بینظیر بھٹو صاحبہ پاکستان واپس آ کر اپنی سیاسی جنگ یہاں کیوں نہیں لڑتیں تو وہ بولے ان کے خیال میں وہ یہاں سے دور بیٹھ کر اپنی سیاسی لڑائی زیادہ بہتر اور موثر انداز میں لڑ رہی ہیں۔ اگر آج وہ واپس آ جائیں تو انہیں فوری طور پر جیل میں ڈال دیا جائے گا۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ انصاف حاصل کرنے کے لیے عدالتوں سے رجوع کریں۔

زرداری صاحب نے قہقہہ لگایا اور بولے کہ میں کس عدلیہ کی بات کر رہا ہوں جو ابھی تک جنرل مشرف کے جاری کیے گئے پی سی او پر حلف لے کر اپنی نوکری کر رہی ہے۔ وہ بولے باقی چھوڑیں۔ اب تو وکیل یہ خود کہتے ہیں کہ یہ عدلیہ کرپٹ ہے اور وہی کچھ کر رہی ہے جو انہیں ایک فوجی حکم دے رہا ہے۔

زرداری صاحب نے کہا کہ پاکستانی وکیلوں نے بڑی شاندار جدوجہد کی تھی اور اب مشرف کے پی سی او پر لیے گئے حلف کے خلاف جدوجہد کر کے عدالتوں کو بے نقاب کر رہے ہیں۔

ان کے خیال میں جن عدالتوں نے بینظیر بھٹو کو سزا سنائی تھی وہ خود کرپشن میں ملوث تھے اور [illegible]

میرا خیال ہے [illegible] زرداری کا اشارہ [illegible] کی طرف تھا [illegible] شریف [illegible] بینظیر بھٹو [illegible]

لہٰذا پاکستانی ایک ہی چال چل کر دیکھتے ہیں اور اس دفعہ فوج سے ڈیل زرداری صاحب کر رہے ہیں کہ بینظیر بھٹو! آصف زرداری سے خفیہ مذاکرات کرنے والوں نے انہیں یہ یقین دلایا تھا کہ اگر لاہور میں اپنی سیاسی قوت کا مظاہرہ کر کے دکھا دیں تو شاید جنرل مشرف کو راضی کر کے اس ملک میں نئے انتخابات کرائے جا سکتے ہیں۔ آصف زرداری نے یہی کہانی بینظیر بھٹو کو بڑی اچھی طرح پڑھا دی تھی۔ مزاحمت نہ کرنے کی صورت میں بینظیر بھٹو آصف زرداری کے پیچھے بیٹھ کر اپنی پارٹی کی قیادت سونپنے پر تیار ہو گئی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ آصف زرداری کے دبئی سے لاہور آنے سے پہلے ڈاکٹر شاہد مسعود نے جب دونوں میاں بیوی کو ساتھ بٹھا کر اے آر وائی ٹی وی کے لیے انٹرویو کیا تو اس میں انہوں نے ایک بڑا خوبصورت سوال پوچھا تھا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ پاکستانی فوج ان پر (بینظیر بھٹو) اعتماد کرنے کو تیار نہیں ہے جبکہ ان کے شوہر آصف زرداری پر وہ بھروسہ کرنے کو تیار ہے۔ بینظیر بھٹو نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا تھا کہ پاکستانی فوجی آصف زرداری پر شاید اس لیے اعتماد کرنے لگ گئے ہیں کہ وہ ایک ملٹری کالج پٹارو سندھ کے پڑھے ہوئے ہیں جبکہ وہ (بینظیر بھٹو) ایک سویلین ہیں۔ پاکستانی فوجی ابھی بھی ایک ایسے شخص کے ساتھ ڈیل کرنے اور اعتبار کرنے پر تیار ہیں جو فوجی نہ سہی لیکن ان کے فوجی سکول میں پڑھا ہوا تھا۔

بینظیر بھٹو کا یہ جواب عقلمندوں کے لیے بطور اشارہ سمجھنے کے لیے کافی تھا کہ یہ سارا میلہ آصف زرداری پاکستانی فوج کے ان جرنیلوں سے ملاقاتوں کے بعد سجا رہے تھے جو مخدوم امین فہیم کے ساتھ رات کے اندھیرے میں ان سے ملاقاتیں کرتے تھے۔

جب میں دبئی ایئرپورٹ پر اترا تو میرے ذہن میں یہی خیال تھا کہ میں دیگر لیڈروں کی طرح بینظیر بھٹو سے بھی دوران سفر اسی طرح کی ایک سیاسی پروفائل کرنے کی کوشش کروں۔ میں نے ان کے ترجمان فرحت اللہ بابر سے مدد چاہی جو اس وقت اسلام آباد میں تھے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ بینظیر بھٹو سے بات کر کے وقت طے کر دیں گے۔ جب میں نے دو تین دفعہ فرحت اللہ بابر کو یاد دہانی کرائی تو مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھے محض ٹال رہے ہیں۔ میں نے بعد میں ادھر ادھر سے سن گن لی تو پتہ چلا کہ آصف زرداری نے بینظیر بھٹو پر یہ پابندی لگائی ہوئی تھی کہ وہ کسی بھی پاکستانی صحافی سے نہیں ملیں گی اور نہ ہی کوئی انٹرویو دیں گی تاکہ میڈیا کی تمام تر توجہ ان پر اور ان کے مقاصد پر فوکس رہے۔ یہی وجہ تھی کہ

پاکستان آنے سے چند گھنٹے پہلے جب آصف زرداری نے اس ہوٹل میں آ کر پریس کانفرنس کی جہاں پاکستانی صحافی ٹھہرے ہوئے تھے تو بینظیر ان کے ساتھ نہیں آئی تھیں۔ ان کے ساتھ صرف بلاول زرداری تھے۔ جب ہم سب لوگ دبئی ایئرپورٹ پر پہنچے تو پیپلز پارٹی کے کچھ جیالوں نے ایئرپورٹ پر زرداری صاحب کے حق میں نعرے بازی شروع کر دی۔ دو منٹ بعد دبئی پولیس کے ایک سپاہی نے آ کر صرف اتنا کہا کہ اگر اس کے بعد کسی نے نعرہ مارا تو ان سب کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس کے بعد کسی کونے سے کوئی آواز نہیں آئی۔

جہاز کی روانگی میں مسلسل تاخیر ہو رہی تھی۔ ہمیں کئی کہانیاں سنائی جا رہی تھیں۔ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ ادھر پاکستان سے یہ خبریں آ رہی تھیں کہ وہاں پاکستان پیپلز پارٹی کے ورکرز چاروں صوبوں سے اکٹھے ہو کر لاہور ایئرپورٹ کی طرف جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ چوہدری پرویز الٰہی پنجاب کی روایتی ظالمانہ پولیس فورس کے ساتھ پیپلز پارٹی کے ورکروں کی ہڈیاں توڑنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جہاز پر سوار ہونے سے پہلے آصف زرداری نے ایک عجیب سی بات کی۔ انہوں نے اپنے پارٹی ورکروں سے کہا کہ وہ ایئرپورٹ کی طرف نہ آئیں۔ جو جہاں ہے وہ وہیں رک کر بیٹھ کر دھرنا دے دے۔ جہاز کی روانگی کچھ اس طرح رکھی گئی تھی کہ اس نے صبح سویرے ہی لاہور ایئرپورٹ پر اترنا تھا۔ ہم صحافیوں کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر اتنی جلدی لاہور ایئرپورٹ پر اترنے کی کیا وجہ تھی کیونکہ اس وقت تو پارٹی ورکرز کے لیے انہیں ایئرپورٹ آ کر ریسیو کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اسی کنفیوژن میں ہم صحافی جہاز پر سوار ہوئے اور ہم نے اپنے بورڈنگ کارڈز پر لکھے ہوئے نمبروں کے مطابق سیٹیں ڈھونڈنے کی کوشش کی تو ہمیں کہا گیا کہ کسی بھی جگہ بیٹھ جاؤ کیونکہ یہ چارٹرڈ جہاز تھا۔ زرداری صاحب تمام راستہ نہیں سوئے۔ وہ ہر ایک صحافی کے ساتھ اپنے روایتی انداز میں گپ شپ کرتے رہے۔ جب جہاز صبح سویرے لاہور کی فضاؤں میں پہنچا تو یکدم ماحول میں گرمی آ گئی۔ ڈاکٹر شاہد مسعود سب سے زیادہ پھرتیاں دکھا رہے تھے۔ وہ کبھی بھاگ کر پائلٹ کے کیبن میں جاتے تو کبھی آصف زرداری کے کان میں سرگوشیاں کرتے پائے جاتے۔ آہستہ آہستہ یہ بھنبھناہٹ شروع ہو گئی کہ شاید جہاز کو لاہور ایئرپورٹ پر نہ اترنے دیا جائے۔ آخر بریکنگ نیوز ڈاکٹر شاہد مسعود نے ہی سرگوشی کی شکل میں ایک دو صحافیوں کو دی کہ کھیل ختم ہو گیا ہے۔ ہمیں پھر بھی یقین نہیں آ رہا تھا لیکن جب جہاز ایئر

پورٹ پر اترا اور وہاں جو کچھ ہمیں دیکھنے کو ملا اس سے یہ اندازہ ہو گیا کہ ڈاکٹر شاہد مسعود کی بات ٹھیک تھی کہ جہاز اترنے سے پہلے ہی زرداری صاحب کا فوجی جرنیلوں کے ساتھ کیا گیا معاہدہ ہوا میں ہی ٹوٹ چکا تھا۔ اس معاہدے کے واحد گواہ مخدوم امین فہیم آصف زرداری صاحب کی بغل میں تھے۔ جہاز کے اندر کسی کو کوئی اندازہ نہیں تھا کہ ایئر پورٹ پر چاروں طرف پھیلے ہوئے پنجاب پولیس کے کمانڈوز کیا کرنے والے تھے۔ پیپلز پارٹی کے چند جیالوں نے آصف زرداری کا مورال بلند کرنے کے لیے نعرے بازی شروع کر دی۔ کافی دیر تک جہاز کے دروازے بند رہے۔ یہ نعرے گونجتے رہے۔ آخر جہاز کا دروازہ کھلا اور اس کے ساتھ ہی یہ نعرے یکدم بند ہو گئے۔ ایک نوجوان ایس پی تیکن اپنے کمانڈوز کے ساتھ اندر آیا۔ زرداری صاحب نے اسے دور سے آواز دے کر اپنے پاس بلایا اور کہا کہ تمہارے پاس گرفتاری کا وارنٹ ہو گا۔ وہ دکھاؤ اور مجھے لے جاؤ۔ ایس پی تیکن نے آتے ہی آصف زرداری کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ ہمارے ذہن میں تھا کہ شاید آصف زرداری اور ان کے جیالے اس گرفتاری پر مزاحمت کریں گے اور ایئر پورٹ سے باہر نکل کر اپنی پارٹی کے جلوس کی قیادت کریں گے۔ ایک ہی لمحے میں ساری بازی پلٹ گئی تھی۔ آصف زرداری اپنے ساتھیوں کے امین مخدوم امین فہیم کا ہاتھ پکڑ کر اپنا ہاتھ ایس پی تیکن کے ہاتھ میں ڈال کر تیزی سے ہوائی جہاز سے اترے اور سیڑھیوں کے ساتھ کھڑی ہوائی اڈے کی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے سیدھے لاہور میں واقع اپنے زرداری ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم صحافی ہکا بکا ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور ہمیں کچھ نہیں آ رہی تھی کہ اب کیا ہو گا۔ ہم تو یہ کچھ کر رہے تھے کہ شاید ہم پاکستانی تاریخ کے ایک اہم واقعے اور تبدیلی کے بھی شاہد بننے والے تھے کہ آصف زرداری کے لاہور ایئر پورٹ پر اترتے ہی ملک میں نئے انتخابات کا اعلان ہو جائے گا اور بقول ان کے ان کی پارٹی اقتدار میں آ جائے گی۔

ہمیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس ملک میں انقلاب آئے یا نہ آئے، تھوڑی دیر بعد ہم صحافیوں کے سروں پر چوہدری پرویز الٰہی کے کمانڈوز کی شکل میں ایک قیامت ضرور آنے والی تھی۔ جونہی ہم صحافی جہاز سے باہر نکلے چوہدری پرویز الٰہی کے حکم پر ہمیں ایک لائن میں کھڑا کر کے ان کمانڈوز نے ہماری انتہائی بدتمیزی کے ساتھ تلاشی لینا شروع کر دی۔ سب صحافیوں کو کہا گیا کہ اپنے موبائل اور کیمرے پولیس کے حوالے کر کے چپ چاپ پیچھے جا کر بیٹھ جائیں۔ وہ اس وقت تک باہر نہیں نکل سکتے تھے جب

تک ان کی کلیئرنس نہ ہو۔ یہ سارے صحافی جن میں انتہائی سینئر قابل احترام دوست بھی شامل تھے چونکہ پہلے ہی تھکے ہوئے تھے اور جہاز کے سفر کی وجہ سے پہلے ہی چڑچڑے ہو رہے تھے۔ اوپر سے آصف زرداری صاحب ان کی نظروں کے سامنے ہی اپنا کھیل کھیل کر نکل گئے تھے۔ وہ صحافی جو اس امید پر پچھلے دو تین ہفتوں میں پاکستان سے دبئی اور دبئی سے اب لاہور کا سفر کر کے اس امید پر آئے تھے کہ شاید وہ تاریخ کو اپنی آنکھوں کے سامنے بنتے دیکھیں گے وہ اب پرویز الٰہی کی پولیس کے ہاتھوں ذلیل ہونے والے تھے۔ میں لاہور کے صحافیوں کو یہ داد دوں گا خصوصاً عامر میر کو جنہوں نے پنجاب پولیس کے ان کمانڈوز کو اپنے لیپ ٹاپ، موبائل فونز اور کیمروں کو ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ ان سب نے وہیں جہاز پر اعلان کیا کہ وہ کسی بھی صورت میں ان پولیس والوں کو یہ چیزیں چھیننے کی اجازت نہیں دیں گے۔ صحافی بھی بپھرے ہوئے تھے تو کمانڈوز کو بھی چوہدری پرویز الٰہی نے ہدایات دے رکھی تھیں کہ ان تمام صحافیوں کی تواضع کرنی ہے جو جرأت کر کے آصف زرداری کے ساتھ ان کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے آ رہے تھے۔ کافی دیر تک صحافیوں اور پولیس والوں میں سخت جملوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ آخر پولیس والوں نے صحافیوں کو دھکے دے کر نکالنا شروع کیا۔ پولیس کمانڈوز کے دھکوں سے زیادہ ہمارے دوست مظہر طفیل ہوئے جنہیں بڑے برے طریقے سے ان کمانڈوز نے مارا۔ کچھ اور صحافیوں کو بھی مارنے کی کوشش کی گئی۔ وہاں بڑا عجیب سا منظر تھا۔ صحافی سمجھ رہے تھے کہ آصف زرداری انہیں جان بوجھ کر پنجاب پولیس کے کمانڈوز کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود اپنی جان بچا کر نکل گئے تھے۔ انہیں چاہیے تھا کہ وہ پہلے ان صحافیوں کو باحفاظت ایئر پورٹ سے نکلواتے اور اس کے بعد ہی وہ ایس پی تیکن کا ہاتھ پکڑ کر جہاز سے باہر نکلتے لیکن وہ تو بہت جلدی میں تھے۔ یوں پنجاب پولیس کے کمانڈوز نے صحافیوں پر تشدد کرنے کے بعد ان کے موبائل فونز اور کیمرے قبضے میں لے لیے۔ اس وقت کے ایس ایس پی آپریشنز آفتاب چیمہ کی زیر قیادت پنجاب پولیس کے کمانڈوز ایک طرف صحافیوں کو مار رہے تھے تو دوسری طرف چیمہ صاحب پانی کی بوتلیں صحافیوں میں بانٹ رہے تھے۔

سیکرٹ ایجنسیوں نے بڑی چالاکی سے آصف زرداری کے غبارے سے ہوا نکال دی تھی۔ ان کے آٹھ سالہ جدوجہد اور کریڈیبلٹی خاک میں مل گئی تھی۔ ہم سب کو پتہ چل گیا تھا کہ ڈی جی ایم آئی جنرل ندیم تاج کے ساتھ ہونے والی ڈیل ناکام ہو گئی یا کر دی گئی تھی یا سرے سے اس کا وجود ہی

نہیں تھا۔ آصف زرداری کو بے شک جنرل مشرف نے جیل سے باہر نکالا تھا کیونکہ اب تو ہر اخبار، کالم نگار اور صحافی انہیں مرد حُر کا درجہ دے کر انہیں نیلسن منڈیلا بنانے پر تُل گیا تھا۔ وہ جنرل مشرف کے لیے قیدی کی صورت میں ایک پرابلم بنتے جا رہے تھے۔ یوں انہیں نئے انتخابات اور اقتدار کی راہ کھلی سا کر پہلے دبئی اور پھر دبئی سے لاہور بلوا کر چوہدری پرویز الٰہی کے ہاتھوں ذلیل کرا کرا کے چھوڑ دیا گیا۔ بینظیر بھٹو کو شاید ان تمام باتوں کا احساس تھا لیکن وہ چاہتی تھیں کہ آصف زرداری خود ان فوجی جرنیلوں کے ہاتھوں کچھ سبق سیکھیں۔

چند دنوں بعد جب ہنگامہ تھما تو وہی آصف زرداری جو چوہدری پرویز الٰہی کی حکومت کا تختہ الٹ کر لاہور پر قبضہ کر کے ملک میں نئے انتخابات اور اپنی پارٹی کو اقتدار دلانے کے لیے دبئی سے آئے تھے وہ انہیں دبئی کچھ اس انداز سے گئے کہ میڈیا کو بھی کئی دنوں تک کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ پھر سننے میں آیا کہ وہ دبئی سے جا کر نیویارک کے ایک ہسپتال میں دل کے عارضے میں مبتلا ہو کر داخل ہو گئے۔ پھر سننے میں آیا کہ وہ اب نیویارک میں بیٹھ کر بینظیر بھٹو کے امریکیوں سے مذاکرات کرانے کے لیے لابنگ کر رہے تھے۔ آہستہ آہستہ پاکستانی میڈیا اور عوام انہیں بھول گئے کہ ایک دن پتہ چلا کہ بینظیر بھٹو کو قتل کر دیا گیا ہے اور آصف زرداری دبئی سے چکلالہ ایئربیس پہنچ کر ان کا جسد خاکی گڑھی خدا بخش لے جانے کے لیے تین سال بعد اس ملک کا صدر بننے کے لیے واپس آ رہے تھے۔

آفتاب احمد خان شیرپاؤ

آفتاب احمد شیرپاؤ کا سیاستدان بننے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ ایک دن خبر ملی کہ ان کے بھائی حیات خان شیرپاؤ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اس لمحے انہوں نے فیصلہ کرنا تھا کہ فوج میں رہیں یا خاندان کی سیاسی گدی سنبھالیں۔ انہوں نے آرمی چھوڑی اور سیاستدان بننے کا فیصلہ کیا۔

جب وہ سیاست میں آئے تو انہیں پتہ چلا کہ انہیں تو تقریریں بھی کرنی ہیں لیکن انہیں صحیح اردو بولنی نہیں آتی تھی۔ جتنی دیر میں وہ سیاست اور اردو سیکھتے اتنی دیر میں جنرل ضیاء، ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دے چکے تھے۔ آفتاب احمد شیرپاؤ بھٹو صاحب کی بیٹی کے پاس آئے، اسے اپنے ساتھ لیا اور صوبہ سرحد کے مختلف علاقوں میں جلسوں سے خطاب کرانے لے گئے۔ سرحد کے گورنر جنرل فضل حق تک یہ بات پہنچی تو انہوں نے شیرپاؤ کو جنرل ضیاء کے ساتھ ملانے کے لیے بڑی تگ و دو کی۔ شیرپاؤ نے اپنے مرحوم بھائی کی پارٹی چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

بینظیر بھٹو صاحبہ نے بھی شیرپاؤ کی پارٹی کی خدمات کو سراہنا شروع کر دیا تھا۔ جنرل ضیاء کی طیارے کے کریش میں موت واقع ہو چکی تھی اور پیپلز پارٹی پہلی دفعہ بینظیر بھٹو کی قیادت میں بھٹو صاحب کی طلسماتی شخصیت کے بغیر انتخابات لڑنے جا رہی تھی۔ سرحد میں شیرپاؤ صاحب نے کوشش کی کہ صوبے کی دیگر مضبوط سیاسی پارٹیاں اے این پی اور جے یو آئی کے ساتھ مل کر ایک سیاسی اتحاد بنا کر

کے بعد ملک کا صدر بنانے کے لیے حمایت کریں گے۔

بینظیر بھٹو ایک بہت بڑے مخمصے کا شکار تھیں۔ انھیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کیا جائے۔ نواز شریف سے بدلہ لینے کا بڑا اچھا موقع تھا جنہوں نے 1988-90 میں ان کی پہلی حکومت کو انہی غلام اسحاق خان کے ساتھ مل کر ڈس مس کرایا تھا اور خود وزیراعظم بن گئے تھے۔ آج وہی غلام اسحاق خان اور نواز شریف ایک دوسرا کا گلا کاٹنے پر تلے ہوئے تھے۔

دوسرے، بینظیر بھٹو کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ یہ غلام اسحاق خان سے بدلہ لینے کا بڑا اچھا موقع تھا جنہوں نے کرپشن کے الزامات لگا کر ان کی حکومت ختم کی تھی، ان کے خاوند آصف علی زرداری کو ڈھائی سال جیل میں رکھا اور ان کے خلاف مقدمات بنائے۔ آج موقع تھا کہ وہ نواز شریف کے ہاتھوں غلام اسحاق خان کو سیاسی طور پر ذلیل کرا کر ان سے بدلہ لے لیں۔

پارٹی کے اندر سے بھی بینظیر بھٹو پر یہ دباؤ تھا کہ وہ ایک ڈیموکریٹ ہونے کے ناطے نواز شریف کا ساتھ دیں کیونکہ وہ پاکستانی عوام، میڈیا اور ورکرز کے سامنے غلام اسحاق خان کی سپورٹ کا جواز پیش نہیں کر سکیں گے۔ ساری عمر کے لیے پیپلز پارٹی کی قیادت پر یہی دھبہ لگا رہے گا کہ انہوں نے پارلیمنٹ سے منتخب شدہ ایک وزیراعظم کے بجائے اسٹیبلشمنٹ کے نمائندے جس نے ان پر کرپشن کا الزام لگا کر ان کی حکومت توڑی، کی حمایت کی تھی۔

آفتاب شیر پاؤ سے پوچھا گیا تو انہوں نے بینظیر بھٹو کو یہ مشورہ دیا کہ وہ نواز شریف کے بجائے غلام اسحاق خان کی حمایت کریں کیونکہ ایک ایسے صدر سے انہیں زیادہ سیاسی فائدے ملنے کی توقع ہے جس کے پاس پارلیمنٹ اور حکومت کو توڑنے کے اختیارات ہیں۔

بینظیر بھٹو اور غلام اسحاق خان کے درمیان جو لوگ خفیہ مذاکرات کرا رہے تھے انہیں بتایا گیا کہ وہ صدر کے کیمپ تک یہ پیغام پہنچا دیں کہ وہ نواز شریف کی حکومت کو برطرف کر کے اس ملک میں نئے انتخابات کرانے کا اعلان کریں۔ غلام اسحاق خان کی طرف سے خفیہ مذاکرات کرنے والے لوگ اس بات کے لیے تیار نہیں تھے۔ پیپلز پارٹی اور غلام اسحاق خان کیمپ کے درمیان یہ خفیہ ملاقاتیں شیر پاؤ کے اسلام آباد میں واقع گھر پر جاری رہیں۔

پنجاب کے علاوہ باقی تین صوبوں کے وزراء اعلیٰ غلام اسحاق خان کے وفادار تھے اور یہ بات نواز شریف کو سب سے زیادہ پریشان کر رہی تھی۔

جب بھی پارٹی کی میٹنگز ہوتیں تو بینظیر بھٹو ہمیشہ اس بات کی مخالفت کرتیں کہ ان کی غلام اسحاق خان کے ساتھ ملاقات ہونی چاہیے۔ تاہم، فاروق لغاری اور شیر پاؤ کو یہ اچھی طرح پتہ تھا کہ بینظیر بھٹو غلام اسحاق خان کے ساتھ ڈیل کرنا چاہتی تھیں جنہوں نے ان کی پہلی حکومت کو کرپشن چارجز پر ڈس مس کیا تھا۔ آخر فاروق لغاری اور شیر پاؤ بینظیر بھٹو کو غلام اسحاق خان سے ملانے لے گئے اور یوں ان دونوں کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ طے پایا۔ جب بینظیر بھٹو اور غلام اسحاق خان ایک کمرے میں اکیلے بیٹھے مذاکرات کر رہے تھے تو بینظیر بھٹو نے شیر پاؤ سے کہا کہ وہ بھی ان مذاکرات میں شامل ہو جائیں۔ بینظیر اور غلام اسحاق کے درمیان بہت سنجیدہ بحث و مباحثہ جاری تھا۔ غلام اسحاق خان اس بات پر بضد تھے کہ صرف قومی اسمبلی توڑی جائے گی اور صوبائی اسمبلیاں اپنا کام کرتی رہیں گی۔

بینظیر بھٹو شیر پاؤ سے یہ پوچھنا چاہ رہی تھیں کہ جو لوگ پارٹی کی طرف سے مذاکرات کر رہے تھے ان کے غلام اسحاق خان کیمپ سے کس طرح کے مذاکرات ہوئے تھے۔ شیر پاؤ نے بینظیر بھٹو اور غلام اسحاق خان کو بتایا کہ مذاکرات میں یہ بات طے ہوئی تھی کہ قومی اسمبلی اور چاروں صوبائی اسمبلیاں توڑی جائیں گی۔ اس پر غلام اسحاق خان نے کہا کہ وہ صوبائی اسمبلیوں کو توڑنے کا معاملہ بعد میں دیکھیں گے۔ پہلے وہ قومی اسمبلی کو برخاست کریں گے۔ غلام اسحاق خان نے بینظیر بھٹو کے ساتھ ملک کے نئے نگران وزیراعظم کا نام بھی ڈسکس کیا۔ جب انہیں یہ بتایا گیا کہ بلخ شیر مزاری اس ملک کے نئے وزیراعظم ہوں گے تو بینظیر بھٹو نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔

غلام اسحاق خان نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے ذہن میں بھی ایک گیم پلان موجود تھا۔ وہ بینظیر بھٹو کی مدد سے پہلے نواز شریف سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے اور پھر اپنے وفادار صوبائی وزراء اعلیٰ کی مدد سے قومی اسمبلی کے لیے نئے انتخابات کرا کر اپنی مرضی کی پارلیمنٹ وجود میں لانا چاہ رہے تھے۔ غلام اسحاق خان کا پلان تھا کہ پیپلز پارٹی کو چالیس سے پچاس سیٹیں ملیں گی۔ ایک ایسی پارلیمنٹ کو اپنی مرضی سے چلانا آسان ہوگا جس میں کسی پارٹی کی اکثریت نہیں ہوگی اور یوں غلام اسحاق خان اپنی مرضی سے اسلام آباد میں ایک کٹھ پتلی حکومت تشکیل دے کر ایوان صدر سے پورے ملک پر حکومت کریں گے۔ پیپلز پارٹی کی قیادت کو احساس ہو گیا تھا کہ ان کے ساتھ کھیل کھیلا جا رہا تھا

دوسری طرف جنرل جہانگیر کرامت بھی اپنی کوششوں میں لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح بینظیر بھٹو اور فاروق لغاری کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ ایک مرحلے پر تو جنرل جہانگیر کرامت نے بینظیر بھٹو کو یہ بھی آفر کی کہ وہ انہیں اپنے ساتھ لے کر فاروق لغاری کے پاس جائیں گے تاکہ دونوں کے درمیان پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کو دور کیا جا سکے۔

بینظیر بھٹو نے جہانگیر کرامت کا شکریہ ادا کیا لیکن انہوں نے ان کی پیشکش شائستگی سے یہ کہہ کر مسترد کر دی کہ وہ فاروق لغاری کے ساتھ اپنے اختلافات دور کرنے کے لیے آرمی چیف کو اس میں ملوث نہیں کریں گی۔ بینظیر بھٹو نے شیر پاؤ کو بتایا کہ وہ چیف آف آرمی سٹاف کی اس معاملے میں مدد نہیں لیں گی۔

شیر پاؤ نے بی بی کو مشورہ دیا کہ وہ فاروق لغاری کے ساتھ پیدا ہونے والے اختلافات کو ایک ایک کر کے حل کریں لیکن بینظیر بھٹو ان سارے اختلافات کو ایک ہی میٹنگ میں بیٹھ کر ختم کرنا چاہتی تھیں۔

شیر پاؤ نے یاد کیا کہ معاملات بہت پہلے ہی بگڑنا شروع ہو گئے تھے۔ بینظیر بھٹو اس بات پر بہت پریشان تھیں کہ کیا فاروق لغاری آصف زرداری سے وفاقی وزیر کا حلف لینے سے انکار تو نہیں کریں گے۔ جب شیر پاؤ نے یہی بات فاروق لغاری سے کی تو انہوں نے آگے سے جواب دیا کہ وہ بینظیر بھٹو کی طرف سے بھیجی گئی دو چیزوں پر کبھی اعتراض نہیں کریں گے۔ ایک یہ کہ اگر وہ کسی شخص کا نام انہیں بھیجتی ہیں کہ ان سے وزیر کا حلف لیا جائے تو وہ ضرور حلف لیں گے۔ دوسرے وہ اگر انہیں یہ سفارش بھیجتی ہیں کہ قومی اسمبلی توڑ دی جائے تو وہ فوراً توڑ دیں گے۔

بینظیر بھٹو اور فاروق لغاری کے درمیان تعلقات اب پوائنٹ آف نو ریٹرن تک پہنچ چکے تھے۔ حالات کسی ایک وجہ سے اس نہج پر نہیں پہنچے تھے۔ ایک دن ایوان صدر میں سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد ججوں کی تقرری کے مسئلے پر صدر اور وزیراعظم کے نمائندوں کے درمیان ایک میٹنگ ہوئی۔ صدر کی طرف سے خواجہ طارق رحیم، احمد سعید اعوان اور شاہد حامد نے شرکت کی۔ بینظیر بھٹو کی طرف سے وزیر قانون رضا ربانی، اس وقت کے لاء سیکرٹری اور آفتاب شیر پاؤ اس میٹنگ میں شریک ہوئے۔ یہ میٹنگ اسی وقت ہی ختم ہو گئی جب دونوں اطراف کے لوگوں نے اس مسئلے کو حل کرنے کے بجائے ایک دوسرے پر طنز کرنا شروع کر دیے۔

بینظیر بھٹو کو پتہ چل چکا تھا کہ معاملات بہت بگڑ گئے تھے۔ وہ پھر بھی کوششوں میں لگی ہوئی تھیں کہ شاید بگڑتی بات کہیں بن جائے۔ بینظیر بھٹو نے ایک رات شیر پاؤ کو پشاور فون کیا اور انہیں کہا کہ فوری طور پر اسلام آباد پہنچیں۔ وہ شیر پاؤ کے ساتھ فاروق لغاری سے ملنا چاہ رہی تھیں۔ آفتاب شیر پاؤ ابھی اسلام آباد کے لیے روانہ نہیں ہوئے تھے کہ بینظیر بھٹو نے بارہ بجے کے قریب 5 نومبر 1996ء کو فون کر کے شیر پاؤ کو بتایا کہ اب انہیں اسلام آباد آنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ فاروق لغاری ان کی حکومت توڑ چکے ہیں۔ بینظیر بھٹو نے کہا کہ اب وہ آرام سے کل اسلام آباد آ جائیں۔

فاروق لغاری نے بینظیر حکومت توڑتے ہی پرائم منسٹر ہاؤس آنے جانے والے راستے بند کرا دیے۔ کسی کو بینظیر بھٹو سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ آفتاب شیر پاؤ وہ واحد لیڈر تھے جنہیں بینظیر بھٹو سے ملنے کی اجازت دی گئی۔

اپنی حکومت کے توڑے جانے کے اگلے روز بینظیر بھٹو نے فاروق لغاری کو فون کیا اور ان سے پوچھا کہ ان کی حکومت کیوں توڑی گئی تھی۔ فاروق لغاری نے آگے سے جواب دیا کہ ہاں، وہ ان کی حکومت کو ڈس مس کر چکے ہیں۔ بینظیر بھٹو نے ان سے پوچھا کہ صوبائی اسمبلیوں کا کیا بنے گا۔ فاروق لغاری نے جواب دیا کہ وہ صوبائی اسمبلیوں کو بھی ڈس مس کریں گے۔

ٹیلی فون پر ہونے والی اس گفتگو کے درمیان میں فاروق لغاری نے بینظیر بھٹو کو یہ بھی پیشکش کی کہ وہ انہیں نگران سیٹ اپ میں شامل لوگوں کے ناموں کی فہرست بھی دکھا دیں گے۔

جب آفتاب شیر پاؤ ایک برطرف وزیراعظم سے پرائم منسٹر ہاؤس میں ملے تو انہوں نے بینظیر بھٹو کو یہ مشورہ دیا کہ وہ فاروق لغاری کے ساتھ رابطے میں رہیں کیونکہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔

بینظیر بھٹو نے شیر پاؤ سے کہا کہ وہ رضا ربانی کو ساتھ لے کر فاروق لغاری سے ملنے جائیں تاہم رضا ربانی مقررہ وقت پر وہاں نہیں پہنچے اور یوں شیر پاؤ کو فاروق لغاری سے ملنے کے لیے اکیلے جانا پڑا۔

لغاری نے شیر پاؤ کو بتایا کہ انہوں نے اتنا بڑا قدم کیوں اٹھایا تھا اور پھر وہ انہیں ان لوگوں کے نام بتانے لگے جو نگران حکومت کو چلائیں گے۔

باتوں باتوں میں فاروق لغاری نے شیر پاؤ سے کہا کہ وہ صوبے کے چیف منسٹر کے طور پر کام

سلطان محمود قاضی

ایک سیاسی ورکر جو آصف زرداری کے لیے رول ماڈل بنا

جب میں آصف علی زرداری صاحب سے ملنے کے لیے راولپنڈی کی احتساب عدالت میں گرمیوں کی ایک تپتی دوپہر میں گیا تھا تو میں نے ایک بات فوراً محسوس کی تھی کہ وہاں ان کے ارد گرد مجمعے میں موجود جو دوست اور پارٹی ورکر بیٹھے تھے ان میں سے اگر وہ کسی کو سب سے زیادہ عزت اور احترام دے رہے تھے وہ بمشکل تین فٹ کا انسان تھا۔ میں بڑا حیران ہوا کہ آخر چھوٹے سے قد والے اس انسان میں ایسی کیا غیر معمولی بات تھی کہ زرداری صاحب جیسا شخص بھی نہ صرف ان کی بات غور سے سن رہا تھا بلکہ اس طرح سر ہلا رہا تھا جیسے ان کا کہا ہوا ہر لفظ حرف آخر ہو۔ میں زرداری صاحب سے بڑی دیر تک گپ شپ کرتا رہا لیکن بار بار میری نظر اس شخص کی طرف اٹھ جاتی۔ مجھے یہ بہت برا لگ رہا تھا کہ میں زرداری صاحب سے انٹرویو چھوڑ کر ان سے یہ پوچھوں کہ یہ شخص کون ہے۔

میں نے اپنے انٹرویو کے دوران زرداری صاحب سے پوچھ لیا کہ انہوں نے ساری عمر عیاشی بھری زندگی گزاری تھی، پھر ان کے اندر اتنی جرأت کہاں سے آ گئی تھی کہ انہوں نے آٹھ سال جیل میں گزار دیے۔ زرداری صاحب نے اپنی انگلی اٹھائی اور اپنے سامنے مجمعے میں بیٹھے ہوئے اسی چھوٹے قد والے شخص کی طرف اشارہ کر کے مجھے کہا کہ ہوسکتا ہے یہ شخص تمہیں قد میں بہت چھوٹا لگ رہا ہو لیکن

سلطان محمود قاضی، ذوالفقار علی بھٹو کے ہمراہ

یہ بڑے بڑے قد آوروں سے بڑا شخص ہے۔ جب میں اسے دیکھتا ہوں تو میرا حوصلہ بڑھتا ہے اور میں جیل کے کمرے میں واپس جا کر نئے سرے سے سختیاں جھیلنے کے لیے تیار ہو جاتا ہوں۔

مجھے زرداری صاحب کی یہ بات سن کر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنا چھوٹا سا آدمی بھلا زرداری صاحب کے لیے کیسے ایک رول ماڈل ہوسکتا ہے۔

میں سمجھا کہ شاید زرداری صاحب نے حسب عادت مجھ سے کوئی مذاق کیا ہے۔

جونہی زرداری صاحب کا انٹرویو ختم ہوا تو میں نے فوراً بڑی بے چینی سے اپنے ایک صحافی دوست سے پوچھا کہ یار یہ کون آدمی ہے؟ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولا کہ آپ اس کو

نہیں جا سکتے۔ میں نے بڑا اصرار کیا اور کہا کہ حضور اگر میں جانتا ہوتا تو آپ سے اتنا بڑا احسان لینے کی درخواست نہ کرتا۔

میرے دوست نے کہا کہ اس کا نام سلطان محمود قاضی ہے۔ یہ شخص پانچ سال تک جیل میں اس وجہ سے گزار کر آیا ہے کہ اس پر الزام تھا کہ اس نے جنرل ضیا کو بھٹو کو پھانسی دینے کے بعد قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ یہ راولپنڈی پیپلز پارٹی کے جیالوں میں سب سے قد آور جیالا سمجھا جاتا ہے جس سے کسی دور میں جنرل ضیا جیسا آمر بھی مرعوب رہتا تھا۔

مجھے ایک شدید جھٹکا لگا اور میں نے غیر ارادی طور پر مڑ کر اس تین فٹ کے انسان کو دیکھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہمارے اردگرد چلتے پھرتے کیسے کیسے کردار بھی ہیں جن کا ہو سکتا ہے قد تو بہت چھوٹا ہو لیکن ان کے اندر چھپا انسان ہم جیسے لوگوں سے شاید قد کاٹھ میں کئی گنا بڑا نکلتا ہے۔

مجھے آصف زرداری صاحب کے دل میں قاضی سلطان کے لیے موجود عزت اور احترام کی کچھ سمجھ ایک لمحے میں آ گئی تھی۔ میں ایک قدم آگے بڑھا، احترام کے ساتھ جھکا اور اپنا ہاتھ قاضی صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ وہ مجھے پہلے ہی زرداری صاحب کا انٹرویو کرتے دیکھ کر سمجھ چکے تھے کہ میں کون ہوں۔ وہ بڑے احترام سے ملے۔ میں نے ان سے ان کا نمبر لیا اور چپکے سے عدالت کے احاطے سے باہر نکل آیا۔

قاضی سلطان سے جب ملاقات ہوئی تھی اس وقت ان کی عمر 55 برس تھی۔ اب سات برس بعد جب یہ کتاب لکھی جا رہی ہے تو وہ 62 برس کے ہو چکے ہیں۔ ایک عام سیاسی ورکر کے لیے اس سے بڑا خراج تحسین کیا ہو سکتا ہے کہ بھرے مجمعے میں آصف زرداری جیسا بندہ اس بات کا اعتراف کرے کہ قاضی سلطان کو دیکھ کر ان کے اندر جیل کی سختیاں جھیلنے کی ہمت پیدا ہوئی تھی۔

قاضی 1949ء میں جب پیدا ہوا تو پوری فیملی کو ایک بہت بڑا جھٹکا لگا۔ سب لوگوں کے لیے اس کے وجود کے ساتھ گزارہ کرنا ایک مشکل کام لگا۔ لیکن اس کی ماں کو ایک لمحے کے لیے بھی یقین نہ تھا کہ اس کے گھر ایک ایسا بیٹا پیدا ہوا ہے جس کا قد بڑھ نہیں رہا ہے۔ جب وہ تھوڑا بڑا ہوا تو اس کے اپنے رشتہ دار اور گلی محلے کے لوگوں نے مذاق اڑانا شروع کیا۔ لوگ اس کو دیکھ کر قہقہے لگاتے۔ ایک دکھیاری ماں اس کو گود میں اٹھائے ہوئے مزاروں پر پھرتی، منتیں مانگتی، پیروں فقیروں سے تعویذ لیتی کہ شاید اس

کے بیٹے کا قد بڑھ جائے۔ قاضی نے بھی سوچ لیا تھا کہ وہ اپنے چھوٹے قد کو اپنی کمزوری کسی بھی حال میں مجبوری نہیں بننے دے گا۔ اس نے سکول جانا شروع کر دیا۔ جب اس نے میٹرک پاس کر لیا تو اس نے فیصلہ کیا کہ اب اس کو خود یہ کام نہیں کرنے دے گا اور وہ نوکری کرے گا۔ سب سے پہلے وہ ایک ہوٹل گیا۔ ہوٹل کے منیجر نے اسے دیکھتے ہی ایک طنزیہ قہقہہ لگایا۔ جب قاضی صاحب نے نوکری کی درخواست کی تو اس نے بڑی نفرت کے ساتھ اسے باہر نکال دیا۔ اس چودہ سالہ لڑکے کے لیے پریشانی کا ایک شدید دورہ پڑا۔ وہ وہاں سے نکلا اور ایک اطالین ڈاکٹر کے پاس چلا گیا جس کا اپنا ایک ہوٹل تھا۔ جب وہ ہوٹل میں بیٹھا اس غیر ملکی ہوٹل کے مالک سے ملنے کا انتظار کر رہا تھا تو وہاں کام کرنے والے پاکستانی ملازم تھے انہوں نے اس پر جملے کسنا شروع کر دیے۔ وہ چپ چاپ بیٹھا سب کی باتیں سنتا رہا۔ آخر جب اسے اس اطالین کے کمرے میں لے جایا گیا تو اس غیر ملکی نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا اور آنے کی وجہ پوچھی۔ اس نے کوئی دوسری بات کیے بغیر قاضی صاحب کو بتایا کہ آج سے وہ خود اس کے پاس رہ کر اس ہوٹل میں نوکری کرے گا۔

وہ خوش خوش گھر واپس لوٹا لیکن اسے پتہ نہیں تھا کہ ابھی زندگی نے اس کے ساتھ کچھ مذاق اور کرنے تھے۔ ابھی اس کی نوکری کی خوشی ختم نہیں ہوئی تھی کہ کچھ عرصے بعد وہ ہوٹل سی ڈی اے کے کنٹرول میں آ گیا۔ اس کے پاکستانی بھائیوں نے اس پر ایک نئے سرے سے انتہائی گھناؤنے مذاق کرنے شروع کر دیے۔ اس اطالین نے بڑی سختی سے سب کو منع کیا ہوا تھا کہ کوئی بھی اس کے ساتھ کوئی بھونڈا سا مذاق بھی نہیں کرے گا۔ اس کے جاتے ہی یہ سلسلہ پھر شروع ہو گیا تھا۔ وہ چپ چاپ اپنے ہی پاکستانیوں کی باتیں برداشت کرتا رہا۔ کچھ دنوں بعد وہ ہوٹل کینیڈا کی ایک فرم نے خرید لیا اور قاضی صاحب کو دوبارہ وہی عزت اور مقام مل گیا جو اس ہوٹل کے اطالین مالک کے دور میں ملا تھا۔

ایک دن قاضی صاحب نے پڑھا کہ ذوالفقار علی بھٹو نام کا کوئی شخص ایک نئی سیاسی جماعت بنا رہا ہے۔ اخبار میں بھٹو صاحب کی پارٹی کا منشور پڑھتے ہوئے ایک جگہ قاضی صاحب کی نظریں رک گئیں۔ اس میں لکھا تھا کہ بھٹو صاحب کی نئی جماعت اس معاشرے کے تمام طبقات کو بغیر کسی امتیاز کے عزت دے گی۔ قاضی صاحب کے لیے یہ نئی بات تھی۔ اب تک انہوں نے ہر جگہ اپنا قد چھوٹا ہونے کی وجہ سے امتیازی سلوک کا ہی سامنا کیا تھا۔ اب کوئی ایک ایسا شخص پیدا ہو گیا ہے جو یہ وعدہ کر رہا ہے کہ وہ

سب کے ساتھ یکساں سلوک کرے گا اور انہیں عزت دے گا۔

یہ سب کچھ سوچ کر قاضی صاحب نے پیپلز پارٹی کو جائن کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ اس معاشرے میں عزت کے ساتھ رہ سکیں۔ انہی دنوں بھٹو صاحب کے کچھ دوست امریکہ سے ملنے کے لیے پاکستان آئے اور وہ اسی ہوٹل میں ٹھہرے جہاں قاضی صاحب کام کرتے تھے۔ بھٹو صاحب نے خورشید حسن میر سے کہا کہ وہ امریکہ سے آنے والے مہمانوں کا خاص خیال رکھیں۔ قاضی صاحب نے ہوٹل کے ملازم ہونے کے ناطے بھٹو صاحب کے ان مہمانوں کی بڑی خدمت کی اور وہ پیپلز پارٹی کے لیڈروں کے قریب آ گئے۔ قاضی صاحب بھٹو صاحب سے اتنے متاثر ہو چکے تھے کہ کسی کو بتائے بغیر وہ ان کی شان میں ایک نظم بھی لکھ چکے تھے۔ کسی نے وہ نظم جا کر بھٹو صاحب کو سنائی تو وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ بھٹو صاحب نے خورشید حسن میر اور نصر اللہ خٹک سے کہا کہ وہ اس شخص سے ان کی ملاقات کروائیں جس نے ان پر یہ نظم لکھی ہے۔ بھٹو صاحب کے علم میں نہیں تھا کہ جس شخص نے یہ نظم لکھی ہے اس کا قد بمشکل تین فٹ تھا۔ ان دونوں نے بھٹو صاحب کو مذاقاً کہا کہ اب ان کی پارٹی واقعی 'Deep rooted' ہے کیونکہ اب ان کی پارٹی میں ایک ایسا ورکر بھی شامل ہو چکا ہے جس کا قد بمشکل تین فٹ ہے!

نصر اللہ خٹک نے قاضی صاحب کو بتایا کہ بھٹو صاحب ان سے ملنا چاہتے ہیں اور وہ اسی کام کے لیے اسلام آباد آ رہے ہیں۔ جب ہوٹل کے عملے میں یہ خبر پھیلی کہ بھٹو صاحب ہوٹل کے ملازم قاضی صاحب سے ملنا چاہتے ہیں تو وہ سب ششدر رہ گئے۔ دوسری طرف قاضی صاحب جو ساری عمر لوگوں کے انتہائی گھٹیا مذاق اور جگتیں سنتے آئے تھے وہ اندر سے خوفزدہ تھے کہ پتہ نہیں بھٹو صاحب انہیں دیکھ کر کیا ردعمل ظاہر کریں۔ ہو سکتا ہے کہ بھٹو صاحب انہیں دیکھ کر شدید مایوس ہوں اور اپنے سامنے تین فٹ قد کے نوجوان کو دیکھ کر ان کے منہ سے بے ساختہ ہنسی نکل جائے۔ قاضی صاحب سوچتے رہے کہ ان کے لیے وہ دکھ اور درد برداشت کرنا مشکل ہو جائے گا اگر بھٹو صاحب جیسے خوبصورت شخصیت کے مالک نے ان کا دوسروں کے سامنے صرف اس وجہ سے مذاق اڑایا کہ ان کا قد چھوٹا ہے۔ قاضی صاحب انہی وسوسوں اور اندیشوں میں گھرے ہوئے تھے کہ انہیں بتایا گیا کہ بھٹو صاحب ہوٹل پہنچ چکے ہیں اور اپنے کمرے میں ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ دھڑکتے دل اور کانپتی ٹانگوں کے ساتھ قاضی صاحب بھٹو صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے جن کے ساتھ مصطفیٰ کھر اور خورشید حسن میر بھی بیٹھے تھے۔ بھٹو صاحب قاضی صاحب کو دیکھ کر فوراً کھڑے ہو گئے۔ مصطفیٰ کھر اور خورشید حسن میر بھی بھٹو صاحب کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ بھٹو صاحب چند قدم آگے بڑھے، قاضی صاحب سے جھک کر ہاتھ ملایا اور بتایا کہ وہ ان سے ذاتی طور پر ملنا چاہتے ہیں۔ جب وہ کمرے میں موجود صوفوں پر بیٹھ گئے اور ماحول ذرا بہتر ہوا تو قاضی صاحب نے بھٹو صاحب کو یہ بات بتا دی کہ وہ ان سے ملنے سے کیوں خوفزدہ تھے۔ بھٹو صاحب کے چہرے کا رنگ اچانک بدل گیا اور تھوڑے سے غصے کے ساتھ بولے کہ آپ نے بھلا یہ کیسے سوچ لیا تھا کہ میں آپ پر اس وجہ سے گھٹیا مذاق کرنا شروع کر دوں گا کہ آپ کا قد چھوٹا ہے۔ بھٹو صاحب نے قاضی صاحب سے کہا کہ آج کے بعد کبھی یہ نہیں سوچنا کہ میرے جیسا بندہ صرف اس وجہ سے لوگوں پر ہنسے گا کہ ان کے قد چھوٹے رہ گئے ہیں۔

جب سلطان محمود قاضی صاحب میرے سامنے بیٹھے آج سے چھتیس سال پہلے کے اس واقعے کو یاد کر رہے تھے کہ کس طرح بھٹو صاحب نے انہیں بے پناہ عزت اور احترام دیا تو میں محسوس کر سکتا تھا کہ ایک عام سیاسی ورکر کے لیے اس کی زندگی میں اس سے بڑا لمحہ کبھی نہیں آ سکتا تھا اور ورکر بھی خصوصاً ایسا جس نے ساری عمر اس معاشرے میں پھیلے اپنے جیسے انسانوں کی جگتوں اور غلیظ جملوں کا سامنا کیا ہو محض اس وجہ سے کہ قدرت نے اسے صرف تین فٹ کا پیدا کیا تھا۔

باتوں باتوں میں قاضی صاحب نے بھٹو صاحب کو بتایا کہ چونکہ وہ اس ہوٹل میں ان کے مہمان ہیں لہٰذا ان کے سارے اخراجات وہ اپنی جیب سے ادا کریں گے۔ بھٹو صاحب قاضی صاحب کی یہ بات سن کر بہت متاثر ہوئے اور بڑی شائستگی سے ان کا شکریہ ادا کر کے انہیں بل دینے سے منع کیا۔

بھٹو صاحب ان سے ملنے کے بعد کراچی چلے گئے۔ پتہ نہیں اس ملاقات کا ان پر کیا اثر ہوا تھا کہ بھٹو صاحب نے کراچی سے قاضی صاحب کو شکریے کا ایک خط لکھا۔

اسی اثناء میں وہ ہوٹل جہاں قاضی صاحب کام کرتے تھے وہ ایک پاکستانی چوہدری نیاز احمد کو بیچ دیا گیا جنہیں کچھ عرصہ قبل جنرل یحییٰ خان نے کرپشن چارجز پر او ایس ڈی کر دیا تھا۔ قاضی صاحب کے اندر ایک سیاسی ورکر جاگ چکا تھا۔ انہوں نے اخبار میں ایک بیان دے کر ہوٹل میں یونین بنانے کا اعلان کیا۔ جب یہ خبر چوہدری نیاز احمد نے پڑھی تو وہ آگ بگولا ہو گئے اور انہوں نے فوری طور پر قاضی

صاحب کو نوکری سے ڈس مس کر دیا۔ جب یہ خبر کسی طرح بھٹو صاحب کے کانوں تک پہنچی تو انہوں نے خورشید میر اور مصطفیٰ کھر سے کہا کہ وہ فوری طور پر چوہدری نیاز سے بات کر کے قاضی صاحب کو نوکری پر بحال کرائیں۔

چوہدری نیاز احمد تک بھٹو صاحب کا یہ پیغام پہنچایا گیا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ کچھ دنوں بعد بھٹو صاحب اسلام آباد آئے اور انہوں نے مصطفیٰ کھر اور خورشید میر کی موجودگی میں چوہدری نیاز احمد سے فون پر درخواست کی کہ وہ قاضی صاحب کی نوکری بحال کر دیں کیونکہ وہ انہیں بہت عزیز ہیں۔ جب چوہدری نیاز احمد نے بھٹو صاحب کی درخواست سنی تو وہ بولے کہ قاضی صاحب نے ان کے خلاف ایک اخباری بیان جاری کیا ہے۔ اس پر بھٹو صاحب نے چوہدری نیاز احمد سے یہ کہا کہ وہ قاضی صاحب کے بیان کی وجہ سے انہیں پہنچنے والی زحمت پر معذرت خواہ ہیں۔

تاہم پتہ نہیں چوہدری نیاز کے ذہن میں کیا بات سمائی ہوئی تھی کہ انہوں نے بھٹو صاحب کی درخواست اور معذرت کو مسترد کر دیا اور قاضی صاحب کو نوکری پر بحال کرنے سے انکار کر دیا۔

چوہدری نیاز احمد کا انکار سن کر بھٹو صاحب بڑے غصے سے بولے:

"ٹھیک ہے چوہدری نیاز صاحب میں نے آپ سے کوئی اتنی بڑی چیز نہیں مانگ لی تھی کہ میرے سوری کرنے کے باوجود بھی آپ قاضی صاحب کو نوکری پر بحال کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔ میں دو مہینے انتظار کر لیتا ہوں پھر آپ کو بھی دیکھ لیں گے۔"

فون بند کر کے بھٹو صاحب قاضی صاحب کی طرف مڑے اور بولے کہ آپ صرف دو مہینے انتظار کریں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

قاضی صاحب نے مسکرا کر بھٹو صاحب سے کہا کہ سر! میں اس ملک میں نئے انقلاب کے لیے سب کچھ بھگتنے کو تیار ہوں۔

ٹھیک دو مہینے بعد بھٹو صاحب اس ملک کے صدر بن گئے۔ صدر بنتے ہی بھٹو صاحب نے فون اٹھایا اور پہلا حکم یہی جاری کیا کہ قاضی صاحب کو نوکری دی جائے۔

پتہ نہیں بھٹو صاحب کے ذہن میں کیا آیا کہ دس ماہ بعد اچانک ایک دن بھٹو صاحب نے کسی سے پوچھا کہ کیا چوہدری نیاز احمد ابھی بھی اس ہوٹل کو چلا رہا ہے جہاں سے قاضی صاحب کو نکال دیا گیا تھا۔ بھٹو صاحب نے فوراً آرڈر دیے کہ چوہدری نیاز کو ہوٹل کی انتظامیہ سے نکال دیا جائے۔

قاضی صاحب کے لیے یہ بڑی بات تھی کہ بھٹو صاحب جیسے لیڈر نے ان کی نوکری کی خاطر ہوٹل کے مالک سے سوری کیا، صدر بنتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ انہیں نوکری دی اور جس شخص نے انہیں نوکری سے نکالا تھا اسے ہوٹل کی انتظامیہ سے نکال دیا۔ قاضی صاحب اب اس پیپلز پارٹی میں شامل ہو چکے تھے جو بھٹو صاحب کی پارٹی تھی۔ جب تک بھٹو صاحب اقتدار میں رہے قاضی محمود سلطان ٹاؤن وارڈ راولپنڈی کے پارٹی صدر رہے۔ جب بھی پارٹی کی میٹنگ ہوتی بھٹو صاحب انہیں بے پناہ عزت دیتے جس سے ان کا اپنی پارٹی میں مقام بہت بلند ہو گیا۔ بھٹو صاحب اس وجہ سے بھی قاضی صاحب کے لیے احتراماً کھڑے ہو جاتے تھے تاکہ پارٹی کا کوئی دوسرا لیڈر یا ورکر ان کی کبھی توہین نہ کرے اور نہ ان پر کوئی جملہ کسے۔

اسی اثناء میں وہ ہوٹل مستقل طور پر بند ہو گیا اور قاضی صاحب ایک مرتبہ پھر سڑک پر آ گئے۔ کسی نے یہ بات بھٹو صاحب کے کانوں تک پہنچائی کہ ان کا پسندیدہ پارٹی ورکر پھر بے روزگار ہو گیا ہے۔ بھٹو صاحب نے فون اٹھایا اور انہیں PTDC ہوٹلز کا ڈپٹی منیجر مقرر کرنے کے آرڈر کر دیے۔

سلطان محمود قاضی ایک صبح اٹھے تو پتہ چلا کہ وہ لیڈر، جس نے انہیں عزت اور نوکری دی تھی اس کی حکومت پر ایک فوجی جنرل نے قبضہ کر لیا ہے اور وہ اس وقت گرفتار ہیں۔ قاضی صاحب کے لیے وقت آ گیا تھا کہ وہ اس شخص کے لیے اپنی وفاداری کا ثبوت دے جس نے اس کی نوکری کی خاطر ہوٹل کے مالک سے سوری تک کر لیا تھا۔ قاضی صاحب نے سارے کام چھوڑ دیے اور پارٹی کے ورکروں کو منظم کرنا شروع ہو گئے۔ گرفتاریوں سے بچانے کے لیے قاضی صاحب نے پیپلز پارٹی کے ورکروں کو اپنے گھروں میں چھپانا شروع کر دیا۔ بھٹو صاحب کی رہائی کے لیے انہوں نے مظاہرے کرانے کا انتظام کیا۔ اپنے گھر کا روٹی پانی چلانے کے لیے وہ نوکری کے ساتھ ساتھ ان سیاسی ورکروں کو بھی اکٹھا کرنے میں لگے ہوئے تھے جو ان دنوں ملک میں مارشل لاء لگنے کی وجہ سے یکدم منتشر ہو گئے تھے۔

ایک دن قاضی صاحب کو پتہ چلا کہ پیپلز پارٹی کے راولپنڈی کے صدر نے ہاتھ کھڑے کر دیے ہیں اور وہ جنرل ضیاء کے خلاف مظاہرہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ پارٹی ورکروں نے بہت منت کی اور انہوں نے قاضی صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ پارٹی کے راولپنڈی چیپٹر کے جنرل

کی کرسی پر براجمان تھے جس نے انہیں دو ماہ کی قید بامشقت سنا دی۔ قید کے علاوہ انہیں تین ہزار روپے جرمانہ بھی کیا گیا۔

میجر نے سر اٹھا کر طنزیہ نظروں سے اپنے سامنے کھڑے تین فٹ کے سیاسی ورکر کو دیکھا۔ اس کے اندر کا روایتی جٹ یار تھوڑی دیر کے لیے باہر نکلا اور بولا کہ مجھے تم پر ترس آ رہا ہے کہ تم جیل کیسے کاٹو گے۔

قاضی صاحب نے آگے سے مسکرا کر جواب دیا کہ میجر صاحب! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں افتخار تاری اور دیگر کی طرح جیل میں آنسو نہیں بہاؤں گا۔ میں بڑی عزت اور شان سے اپنے جیل کے دن گزار کر جنرل ضیاء سے دوبارہ لڑنے کے لیے واپس راولپنڈی کی سڑکوں پر آؤں گا۔

قاضی صاحب کا دل ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ میجر کے کمرے سے نکلنے سے پہلے وہ مڑے اور بولے

"میجر صاحب! آپ لوگوں کا کام اس ملک کی سرحدوں اور اس کی عوام کی حفاظت کرنا ہے۔ آپ کیسے لوگ ہیں۔ آپ نے ایک ایسے شخص کو پھانسی لگا دی جو آپ کے نوے ہزار فوجی بھارتی جیلوں سے واپس لے آیا تھا۔"

میجر کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ اور تو کچھ نہیں کر سکتا تھا اس نے حکم دیا کہ اس تین فٹ کے مجرم کو میانوالی جیل بھیج دیا جائے۔

قاضی صاحب نہ جیل میں روئے اور نہ ہی وہاں ماتم کیا کہ ان کے ساتھ کتنا بڑا ظلم کیا گیا ہے۔ جب وہ بڑی بہادری سے دو ماہ بعد جیل کاٹ کر رہا ہوئے تو پارٹی کے ورکروں نے انہیں کندھوں پر اٹھا لیا۔ وہ اب ان کے لیے مزاحمت کا ایک نشان بن کر ابھرے تھے۔ پارٹی کے ورکر یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک تین فٹ کا انسان اتنی بہادری اور ہمت کا مظاہرہ کرے گا۔

قاضی صاحب مارشل لاء حکومت کے لیے ایک مستقل دردِ سر بن چکے تھے۔ باقی باتیں تو چھوڑیں۔ مارشل لاء ڈپٹی ایڈمنسٹریٹر جنرل کے ایم عارف نے پی ڈی سی کی انتظامیہ پر دباؤ ڈالا کہ وہ قاضی سلطان محمود کو نوکری سے نکال دیں۔ (یہ وہی جنرل ہیں جنہوں نے کتاب Working

With Zia لکھی ہے۔)

قاضی صاحب اب ان باتوں سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ اب ان کے لیے زندگی کا مقصد سرکاری نوکری کرنا نہیں بلکہ اس بھٹو کی پارٹی کے لیے کام کرنا تھا جس نے نہ صرف انہیں زندگی میں پہلی دفعہ عزت دی تھی بلکہ انہیں نوکری پر بحال کرانے کے لیے ہوٹل کے منیجر سے سوری تک کیا تھا۔

قاضی صاحب کو پتہ نہیں تھا کہ ابھی بھٹو صاحب کے عشق میں انہوں نے کچھ مزید امتحان بھی پاس کرنے تھے۔ 3 مارچ 1981ء کو جونہی پی آئی اے کے طیارے کے اغوا کی خبر پھیلی تو سب سے پہلے قاضی صاحب کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ راولپنڈی جیل سے انہیں گوجرانوالہ جیل بھیج دیا گیا۔ 8 اپریل کو انہیں آخر شاہی قلعے لاہور بھیج دیا گیا۔ جب قاضی سلطان شاہی قلعہ پہنچے تو انہیں پتہ چلا کہ وہاں فیصل صالح حیات، جہانگیر بدر، شفقت محمود اور دیگر پارٹی لیڈران پہلے سے ہی وہاں قید تھے۔ ان دنوں شاہی قلعہ پیپلز پارٹی کے ورکروں کے لیے ایک خوف اور دہشت کی علامت بن چکا تھا لیکن قاضی صاحب پھر بھی تین ماہ تک وہاں رہے۔

جب قاضی صاحب جیل سے واپس آئے تو انہیں ایک دفعہ پھر 27 دسمبر 1981ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ اب کی دفعہ ان پر ایک پولیس کانسٹیبل کو قتل کرنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ شاید کسی کو کوئی تھوڑی سی شرم آ گئی تھی کہ بھلا تین فٹ کا ایک انسان چھ فٹ کے کانسٹیبل کو کیسے قتل کر سکتا تھا لہٰذا اسے ایک ہفتے بعد رہا کر دیا گیا۔

قاضی صاحب جیل سے آئے تو انہوں نے دوبارہ سیاسی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ 25 مارچ 1982ء کو انہیں ایک مرتبہ پھر گرفتار کر لیا گیا۔ راولپنڈی سے انہیں لاہور لے جایا گیا۔ کچھ دن انہیں سی آئی اے کے چونا منڈی سنٹر میں رکھا گیا۔ وہاں سے انہیں ایک دفعہ پھر شاہی قلعے بھیج دیا گیا۔ مارشل لاء حکومت کا دل اس سے بھی نہیں بھرا۔ انہوں نے قاضی صاحب کو لال قلعہ بھیج دیا جہاں بھارتی جاسوسوں سے تفتیش کی جاتی تھی۔ قاضی صاحب کو وہاں ایک 4x7 فٹ کے ایک تاریک کمرے میں پھینک دیا گیا۔ وہ پندرہ دن تک اس کمرے میں تشدد اور ذلالت برداشت کرتے رہے۔ لال قلعے سے نکال کر انہیں دوبارہ شاہی قلعے لایا گیا اور آخر میں انہیں کوٹ لکھپت جیل بھیج دیا گیا۔ انہیں سب سے خطرناک قیدیوں کی فہرست میں ڈال دیا گیا۔ وہاں ہر رات انہیں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں

قاضی صاحب ایک مطمئن انسان ہیں۔ وہ اپنے بچوں اور خاندان کے دیگر لوگوں کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ لوگ اب ان کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ وہ اس بات پر بہت فخر کرتے ہیں کہ پیپلز پارٹی کے ورکر ہیں اور سب سے بڑھ کر ذوالفقار علی بھٹو سے لے کر نصرت بھٹو، بینظیر بھٹو زرداری صاحب تک سب لوگ ان کی عزت کرتے رہے ہیں۔

میں نے قاضی صاحب سے پوچھا کہ اب وہ آنے والے دنوں میں اپنا کیا سیاسی مستقبل دیکھ رہے ہیں تو وہ بولے کہ میری زندگی کی خواہش ہے کہ میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر سینیٹر بنوں۔ 2003ء کے مارچ میں ہونے والے انتخابات میں زرداری صاحب نے کوشش کی تھی کہ مجھے پارٹی کا ٹکٹ مل جائے لیکن پنجاب میں سیٹیں کم ہونے کی وجہ سے میرا نام ڈراپ کر دیا گیا تھا۔

زرداری صاحب واقعی یاروں کے یار ہیں۔ وہ 2003ء میں قاضی سلطان محمود کو پنجاب سے سینیٹ کا ٹکٹ تو نہ دلوا سکے لیکن بینظیر بھٹو کے قتل کے بعد جب 2008ء میں وہ پارٹی کے کو چیئرمین بنے تو انہوں نے اپنے پہلے چند کاموں میں سے جو ایک کام کیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے قاضی سلطان محمود کو پیپلز پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کا ممبر بنا دیا جہاں یوسف رضا گیلانی، مخدوم امین فہیم، راجہ پرویز اشرف، صفدر عباسی، رحمان ملک، نواب یوسف تالپور، قائم علی شاہ، شاہ محمود قریشی، احمد مختار، رضا ربانی، خورشید شاہ جیسے لوگ بیٹھتے ہیں۔ میرا خیال ہے آصف زرداری نے بھٹو کے اس سیاسی ورکر کو جس کو جنرل ضیاء کو قتل کرنے کی سازش کے جرم میں پانچ سال سزا دی گئی تھی، وہ عزت دی ہے جو انہیں شاید بینظیر بن کر بھی نہ ملتی۔

جنرل محمد امجد

غالباً 2003ء کی بات ہے کہ میں اور انگریزی اخبار ڈان کے دوست رپورٹر ارشد شریف جو آج کل ڈان کے انگریزی چینل ڈان نیوز کے اسلام آباد میں بیورو چیف ہیں، اکٹھے قومی اسمبلی کا وقفہ سوالات کرتے تھے۔ ارشد شریف بہت ہی بااخلاق صحافی ہیں۔ وہ ان صحافیوں میں سے ہیں جن کی میں بے پناہ عزت کرتا ہوں۔

ایک دن میں وقفہ سوالات سے ذرا لیٹ ہوا تو میں نے ارشد شریف کو قومی اسمبلی کی لابی میں تیزی سے جاتے ہوئے دیکھا۔ میں ان کے پیچھے دوڑا تو پتہ چلا کہ موصوف اس وقت وزارت دفاع کے پارلیمانی سیکرٹری میجر تنویر حسین (گلوکارہ طاہرہ سید کے بھائی) کے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ میرے پوچھنے پر ارشد بتانے لگے کہ دراصل تھوڑی دیر پہلے ایک سوال کے جواب میں میجر صاحب نے قومی اسمبلی کو بتایا تھا کہ فوجی فاؤنڈیشن کی ایک شوگر مل کی فروخت میں خاصی بے ضابطگیاں ہونے پر تحقیقات جاری ہیں۔

میں حیران ہوا کہ اس طرح کی خرید و فروخت اور اس میں بے ضابطگیاں بڑی عام سی بات ہے۔ ارشد نے میری طرف دیکھا اور کہا جناب عالی! یہ کوئی عام بات نہیں ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ فوجی فاؤنڈیشن کا ایم۔ڈی کون ہے۔ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو ارشد شریف بولے کہ حضور اس لیے آپ

اس خبر کی اہمیت نہیں سمجھ رہے۔ جنرل محمد امجد اس فوجی فاؤنڈیشن کے چیئرمین ہیں جس پر یہ الزام لگ رہا ہے کہ اس کی فروخت میں خاصی بے ضابطگیاں ہوئی ہیں۔

میرے ذہن میں فوری طور پر جنرل امجد کا نام کلک نہیں ہوا۔ ارشد نے مسکراتے ہوئے کہا کہ جناب یہ وہی موصوف ہیں جو پہلے نیب کے چیئرمین تھے اور جنہوں نے احتساب کے نام پر 12 اکتوبر 1999ء کے بعد جو بھی ان کے ہاتھ چڑھا انہوں نے اسے اٹھا لیا۔ گرفتاری پہلے کی گئی اور الزامات بعد میں عائد کیے گئے۔

میں چونک پڑا۔ میں نے ارشد سے کہا استاد یہ تو واقعی بڑی خبر ہے۔

خیر، مختصر تھوڑی سی ہماری ملاقات تمام ہوئی۔ ہم دونوں نے بیٹھ کر وہ خبر بنائی۔ اس خبر کی مختصر تفصیلات کچھ یوں تھیں کہ سندھ میں فوجی فاؤنڈیشن کی ایک اپنی شوگر مل تھی۔ جنرل امجد اس کے ایم۔ ڈی بنے تو اسے فروخت کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ دو تین پارٹیوں سے بات چیت ہوئی۔ ایک پارٹی نے 37 کروڑ میں وہ مل خریدنے میں دلچسپی ظاہر کی۔ دوسری پارٹی نے اس کی بولی تیس کروڑ روپے لگائی۔ فوجی فاؤنڈیشن نے وہ شوگر مل تیس کروڑ روپے والے کے ہاتھ بیچ دی۔ اس خوش قسمت انسان نے دو تین دن بعد وہی شوگر مل 37 کروڑ بولی لگانے والی پارٹی کو بیچ دی۔ یوں راتوں رات اس نیک انسان نے بغیر کچھ کیے سات کروڑ روپے کما لیے۔ بعد میں پتہ چلا کہ جن صاحب کو یہ تیس کروڑ روپے کی مل بیچی گئی تھی وہ جنرل صاحب کے خیر خواہوں میں سے تھے۔

جب یہ خبر ڈان اور دی نیوز میں چھپی تو اس پر خاصا واویلا ہوگیا۔ سینیٹ کے اجلاس میں فرحت اللہ بابر نے اس پر اچھی خاصی تقریر کی اور معاملے کو قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے دفاع میں بھیج دیا گیا۔

اس سٹوری کے چھپنے کے اگلے دن بعد فوجی فاؤنڈیشن نے انگریزی اخباروں میں ایک بہت بڑا اشتہار دیا جس میں بغیر اس بات کے انکار کیے کہ سرکاری طور پر اس ڈیل کے خلاف تحقیقات ہو رہی تھیں محض یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ سب اچھا تھا۔

آصف زرداری، یوسف رضا گیلانی اور دیگر اپوزیشن کے رہنما، جیلوں میں جنرل امجد کی چلائی ہوئی نیب کے ہاتھوں سزائیں بھگت رہے تھے۔ آج جنرل امجد خود کرپشن کے الزامات کا سامنا کر رہے تھے۔ یوں پیپلز پارٹی نے اس سکینڈل کو خوب اچھالنے کا فیصلہ کیا اور بات بڑھنی شروع ہوگئی۔

ایک دن میں قومی اسمبلی میں تھا کہ مجھے اعلیٰ پائے کی جرنلسٹ بینا سرور کا فون آیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ جنرل امجد ان کے انکل ہیں اور آج کل ان خبروں کی وجہ سے بڑے پریشان ہیں۔ بینا نے مجھے اتنا کہا کہ آپ اگر مناسب سمجھیں تو ان کا پوائنٹ آف ویو لے لیں۔ باقی آپ کی مرضی کہ آپ نے کیا اور کیسے لکھنا ہے۔

میں بینا سرور کی اس بات کی داد دوں گا کہ انہوں نے مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں کہا کہ چونکہ جنرل امجد ان کے انکل ہیں لہٰذا میں کچھ ان کا خیال کروں جیسے عموماً ہم صحافی لوگ ایک دوسرے کو اپنے دوستوں یا قریبی رشتہ داروں کو اس طرح کی صورتحال میں پار کرتے رہتے ہیں۔ وہ ہمارے جنگ گروپ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ صحافت میں مجھ سے بہت سینئر ہیں لہٰذا میں توقع کر رہا تھا کہ شاید وہ مجھے اپنے انکل پر کچھ ہاتھ ہولا رکھنے کا کہیں گی لیکن انہوں نے خالصتاً ایک پروفیشنل بات کی کہ مجھے ان کا پوائنٹ آف ویو بھی لے لینا چاہیے۔

بات چل نکلی ہے تو میں آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ شاید بینا سرور کو یاد نہ ہو کہ 90 کی دہائی کے وسط کی بات ہے، وہ لاہور میں دی نیوز آن سنڈے کی انچارج تھیں۔ میں ان دنوں نیا نیا صحافت میں آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں دی نیوز کے لاہور میں واقع دفتر میں دی نیوز آن سنڈے کے ہی ہمارے ملتان کے اچھے صحافی خالد حسین سے ملنے چلا گیا۔ خالد حسین سے تو ملاقات نہ ہوئی تاہم بینا سرور سے مل لیا۔ وہ اس وقت کمپیوٹر پر بیٹھی کام کر رہی تھیں۔ تمام روایتی صحافیوں کی طرح انہوں نے بھی کمپیوٹر سکرین سے نظریں ہٹائے بغیر مجھ سے دو تین منٹ بات کی۔ مجھ سے پوچھا کہ میں ملتان میں بیٹھ کر کس طرح کی رپورٹنگ کر سکتا ہوں۔ میں نے دو تین آئیڈیے انہیں بتائے۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ان دنوں ایم کیو ایم ملتان میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بینا سرور بولیں کہ اب اس کا کیا فائدہ؟ ایم کیو ایم کا تو تختہ پٹ گیا تھا۔ ان کو تو ملتان سے کوئی اچھا رسپانس نہیں ملا تھا۔ اب مردہ گھوڑے میں جان ڈالنے کا کیا فائدہ۔ دو تین منٹ کی گفتگو کے بعد میں نے اجازت لی کیونکہ مجھے احساس ہوگیا تھا کہ وہاں دال نہیں گلنے والی۔

مجھے یقین ہے کہ بینا سرور کو یہ ملاقات ہرگز یاد نہیں ہوگی کیونکہ اس طرح کے کئی نوجوان گلی محلوں سے آ کر اخباروں کے دفتروں میں پھرتے رہتے ہیں اور میں بھی ان میں سے ایک تھا۔

جنرل ہیں اور میں ایک صحافی ہوں اس وجہ سے یقیناً آپ کا خیال کرتا ہوں کہ آپ ہماری بہتر صحافی [illegible] سرور کے اہل ہیں۔

میں رپورٹر کی حیثیت سے کسی شخص کو مشورے دینے پر یقین نہیں رکھتا۔

اتنی دیر میں میں نے محسوس کیا کہ لوہا گرم تھا۔ جنرل صاحب میری باتیں سننے کے موڈ میں تھے۔ میری گفتگو کا رخ بدلا اور میں نے تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد انہیں اس بات پر راضی کر لیا کہ مجھے اس دور کی کچھ کہانیاں بتائیں جب وہ نیب کے چیئرمین تھے۔

جنرل امجد بار بار اپنے امیج کے بارے میں بہت فکرمند تھے جو ان کے بقول میری خبروں سے بہت بری طرح تباہ ہوا تھا۔ اب وہ چاہتے تھے کہ اس امیج کو دوبارہ بہتر کیا جائے۔

میں دل ہی دل میں مسکرایا کہ بھلا جو چیز ایک دفعہ بگڑ جائے اسے کیسے ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔

میں نے کہا کہ جنرل صاحب! اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آپ مجھے ذرا کھل کر نیب کے چیئرمین کی حیثیت سے کچھ واقعات سنائیں تاکہ لوگوں کو پتہ چلے کہ آپ کتنے اچھے تھے اور آپ کو کیوں اور کیسے وہاں سے ہٹایا گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ جنرل امجد ان دنوں کے بارے میں بات کرنے میں کچھ تذبذب کا شکار تھے۔ خیر، میں نے بھی ہمت نہیں ہاری اور یوں جنرل امجد پہلی دفعہ کسی صحافی کو انٹرویو دینے کے لیے تیار ہو گئے۔

جنرل امجد نے اپنی کرسی سے ٹیک لگائی۔ وہ اپنے ماضی میں کھو گئے اور میں کافی کی چسکیاں لینے لگا۔

12 اکتوبر 1999ء کو جنرل امجد اس وقت میجر جنرل تھے، شام کو گالف کھیل کر راولپنڈی میں واقع اپنے گھر واپس گئے تو انہیں پتہ چلا کہ جنرل مشرف کو واپس [illegible] کر کے جنرل ضیاء الدین بٹ کو آرمی چیف لگا دیا گیا تھا۔ [illegible] جنرل امجد کے جنرل مشرف اور جنرل بٹ دونوں سے اچھے تعلقات تھے۔ وہ جنرل مشرف کو 1985ء سے جانتے تھے [illegible]

[illegible]

جنرل امجد جنرل مشرف کے ساتھ [illegible]

بہت ہی قریب تھے کہ وہ جی ایچ کیو میں بیٹھ کر بہت سارے اپنے معاملات ایسی کرتے تھے جن کا آرمی چیف جنرل مشرف سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

میں نے جنرل امجد سے پوچھا کہ ان کا اپنا ذاتی خیال کیا تھا کہ فوج کو مارشل لاء لگانا چاہیے تھا۔ وہ کہنے لگے کہ آرمی مختلف انداز میں کام کرتی ہے۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے انہوں نے کہا کہ جب 1988ء میں جنرل ضیاء کی موت کے بعد جنرل اسلم بیگ نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مارشل لاء نہیں لگائیں گے تو پوری فوج نے انہیں سپورٹ کیا، جبکہ اسی فوج نے جنرل مشرف کا ساتھ دیا جب انہوں نے 12 اکتوبر کو مارشل لاء لگا دیا۔ اس سے آپ کو آرمی کی تربیت کا اندازہ ہو جائے گا۔

ایک دن جنرل امجد کو بلا کر یہ کہا گیا کہ آج کے بعد انہوں نے پاکستان میں بے رحمانہ قسم کا احتساب کرنا ہے۔

جنرل امجد بڑے حیران ہوئے کہ آخر انہیں جنرل مشرف نے اس کام کے لیے کیوں چنا تھا۔ اپنی تقریر میں جنرل مشرف نے ان کے کندھوں پر ذمہ داری اور بڑے عہدے جب میڈیا کے لوگوں کو انہوں نے خود یہ بتایا کہ ایک دن انتہائی ایماندار اور اچھے آرمی آفیسر کو نیب کا چیئرمین لگایا گیا تھا۔ جنرل امجد کو جنرل مشرف کی 16 اکتوبر 1999ء کو کی گئی تقریر سے یہ اندازہ ہوا کہ فوج اب کس رخ پر سیاستدانوں اور بیوروکریٹس کا احتساب کرنا چاہتی تھی۔

جنرل مشرف نے جنرل امجد کو بتا کر کوئی بات نہیں سمجھائی کہ انہوں نے کیا کرنا تھا۔ جنرل امجد کو صرف اتنا بتایا گیا کہ انہوں نے ہر ایک کے خلاف کارروائی کرنی تھی اور احتساب کرنا تھا۔

جنرل مشرف کے ان الفاظ نے جنرل امجد کو وہ اعتماد دیا کہ پھر انہوں نے مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا۔ جنرل امجد کے لیے سب سے آسان ٹارگٹ وہ لوگ تھے جنہوں نے بینکوں کے قرضے واپس نہیں کیے تھے اور ان کی فہرست فوری طور پر مل گئی تھی۔ جنرل صاحب نے فوری طور پر بینکوں کے [illegible] ایک ایک کو بلانا شروع کیا اور انہیں کہا گیا کہ وہ اپنے اپنے ان قرضوں کی تفصیلات دیں جو انہوں نے [illegible] واپس نہیں کیے ہیں۔ جنرل امجد نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ [illegible]

[illegible] 186 [illegible]

[illegible] 16 [illegible] 1999ء [illegible]

جمالی صاحب کے چہرے پر پھیلی ہوئی اداسی اور مایوسی ایک واضح پیغام دے رہی تھی کہ [illegible] سردار کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ ان کے ساتھ دھوکہ ہوا تھا۔ استعفیٰ دینے سے صرف ایک دن پہلے ہی انہوں نے ہمارے صحافی دوست ابصار عالم کو یہ انٹرویو دیا تھا کہ وہ کہیں نہیں جا رہے تھے اور نہ ہی ان سے کسی نے استعفیٰ مانگا تھا۔ شاید انہیں اس چیز کا احساس اور دکھ زیادہ تھا کہ کسی نے ان کے ساتھ دھوکہ کیا تھا۔ جب پوری دنیا میں ان کے استعفیٰ کی خبریں گردش کر رہی تھیں تو طاقت کے ایوانوں میں بیٹھے ہوئے لوگ انہیں یہ یقین دلا رہے تھے کہ یہ سب جھوٹ تھا۔ وہ ہی وزیر اعظم رہیں گے۔ ایک طرف ایک نیا وزیر اعظم ڈھونڈا جا رہا تھا تو دوسری طرف انہیں یہ یقین دہانیاں کرائی جا رہی تھیں کہ وہ تسلی رکھیں۔ جمالی صاحب کے کمرے میں ایک سوگ کی سی کیفیت واضح طور پر محسوس کی جا سکتی تھی۔ میں بھی پہلے سے بیٹھے ہوئے سوگواروں کی قطار میں بیٹھ گیا۔ سلام دعا کے بعد جمالی صاحب نے اسلام آباد کے ایک اردو اخبار کے مشہور صحافی کا نام لیا اور کہا کہ شکر کریں ان کی وجہ سے میری ملاقات ہو رہی تھی۔ ان کا پروگرام تو بلوچستان جانے کا تھا لیکن اس صحافی دوست نے اصرار کیا کہ آج شام ان کے گھر پر کھانے کی دعوت کھا کر ہی وہ بلوچستان جائیں۔ وہ صحافی دوست کے اصرار کے سامنے انکار نہیں کر سکے اور یوں آج شام انہوں نے اس کے گھر پر کھانا کھانے جانا تھا۔ جونہی میں نے جمالی صاحب سے رسمی سوال و جواب کرنے شروع کیے تو انہوں نے اپنے ٹیلی فون آپریٹر کو کہا کہ اب کسی کو اندر کال نہیں ملانی۔ ہماری بات چیت کو چند لمحے ہی گزرے تھے کہ ان کے انٹرکام کی بیل بجی۔ جمالی صاحب نے غصے سے فون اٹھا کر آپریٹر کو کہا کہ میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ اندر فون نہیں دینا۔ ایک لمحہ آپریٹر کی بات سن کر چپ رہے۔ ریسیور کو پکڑ لیا۔ دوسری طرف سے کسی سے مختصر سی بات کی۔ ان کے چہرے کا رنگ یکدم فق ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے کوئی ایسی بات کہہ دی تھی جس کی وہ توقع نہیں کر رہے تھے۔

میں نے یہ سمجھا کہ شاید یہ فون انہیں کسی سیکرٹ ایجنسی کی طرف سے آیا تھا جنہوں نے مجھے انٹرویو دینے سے روکنے کی کوشش کی تھی کہ جمالی صاحب شاید کہیں ضرورت سے زیادہ انکشافات نہ کر دیں۔

میں چپ رہا اور کوئی بات نہیں پوچھی۔

جمالی صاحب تھوڑی دیر اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے رہے۔ مجھے کچھ نہیں آ رہی تھی کہ ٹیلی فون کرنے والا کون تھا اور اس نے ایسی کون سی بات کہہ دی تھی کہ جس سے جمالی صاحب یکدم بے چین اور مزید افسردہ ہو گئے تھے۔ آخر ان سے رہا نہ گیا اور بول پڑے کہ یہ میرے اسی صحافی دوست کا فون ہے جس نے آج اپنے گھر پر میرے کھانے کی دعوت رکھی ہوئی تھی۔ وہ یہ کہہ رہا تھا کہ آج اسے کوئی ضروری کام تھا لہٰذا یہ دعوت کینسل۔ جب جمالی صاحب پھر کبھی بلوچستان سے واپس اسلام آباد آئیں گے تو وہ دوبارہ انہیں گھر کھانے پر بلائے گا۔

جمالی صاحب کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور دوسرا جا رہا تھا۔ وہ محض اپنے اس صحافی دوست کے اصرار پر دو دن سے بلوچستان ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے اور اب وہی دوست انہیں یہ کہہ رہا تھا کہ اسے کوئی اور ضروری کام پڑ گیا ہے۔

اتنی دیر میں فون کی بیل دوبارہ بجی۔ جمالی صاحب نے غصے سے ہیلو کیا اور صرف اتنا کہا کہ میں ان سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ پتہ چلا کہ یہ وہی صحافی دوست تھے جنہوں نے جمالی صاحب کو دوبارہ فون کیا تھا۔

جمالی صاحب کو شاید پہلا دھچکا اس وقت لگا ہوگا جب جنرل مشرف کا انہیں یہ پیغام ملا ہوگا کہ وہ استعفیٰ دے دیں اور اب انہیں اپنے صحافی دوست کی کال ریسیو کر کے کہ اس نے رات کا کھانا کینسل کر دیا تھا دوسرا بڑا دھچکا لگا تھا۔ انہیں شاید پہلی دفعہ یہ احساس ہوا کہ اب وہ اس ملک کے وزیر اعظم نہیں رہے تھے اور صحافی دوست جو گھنٹوں پرائم منسٹر ہاؤس کے ارد گرد ہی منڈلاتے پھرتے تھے کہ [illegible] کب جمالی صاحب ملنے کے لیے بلا لیں، اب انہیں اپنے گھر پر کھانا کھلانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس صحافی دوست کا پیغام جمالی صاحب کے لیے واضح تھا کہ اب وہ وزیر اعظم نہیں رہے لہٰذا ایک روایتی صحافی سے ایک روایتی سلوک کی توقع رکھیں۔

جمالی صاحب کے ساتھ وہ گھنٹے بلوچستان ہاؤس میں گزارنے کے بعد میں سیدھا گھر آیا [illegible] پاکستان مسلم لیگ (ق) کے لیڈر [illegible] کے بیٹے کے [illegible] ملاقات ہوئی [illegible] صحافی [illegible] انہوں نے [illegible] میں نے ان سے پوچھا کہ جناب آپ [illegible]

میں نے ایک دن جمالی صاحب سے پوچھا کہ ان کے بارے میں یہ [illegible]
اپنے آخری دنوں میں ایوانِ صدر کے چند افسروں کو قبول کرنے کے لیے اپنا [illegible]
پھنسا دیا [illegible] جمالی صاحب کے [illegible]
[illegible] کہ وہ اپنے دوستوں کو اس لیے اپنا آپ [illegible]
[illegible] مستقبل میں انہیں بنانے کے بعد کوئی [illegible]
مطمئن رہیں۔

میں نے بڑی عجیب سی بات محسوس کی کہ اتنی ساری بے عزتی، جھاڑ، جھپٹ اور چیخ پکار کے باوجود بھی جمالی صاحب اس بات پر بڑا فخر محسوس کر رہے تھے کہ ان کے استعفیٰ دینے کے بعد صدر مشرف نے انہیں فیملی کے ساتھ ایوانِ صدر میں کھانا دیا تھا۔ جمالی صاحب نے اپنی آواز میں کچھ فخریہ پیدا کی کہ وہ پاکستانی تاریخ کے شاید پہلے وزیراعظم تھے جنہیں بڑی عزت و تکریم سے وزیراعظم ہاؤس سے رخصت کیا گیا تھا ورنہ ماضی میں تو بھٹو سے لے کر جونیجو، بینظیر بھٹو اور نواز شریف کو انتہائی ذلیل کر کے یہاں سے رخصت کیا گیا اور جیلوں میں ڈالا گیا۔

ایوانِ صدر میں لگی کھانے کی بڑی میز پر بیٹھے ہوئے جمالی نے جنرل مشرف کو بتایا کہ وہ جنرل ایوب اور ضیاء کے ادوار میں جیلوں میں بھی رہے تھے۔

جنرل مشرف کو حیران دیکھ کر جمالی نے انہیں اپنی زندگی میں حاصل کیے گئے چند تجربوں کی کہانی سنانا شروع کی۔ شاید وہ انہیں ابھی بھی جبکہ وہ وزیراعظم ہاؤس سے نکالے جا چکے تھے، متاثر کرنے کے چکر میں تھے۔

جمالی نے مشرف کو بتایا کہ ایک سیاستدان کی زندگی میں تین قسم کے دوست ہوتے ہیں۔ کالج/یونیورسٹی، جیل اور سیاست کے دنوں کے دوست۔

جمالی کے بقول کہ ایک سیاستدان اپنی سیاسی زندگی میں بنائے گئے دوستوں پر کبھی بھی اعتماد نہیں کر سکتا۔ آپ جیل اور کالج لائف کے دوستوں پر اب بھی بھروسہ کر سکتے ہیں۔

جنرل مشرف چپ چاپ اپنے ہی ہاتھوں سے رخصت کرائے گئے ایک ایسے وزیراعظم کی باتیں سن رہے تھے جو شاید انہیں یہ پیغام دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ جنرل صاحب اگر آج میرے سیاسی دوستوں نے مجھے پھنسوا دیا ہے [illegible] تو کسی دن آپ کے بھی سیاسی دوست آپ کو بھی دھوکہ دے دیں گے۔

جمالی کی یہ بات چار سال بعد اس وقت بھی درست ثابت ہوئی جب چوہدری شجاعت نے [illegible] پاکستان مسلم لیگ کی قیادت [illegible] چوہدری شجاعت کو [illegible] جنرل مشرف کو ان کی ضرورت بھی نہیں [illegible] جنرل مشرف کی اب مجھے یہ پتہ نہیں ہے کہ جب 2007ء کے آخری دنوں میں چوہدری شجاعت نے جنرل مشرف کے کہنے پر پارٹی کی قیادت چھوڑنے سے انکار کیا تھا تو جنرل مشرف کو جمالی کی چار سال پہلے والی یہ بات یاد آئی تھی یا نہیں کہ سیاست میں بنائے گئے دوست کبھی بھی قابلِ اعتبار نہیں ہوتے۔

باتوں باتوں میں جمالی صاحب نے مجھے یہ بھی بتایا کہ جب وہ پہلی دفعہ امریکہ جانے لگے اور انہوں نے جن صحافیوں کی لسٹ تیار کی ان میں سے چار صحافیوں کے نام ایوانِ صدر نے کاٹ دیے۔ ان چار صحافیوں کے نام کاٹنے کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ وہ جنرل مشرف کے خلاف لکھ رہے تھے۔

جب میں یہ انٹرویو جمالی صاحب سے بلوچستان ہاؤس میں کر رہا تھا اس سے کچھ روز پہلے ہی شوکت عزیز پر اٹک میں خودکش حملہ ہوا تھا جب وہ ایم این اے کا الیکشن لڑنے کے لیے ایک انتخابی جلسے سے خطاب کرنے جا رہے تھے۔ انہیں ایم این اے اس لیے بنایا جا رہا تھا تاکہ وہ جمالی کی جگہ اس ملک کے وزیراعظم بن سکیں اور اس دوران چالیس دنوں کے لیے چوہدری شجاعت حسین کو وزیراعظم بنایا گیا تھا جن کے بارے میں اسلام آباد میں یہ مذاق مشہور تھا کہ وہ پاکستان کے پہلے وزیراعظم ہیں جو اپنی مقررہ مدت چالیس دن پوری کر کے باعزت طریقے سے گھر چلے جائیں گے۔

میں نے کہا کہ جمالی صاحب! مجھے یہ بات سمجھ نہیں آ رہی کہ شوکت عزیز پر ہی کیوں قاتلانہ حملہ کیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی جا رہی ہے کہ وہ جنرل مشرف کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے اس لیے ان پر خودکش حملہ کیا گیا۔ میں نے کہا اگر یہی معیار ہے تو شوکت عزیز پر حملے کا سن کر جمالی صاحب آپ پر اور شجاعت حسین پر بھی اسی طرح کا حملہ ہونا چاہیے تھا۔

میرا اندازہ درست ہوا سوال سن کر جمالی صاحب چونکے اور انہوں نے اس کے جواب میں مجھے شوکت عزیز پر حملے کی چند وجوہات بتائیں۔

اتنی دیر میں میز پر کھانا لگ چکا تھا۔ میاں صاحب کی یہ کوشش تھی کہ ہر مہمان کی پلیٹ میں پہلے کھانا ڈال دیا جائے۔ اتنی دیر میں کسی نے آ کر میاں صاحب کو بتایا کہ اے آر وائی سے ڈاکٹر شاہد مسعود ان سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ میاں صاحب نے کھانے کی ٹیبل پر ان سے بات کی اور بار بار میری طرف دیکھا۔ میں بڑا حیران ہوا کہ وہ مجھے ایسی نظروں سے کیوں دیکھ رہے تھے۔

ڈاکٹر شاہد مسعود ان سے شہباز شریف کی امریکہ روانگی کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ پاکستان میں بہت بڑی خبر تھی کہ شہباز شریف کو سعودی عرب چھوڑ کر امریکہ جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ میاں صاحب اور وہاں موجود لوگوں کی یہ کوشش تھی کہ یہ خبر اس وقت تک آؤٹ نہ ہو جب تک شہباز شریف کا جہاز جدہ ایئر پورٹ سے اڑ نہ جائے کہ کہیں آخری مرحلے پر ہی جنرل مشرف کی حکومت کوئی مسئلہ نہ پیدا کر دے۔

میاں صاحب نے ڈاکٹر شاہد مسعود کا فون بند کرتے ہی مجھ سے پوچھا کہ رؤف صاحب! آپ نے ہی یہاں سے بیٹھے ہوئے یہ خبر ڈاکٹر شاہد مسعود کو لیک کی تھی۔

ایک لمحے کے لیے میں لرز کر رہ گیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے بھرے چوک میں ننگا کر دیا ہو۔ میری تو اس وقت ڈاکٹر شاہد مسعود سے جان پہچان ہی نہ تھی۔ سب سے بڑھ کر میں اس خبر کو اپنی Exclusive سمجھ رہا تھا اور میں نے سوچا ہوا تھا کہ کھانے کے بعد میاں صاحب سے اجازت لے کر یہ خبر اپنے اخبار دی نیوز کے لیے فائل کروں گا۔ بھلا میں کیونکر اتنی بڑی خبر ڈاکٹر شاہد مسعود کو دوں گا۔

میں نے اپنے آپ کو بڑی مشکل سے سنبھالا اور میاں صاحب کو بتایا کہ میں تو ڈاکٹر صاحب کو ذاتی طور پر جانتا بھی نہیں ہوں اور دوسرے ایک صحافی کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اتنی بڑی خبر اپنے نام سے سامنے لائے نہ کہ کسی اور صحافی کو دے کہ وہ اس کا کریڈٹ لے۔

میاں صاحب نے چپ کر کے میری بات تو سن لی لیکن مجھے اندازہ ہوا کہ انہیں ابھی بھی شک تھا کہ شاید اتنی بڑی "بریکنگ" ان کے گھر میں بیٹھ کر کسی اور نے نہیں، میں نے کی تھی۔

کھانے کے بعد میں چوہدری نثار کے پاس گیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ میاں صاحب سے میرا ایک انٹرویو کرا دیں۔ نثار نے کہا کہ وہ میاں صاحب سے بات کریں گے۔

اس سے پہلے میں میاں صاحب سے دو تین دفعہ باتوں باتوں میں یہ درخواست کر چکا تھا لیکن انہوں نے مجھے ایک بار بھی اس کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ مسلسل قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے چہرے پر ہر وقت سنجیدگی طاری رہتی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ جب لندن میں دو برس بعد ان سے ملاقات ہوئی تو اتنے ہشاش بشاش اور گپ شپ کرنے والے نکلے کہ میں حیران رہ گیا کہ واقعی دو سال پہلے میں انہی سے جدہ میں ملا تھا جو ہر وقت قرآن پاک ہاتھ میں لے کر چہرے پر سنجیدگی طاری کیے ہوئے ملتے تھے۔

میاں نواز شریف صاحب میرے انٹرویو کی درخواست کو ٹال گئے۔ آخر طے ہوا کہ جب میں حج کر کے جدہ واپس آؤں گا تو اس وقت اس پر دوبارہ بات کریں گے۔

اگلے ہفتے میں حج کر کے واپس آیا تو میں نے چوہدری نثار علی خان سے دوبارہ رابطہ کیا۔ انہوں نے مجھے پھر وہیں سرور پیلس بلا لیا۔ میاں صاحب کسی طرح سے بھی انٹرویو پر راضی نہیں ہو رہے تھے۔ چوہدری نثار انہیں راضی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چوہدری نثار دراصل مجھے ممنون کر چکے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میاں صاحب چوہدری نثار کے کہے بغیر شاید اس انٹرویو کے لیے کبھی تیار نہ ہوتے۔

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ دراصل سعودی حکومت اور جنرل مشرف کے درمیان ہونے والی ڈیل میں یہ بات بھی طے ہوئی تھی کہ نواز شریف کسی پاکستانی اخبار کو انٹرویو نہیں دیں گے اور نہ ہی سیاست پر گفتگو کریں گے۔ میاں صاحب کا خیال تھا کہ اس کا ایک راستہ یہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ مجھے ساری باتیں بتا دیں گے جو میں ان سے پوچھوں گا لیکن میں انہیں اپنی سٹوری میں ان کا نام دیے بغیر اپنی طرف سے لکھوں گا۔ میں اس بات پر بھی تیار ہو گیا۔ تاہم ابھی بھی میاں صاحب کے ذہن میں کوئی بات کھٹک رہی تھی۔ وہ کوئی بھی رسک لینے کو تیار نہیں تھے۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد یہ بات طے ہوئی کہ میں پاکستان واپس جا کر ان کا سارا انٹرویو لکھوں گا اور لکھ کر چوہدری نثار علی خان کو دکھاؤں گا۔ چوہدری نثار کی مرضی ہوگی کہ وہ اس انٹرویو میں کیا کانٹ چھانٹ کرتے ہیں اور میں اس پر کوئی اعتراض نہیں کروں گا۔

میں اس بات پر تیار ہو گیا کیونکہ میرے خیال میں نواز شریف سے ان کی کہانی سننا اس بات

کے ان جرنیلوں کا نہیں تھا جنہوں نے کارگل کی پہاڑیوں پر یہ سارا کھیل کھیلا تھا جس میں اب تک قریب جوان پاکستانی فوجی بے گور و کفن مارے گئے تھے۔ یہ دراصل اس ملک کی فوج کی عزت اور ادارہ کا مسئلہ تھا جسے اس وقت بچانا ضروری تھا۔

یوں اپنی فوج کی عزت بچانے کے نام پر نواز شریف نے فوری طور پر 4 جولائی 1999ء کو امریکہ جانے کا فیصلہ کیا۔ جنرل مشرف انہیں اسلام آباد ایئرپورٹ پر خدا حافظ کہنے کے لیے آئے۔ اس کے بعد جو کچھ 4 جولائی کو امریکہ میں ہوا وہ سب کے سامنے تھا۔ واجپائی کو بڑی مشکل سے بل کلنٹن نے سیز فائر پر راضی کیا۔

اب اس بیک گراؤنڈ میں جب نواز شریف کو یہ اطلاعات ملنا شروع ہوئیں کہ جنرل مشرف اور ان کے جرنیل اپنی سرکاری اور نجی محفلوں میں کارگل جنگ کا ذمہ دار انہیں ٹھہرا رہے تھے اور یہ دعوے کیے جا رہے تھے کہ وہ اگر امریکہ جا کر سیز فائر نہ کراتے تو شاید ہماری فوجی بھارتی کشمیر پر قبضہ کر لیتی تو انہیں شدید غصہ آیا۔

نواز شریف اب مزید ان وردی والوں کی دھوکہ بازی اور چالوں کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے بغیر نتائج کی پرواہ کیے جنرل مشرف کو ڈس مس کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ جنرل مشرف نے انہیں دھوکہ دیا تھا۔

میں نے نواز شریف صاحب سے پوچھا کہ پھر بھی انہوں نے جنرل مشرف کو ڈس مس کرنے سے پہلے اس وقت وزیراعظم ہاؤس میں موجود اپنے بھائی شہباز شریف اور چوہدری نثار علی خان سے مشورہ کیوں نہیں کیا تھا تو نواز شریف نے میری طرف دیکھ کر بڑے پختہ لہجے میں کہا کہ جناب اس وقت شہباز یا نثار سے مشورہ کرنے کا وقت گزر گیا تھا۔ اب کچھ کر گزرنے کا وقت آ گیا تھا اور انہوں نے وہ کچھ کیا جو ان کے خیال میں اس وقت کرنا چاہیے تھا۔ ان کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ اگر انہوں نے شہباز اور نثار سے بات کی تو شاید وہ انہیں روکنے کی کوشش کریں اور اس دفعہ انہوں نے رکنا نہیں تھا کیونکہ وہ فیصلہ کر چکے تھے۔

میں نے نواز شریف سے کہا کہ آپ پر یہ الزام لگتا ہے کہ آپ کسی کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ جو بھی صدر آئے یا آرمی چیف، آپ کی اس سے ضرور لڑائی ہوتی ہے۔

میری بات سن کر وہ بولے کہ آپ بالکل درست بات کہہ رہے ہیں۔ وہ پاکستان کے واحد لیڈر ہیں جنہوں نے ہمیشہ ان آرمی چیفس کے ساتھ ٹکر لی جو اپنے قانونی اور آئینی دائرے میں رہنے کے بجائے اس ملک کے حکمران بننے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کا مقصد آرمی چیفس کو سویلین حکومت کی رٹ میں لانا تھا۔ آرمی کا کام سرحدوں کی حفاظت کرنا تھا نہ کہ ملک پر حکمرانی کرنا۔

نواز شریف کے منہ سے فوجی جرنیلوں اور آرمی چیفس کے خلاف سخت گفتگو سن کر میں نے کہا کہ سر! آپ تو خود بھی ایک آرمی ڈکٹیٹر جنرل ضیاء کی پیداوار تھے۔ میری بات کا برا منائے بغیر نواز شریف نے کہا کہ آپ کی بات درست ہے، لیکن اس کے پیچھے وجوہات ہیں۔

میں نے محسوس کیا کہ نواز شریف اس بات پر معذرت خواہ نہیں تھے کہ آج اب وہ جمہوریت کے چیمپئن بنے ہوئے تھے اور پاکستان کے آرمی جرنیلوں کے سیاسی کردار کو شدید تنقید کا نشانہ بنا رہے تھے تو ماضی میں وہ خود بھی جنرل ضیاء کی وجہ سے سیاست میں آئے اور وہیں سے ان کا عروج شروع ہوا۔

تاہم، نواز شریف نے مجھے اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لیے وہ وجوہات بتائیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ پاکستان پر زیادہ عرصہ فوجی جرنیلوں نے حکومت کی تھی۔ جتنے بھی لوگ سیاست میں آئے اس وقت ملک پر مارشل لا تھا۔ وہ کوئی اکیلے لیڈر نہیں تھے جو مارشل لا دور میں سیاست میں آئے۔ اگر ملک پر فوجی حکومت نہ ہوتی تو یقیناً سیاستدان بغیر فوجی حکمرانوں کی مدد کے سیاست میں آتے۔

نواز شریف نے کہا کہ آپ کم از کم مجھے اس بات کا کریڈٹ تو دیں کہ انہوں نے طاقتور اسٹیبلشمنٹ پر یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ وزیراعظم ہونے کی حیثیت سے ان کی کسی بھی غیر قانونی حرکت کو برداشت نہیں کریں گے۔ وہ واحد وزیراعظم تھے جنہوں نے سویلین حکومت کی رٹ قائم کرنے کے لیے ان سے جو کچھ ہو سکا انہوں نے کیا۔

نواز شریف کا خیال تھا کہ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انہیں اس بات میں کامیابی ہوئی یا نہیں لیکن کم از کم انہوں نے یہ بات تو ثابت کی کہ وہ کسی آرمی جنرل کی سیاسی معاملات میں مداخلت برداشت نہیں کریں گے کیونکہ یہ قانون اور آئین کی خلاف ورزی تھی۔

میں نے نواز شریف صاحب سے پوچھا کہ جنرل مشرف اکثر یہ کہتے تھے کہ اگر نواز شریف

میاں صاحب کے ہاں جمعہ بڑا شور شرابے اور کھانے پینے کا دن ہوتا تھا۔ میاں صاحب کے شیدائی دور دراز کے علاقوں سے ہر قسم کی خوراک لے کر آتے۔ صحافیوں سے لے کر سیاستدانوں اور عام لوگوں تک سب پیٹ بھر کر کھاتے۔ میاں صاحب اکثر ہمارے جیسے مہمانوں کی پلیٹوں میں بکرے کی بوٹیاں بار بار ڈالتے دیکھے جاتے۔

بینظیر اور جنرل مشرف کے درمیان ہونے والی ڈیل کی باتوں نے اگرچہ نواز شریف کیمپ کو خاصا پریشان کیا ہوا تھا، تاہم سیانے سیاستدانوں کی طرح وہ بھی یہ بات سمجھتے تھے کہ بینظیر بھٹو کا ڈیل کر کے پاکستان چلے جانا ہی ان کے سیاسی فائدے میں تھا۔ اگر کل کلاں بینظیر بھٹو اقتدار میں آ گئیں تو یقیناً وہ طالبان کے بجائے نواز شریف کو اپنا اپوزیشن لیڈر دیکھنا زیادہ پسند کریں گی۔ نواز شریف کیمپ کو یہ بھی لگتا تھا کہ پی پی پی کی جنرل مشرف کے ساتھ ہونے والی ڈیل کا زیادہ فائدہ انہیں ہوگا۔ بدنامی بینظیر بھٹو کے حصے میں آئے گی جبکہ وہ بڑے مزے سے لوگوں کو بتائیں گے کہ انہوں نے ڈکٹیٹر سے ڈیل نہیں کی تھی۔ حالانکہ یہ بات بڑے سامنے کی تھی کہ جنرل مشرف اور نواز شریف میں ڈیل ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ دونوں نے 12 اکتوبر کو ایک دوسرے کو ڈس مس کیا تھا۔ اب نواز شریف اور جنرل مشرف کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ایک ساتھ مل بیٹھتے۔ بینظیر بھٹو اور جنرل مشرف میں بہت ساری چیزیں کامن تھیں۔ سب سے بڑھ کر ان دونوں کے درمیان 12 اکتوبر کی طرح کے ماضی کی کوئی زنجیر ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں تھی۔

نواز شریف کیمپ کو اس بات کا یقین تھا کہ ایک دفعہ بینظیر بھٹو پاکستان چلی گئیں تو پھر انہیں روکنا آسان نہیں ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بینظیر سے اپنے سیاسی تعلقات چارٹر آف ڈیموکریسی کی خلاف ورزی کرنے کے باوجود ختم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ بینظیر بھٹو کی ڈیل میں ہی انہیں اپنی سیاسی زندگی نظر آتی تھی۔

نواز شریف اس دن بڑے خوش تھے جب 7 جولائی 2007 کو لندن میں آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ وہ شخص جو جدہ میں مجھ سے براہ راست جنرل مشرف کے بارے میں بات کرتے ہوئے ڈرتا تھا آج پاکستان سے آئے ہوئے امین فہیم، مولانا فضل الرحمن، عمران خان، محمود خان اچکزئی اور دیگر بڑے بڑے لیڈروں کے سامنے جس طرح جنرل مشرف کو للکار رہا تھا، یہ دیکھ کر مجھے شدید حیرانی ہو رہی تھی۔ جس انداز میں نواز شریف تقریر کر رہے تھے اس سے میرا خیال ہے سب کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ان گزرے برسوں میں ان میں اور کوئی تبدیلی آئی ہو یا نہیں، تاہم وہ ایک اچھے مقرر ضرور بن گئے تھے۔

اس بات پر لندن میں شرطیں لگی ہوئی تھیں کہ بینظیر بھٹو اے پی سی میں شریک ہوں گی یا نہیں۔ سننے میں آ رہا تھا کہ جنرل مشرف نے بینظیر بھٹو سے مذاکرات کامیاب کرنے کے لیے یہ شرط رکھی تھی کہ وہ نواز شریف کے اس سیاسی شو میں نہیں جائیں گی۔ دوسری طرف نواز شریف کیمپ کا یہ خیال تھا کہ وہ ضرور آئیں گی تاکہ جنرل مشرف پر دباؤ ڈال کر ان سے بہتر ڈیل کی جا سکے۔

نواز شریف اور بینظیر بھٹو دونوں ایک دوسرے کو جنرل مشرف کے مارشل لاء کے بعد استعمال کرتے آئے تھے۔ 10 دسمبر 2000 کو نواز شریف نے بینظیر کا سیاسی پریشر استعمال کر کے جنرل مشرف سے ڈیل کر لی تھی۔ جدہ روانگی سے آٹھ دن پہلے ہی نواز شریف نے بینظیر بھٹو کی پارٹی کے ساتھ اے آر ڈی بنائی تھی۔ بینظیر بھٹو اب وہی کچھ کرنے جا رہی تھیں۔ وہ نواز شریف کے ساتھ اپنے سیاسی اتحاد کا پریشر جنرل مشرف پر ڈال کر ان سے بہتر شرائط پر پاکستان واپس جا رہی تھیں۔ نواز شریف بھی شاید اس بات پر چپ تھے کہ چلیں اس بہانے دونوں کا سکور برابر ہو رہا تھا۔ اگر کبھی انہوں نے جنرل مشرف کی قید سے رہائی پانے کے لیے بینظیر بھٹو کے سیاسی پریشر کو استعمال کیا تھا تو آج بینظیر بھٹو بھی ان کا سیاسی دباؤ استعمال کر کے پاکستان واپس جا رہی تھیں۔ یوں دونوں سیاستدانوں کو ایک دوسرے سے کوئی گلہ نہیں تھا۔

اے پی سی کی کامیابی سے نواز شریف میں ایک نیا جذبہ آیا۔ ان کے اردگرد بیٹھے دوستوں نے انہیں یہ یقین دلانا شروع کر دیا کہ اب جنرل مشرف کے لیے انہیں پاکستان آنے سے روکنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ اسی اثناء میں یہ باتیں پھیلنا شروع ہو گئیں کہ بینظیر بھٹو بہت جلد الیکشن سے پہلے پاکستان واپس چلی جائیں گی۔ اس سے نواز شریف کیمپ پر اور پریشر بڑھا اور انہیں یہ محسوس ہوا کہ اگر ان کے ہاتھ سے یہ موقع نکل گیا تو پھر کیا پتہ بینظیر بھٹو جنرل مشرف کے ساتھ مل کر نواز شریف کا راستہ ہموار کرنے کی بجائے ان کا راستہ روکنے پر تیار ہو جائیں اور الیکشن جیتنے کے بعد ہی نواز شریف کو واپس آنے دیا جائے۔ اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ نواز شریف کو یہ یقین دلایا جانے لگا کہ پاکستان

اب انقلاب کے لیے تیار ہے۔ وہ آیت اللہ خمینی کی طرح اسلام آباد کے ائیرپورٹ پر اتر کر چند گھنٹوں میں جنرل مشرف کا تختہ الٹ دیں گے۔ لندن میں پی ایم ایل نواز کے جس لیڈر سے بھی بات ہوتی، وہ نواز شریف کے پاکستان واپس آنے کو آیت اللہ خمینی کے فرانس سے تہران واپسی کے ساتھ موازنہ کرتا۔

20 جولائی 2007ء کے سپریم کورٹ کے فیصلے نے نواز شریف کو مزید پختہ کیا کہ وہ واپس جائیں۔ اب جنرل مشرف دھیرے دھیرے ختم ہو رہے تھے۔ سپریم کورٹ نے چیف جسٹس افتخار چوہدری کو بحال کر دیا تھا۔ پاکستان بدل گیا تھا۔ اب سب سے اچھا موقع تھا کہ اس وقت پاکستان جایا جائے جب چیف جسٹس بحال ہو چکے تھے اور فیصلہ بھی دے چکے تھے کہ نواز شریف اور شہباز شریف کو پاکستان کا شہری ہونے کے ناطے وطن واپسی کا پورا حق تھا۔ یوں سپریم کورٹ نے وہ ڈیل سکریپ کر دی تھی جو بقول نواز شریف کے جنرل مشرف اور سعودی بادشاہ کے درمیان ہوئی تھی۔

ایک دن مجھے لندن میں نواز شریف کے ترجمان نادر چوہدری کا فون آیا کہ میاں صاحب اپنی پارٹی کے لیڈروں کے ساتھ میٹنگ کے بعد ڈورچیسٹر ہوٹل میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کریں گے۔ توقع یہی کی جا رہی تھی کہ وہ اپنی پاکستان روانگی کے پروگرام کا اعلان کریں گے۔

آخر وہ وقت آن پہنچا تھا کہ نواز شریف اپنی جلاوطنی ختم کرنے کے بعد اپنے ان نامزد کردہ آرمی چیف سے ٹکر لینے کو تیار ہو جائیں۔

ڈورچیسٹر ہوٹل میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ پاکستان سے متعدد صحافی وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ عالمی میڈیا بھی اس میں پوری دلچسپی لے رہا تھا۔ مجھے اس ہال میں کہیں بیٹھنے کی جگہ نہیں مل رہی تھی۔ مشہور کالم نگار عرفان صدیقی صاحب ایک کونے میں کھڑے تھے۔ انہوں نے کمال شفقت سے مجھے اپنی طرف بلا لیا اور وہیں کھڑے ہونے کو تھوڑی سی جگہ دی۔ تمام کیمرے اور نگاہیں نواز شریف پر مرکوز تھیں کہ وہ کب پاکستان واپسی کی تاریخ کا اعلان کریں گے۔ پہلے انہوں نے ایک بیان انگریزی میں پڑھا اور پھر انہوں نے اردو میں گفتگو شروع کی۔ نواز شریف نے بتایا کہ وہ دو ہفتے بعد 10 ستمبر کو اسلام آباد کے ائیرپورٹ پر اتریں گے۔ اپنی جلاوطنی ختم کرنے کے لیے نواز شریف نے جو تقریر کی وہ کافی جاندار لگ رہی تھی۔ میں نے اپنے قریب کھڑے عرفان صدیقی صاحب سے کہا کہ سر اگر آپ

برا نہ منائیں تو ایک بات کہوں۔ ہمیشہ بڑی محبت اور پیار سے گفتگو کرنے والے عرفان صدیقی صاحب نے فرمایا کہ بالکل، ضرور!

میں نے کہا کہ صدیقی صاحب! میں اس بات پر شرط لگانے کو تیار ہوں کہ میاں صاحب جو تقریر اس وقت اردو میں کر رہے ہیں وہ آپ نے لکھی ہے۔ آپ سے بہتر اتنی اچھی اردو اور سیاسی تقریر شاید یہاں پر موجود اور کسی سیاستدان، صحافی یا کالم نگار کے بس کی بات نہیں ہے۔ عرفان صدیقی مسکرائے اور بولے کہ اگر آپ نے پہچان ہی لیا ہے تو میں مان لیتا ہوں کہ یہ تقریر میں نے لکھی ہے۔

میاں نواز شریف کے 10 ستمبر کی تاریخ دینے کے ساتھ ہی لندن اور اسلام آباد میں ایک بھونچال سا آ گیا تھا۔ اسلام آباد کے حکمرانوں نے فوراً اس پر ردعمل کا اظہار کیا کہ نواز شریف کو کسی صورت پاکستان واپس نہیں آنے دیا جائے گا۔ وہ باقاعدہ ایک ڈیل کے ذریعے دس سال کے لیے پاکستان سے باہر گئے تھے اور مقررہ مدت سے پہلے انہیں واپس نہیں آنے دیا جائے گا۔ لندن کے مضافات میں جنرل مشرف کے قریبی ساتھی بریگیڈیئر نیاز اور شہباز شریف کے درمیان ملاقاتوں کی خبریں آنے لگیں۔ سعودی اور لبنانی پیغام رساں نواز شریف سے ملنے لگے لیکن لگتا تھا جس طرح نواز شریف نے واپس جانے کا فیصلہ کیا تھا اس پر انہیں سعودی حکومت کی حمایت حاصل تھی۔ نواز شریف نے بھی ایک دن یہی بات ہم صحافیوں کو بتائی کہ ان پر سعودی حکومت کا کوئی دباؤ نہیں ہے کیونکہ انہوں نے جنرل مشرف سے براہ راست کوئی ڈیل نہیں کی تھی۔

لندن آئے ہوئے تمام سیاسی لیڈروں کو واپس پاکستان بھیج دیا گیا کہ وہ جائیں اور نواز شریف کے استقبال کی تیاریاں کریں۔ صحافیوں کی فہرستیں بننا شروع ہو گئیں کہ پاکستان سے کون اور کہاں سے آئے گا۔ لندن سے میاں صاحب کے ساتھ کون کون سے صحافی جائیں گے۔ اپنے پروگرام کو خفیہ رکھنے کے لیے تمام مختلف ائیرلائنز پر سیٹوں کی بکنگ کروا دی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نواز شریف کے سٹاف کے دو لوگ محمد عمران اور محمد افضال اس کام میں زبردست تھے۔ انہوں نے آخری لمحے تک اس بات کی بھنک کسی کو نہیں لگنے دی کہ انہوں نے کونسی ائیرلائن پر کس کس کو بک کیا ہوا تھا۔ ان کے صحافیوں سے بڑے اچھے تعلقات تھے لیکن عمران اور افضال نے نواز شریف کے مفادات میں اس راز کو آخری لمحے تک راز رکھا کہ میاں صاحب پی آئی اے، ایمریٹس یا گلف ائیرلائن سے جائیں گے۔

[illegible] ساتھ لے جا رہے تھے۔

سعودی پولیس کی اسلام آباد آمد نے نواز شریف کیمپ میں ایک عجیب سی ہلچل پیدا کر دی۔ ایک بڑے سے شاندار آفس میں ہم صحافیوں کو ایک عجیب سی حیرت میں مبتلا کیا گیا۔ نواز شریف اور شہباز شریف کے چہروں پر پریشانی عیاں تھی۔ لگتا تھا کہیں نہ کہیں کوئی شدید گڑبڑ ہو چکی تھی۔ میں نے وہاں موجود جس کسی کی ایڈوائس سے بات کرنے کی کوشش کی ان سب کو سنجیدہ پایا۔ ارشد اور اپنے دوست پرویز رشید بھی زیادہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ نواز شریف بڑی دیر تک ایک کمرے میں بند ہو کر شہباز شریف، پرویز رشید اور پارٹی کے دیگر دو تین لوگوں کے ساتھ بڑی دیر تک مشورہ کرنے میں مصروف رہے اور ہم صحافی باہر ان کے دفتر میں چائے بسکٹ اور پیسٹریاں کھاتے رہے۔ خاصی دیر بعد نواز شریف کمرے سے باہر نکلے۔ ان کا چہرہ ایک دفعہ پھر سنجیدگی میں ڈوبا ہوا تھا جس سے لگتا تھا کہ وہ کوئی ایسا اہم فیصلہ کر کے نکلے تھے جس پر انہیں ابھی بھی کچھ شکوک تھے۔

اس دفتر میں پھیلی خوفناک سنجیدگی نے ہم صحافیوں کو بھی مسکرانا بھلا دیا تھا۔ ہمیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کل 10 ستمبر کو میاں صاحب نے پاکستان روانہ ہونا تھا اور آج 9 ستمبر کو وہ ایمرجنسی میں پریس کانفرنس بلا کر بات چیت کرنا چاہ رہے تھے۔

کیا نواز شریف سعودی شہزادے کے پاکستان آنے کے بعد اپنا پروگرام تبدیل کرنے والے تھے۔

یہ سوال ہم سب صحافیوں کے ذہنوں میں موجود تھا۔ اکثریت کا خیال یہی تھا کہ نواز شریف اب پاکستان واپس نہیں جائیں گے۔ شہباز شریف بھی ان کے ساتھ پاکستان واپس جا رہے تھے۔ کیا دونوں بھائی یہ افورڈ کر سکتے تھے کہ وہ ایک دفعہ پھر گرفتار کر کے جدہ لے جائے جائیں جہاں سے بڑی مشکل

[illegible] 2002 کے الیکشن میں [illegible] چوہدری شجاعت کی پارٹی میں شامل ہو چکے تھے۔

یوں ہم سب کا خیال تھا کہ نواز شریف ایک بہت بڑا سیاسی جوا کھیلنے جا رہے تھے۔ نواز شریف اور شہباز شریف Do or die کی سیاست کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ اب جو پاکستان سے رپورٹس آ رہی تھیں انہیں اپنی سیاسی خودکشی نظر آ رہی تھی۔

لیکن سوال یہ تھا کہ اگر ان دونوں کو انہیں پر گرفتار کر کے جدہ بھیج دیا گیا تو پھر کیا ہوگا۔

میں نواز شریف کے دفتر کے ایک کونے میں بیٹھا یہ ساری باتیں سوچ رہا تھا کہ اتنی دیر میں پریس کانفرنس شروع ہو گئی۔ اسلام آباد سے آنے والے دباؤ نے نواز شریف کو ایک ایسی سیاسی حماقت کرنے پر مجبور کر دیا تھا جس کا احساس انہیں 10 ستمبر کو اسلام آباد کے ایئرپورٹ پر اترنے سے پہلے ہی ہو گیا تھا۔

جب نواز شریف نے گفتگو شروع کی تو لگ رہا تھا کہ وہ مزاحمت کے موڈ میں تھے۔ وہ اب پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ سعودی حکمرانوں کو بھی ناراض کرنے پر تل گئے تھے۔ اب ان کا راستہ نہیں روکا جا سکتا تھا۔ یہاں تک تو بات ٹھیک تھی۔ لیکن جب میاں صاحب نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ایک کاغذ سے یہ پڑھنا شروع کیا کہ ان کا جنرل مشرف کے ساتھ باہر رہنے کا معاہدہ پانچ سال کا تھا نہ کہ دس سال کا تو ہم سب چونک پڑے۔ ہمارے خیال میں میاں صاحب ایک ایسی بات کر گئے تھے جس کا نقصان انہیں سیاسی طور پر بھگتنا ہوگا کیونکہ اب تک ان پچھلے آٹھ سالوں میں وہ مکہ اور مدینہ میں بیٹھ کر یہ قسمیں کھاتے رہے تھے کہ انہوں نے جنرل پرویز مشرف سے کوئی ڈیل نہیں کی تھی اور آج وہ سب کو بتا رہے تھے کہ ان کی ڈیل پانچ سال کے لیے تھی۔

تھا ان جاپانی ڈیل کا اعتراف کرنے جا رہے ہیں وہ اس سے خاصا نروس ہو جائے گا۔

ارشد شریف نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا کہ رؤف تم صحافت چھوڑ کر سیاست جوائن کر لو۔ میرا خیال تو اب تک پی ایم ایل نواز کے کسی بھی لیڈر کو نہیں آیا ہوگا جو تم نے نواز شریف کو یہ مشورہ دیا ہے۔

میں نے ارشد سے کہا کہ تم دیکھ لینا نواز شریف شکرانے کا نفل یا سجدہ نہیں کریں گے۔ دوسرے میں نواز شریف کے اس شکرانے کے سجدے کو ایک سیاستدان کی آنکھ سے نہیں ایک صحافی کی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں کہ اس کا عوام پر کیا اثر پڑے گا۔

ارشد شریف نے مجھے کہا کہ تم جا کر یہ بات نواز شریف کو کیوں نہیں کہتے۔

میں نے کہا میرے پیارے! میں تمہیں پہلے کہہ چکا ہوں میں صحافی ہوں کوئی سیاسی ورکر نہیں کہ لیڈروں کو جا کر مشورے دیتا پھروں۔ میاں صاحب میں اتنی سمجھ بوجھ خود ہونی چاہیے کہ جب وہ آٹھ سال بعد وطن واپس لوٹ رہے ہیں تو انہیں جہاز کی سیڑھیوں سے اترتے ہی پہلا کام کیا کرنا چاہیے۔

میں اور ارشد شریف نواز شریف کا ایک ایک قدم گن رہے تھے۔ اب ہم دونوں کی دلچسپی اس بات میں زیادہ ہو چکی تھی کہ نواز شریف نیچے اترتے ہی سجدہ کریں گے یا نہیں کہ ہم ایک لمحے کے لیے اپنے ارد گرد کا سارا ماحول بھول گئے تھے۔

آخر نواز شریف آخری سیڑھی سے نیچے اترے۔ ان کے ارد گرد ان کی پارٹی کے جیالے انہیں کسی متوقع کمانڈو ایکشن سے بچانے کے لیے تیار تھے۔

نواز شریف نے وہ موقع گنوا دیا۔ میرا خیال تھا کہ انہیں خدا کے آگے جھک کر اس مٹی کو چومنا چاہیے تھا۔ اس کا انہیں بے پناہ سیاسی فائدہ ہوتا لیکن شاید جس نے ان کی لندن سے اسلام آباد واپسی کا سکرپٹ لکھا تھا اس میں وہ یہ سین ڈالنا بھول گیا تھا یا یہ اس کی ترجیح میں نہیں تھا۔ نواز شریف نے اپنی دھرتی ماں کو گلے نہیں لگایا اور دھرتی ماں بھی شاید اس سے روٹھ چکی تھی کہ ڈیڑھ گھنٹے بعد نواز شریف کو پنجاب پولیس کے کمانڈوز تقریباً گھسیٹتے ہوئے وی آئی پی لاؤنج سے ایک پرائی بس میں بٹھا کر شہزادے مقرن کے جہاز میں بٹھا چکے تھے۔

جہاز سے اترنے کے بعد ایک منصوبہ [illegible] کے تحت نواز شریف [illegible] میں جا کر ایئرپورٹ لاؤنج میں جائیں گے جس میں سارے صحافی جا سکتے تھے یا وہ اس وی آئی پی لاؤنج میں بیٹھیں گے جو ان کے لیے لائی گئی تھی۔ نواز شریف اور ان کے ساتھیوں کو یہ خطرہ نظر آ رہا تھا کہ اگر وہ اس چھوٹی کوٹھری میں بیٹھ گئے تو یقین تھا کہ انہیں اکیلا پا کر وہ ایئرپورٹ سے ہی پکڑ کر ایک اور جہاز میں بٹھا کر جدہ لے جائیں گے۔ تھوڑی سی بحث و مباحثے کے بعد نواز شریف صحافیوں والی بس میں آ کر بیٹھ گئے۔

اب تک کی کارروائی سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ نواز شریف اپنی بازی ہار چکے تھے۔ انہیں لندن میں جس انقلاب کی کہانیاں سنائی گئی تھیں وہ اسلام آباد ایئرپورٹ پر اترنے سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھیں۔ اسلام آباد ایئرپورٹ پر انہیں لینے کے لیے پارٹی کا ایک لیڈر یا ورکر بھی موجود نہیں تھا۔ پارٹی کے تمام لیڈران اور ورکرز ایک رات پہلے ہی پولیس کو پیارے ہو کر گرفتاری دے چکے تھے۔ وہ نواز شریف کے لیے ڈنڈے کھا کر ایئرپورٹ جانے کے لیے تیار نہیں تھے۔

اب نواز شریف کا زیادہ تر انحصار اس پاکستانی اور غیر ملکی میڈیا پر تھا جسے وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ بازی پلٹتے دیکھ کر ان کے اپنے قریبی ساتھیوں کے چہروں پر بھی خوف و ہراس کی علامتیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ اگر کسی شخص کا حوصلہ بلند تھا تو وہ نواز شریف کے ساتھ آئے ہوئے لندن کے بیرسٹر امجد ملک تھے۔ نواز شریف کے لندن کے آفس کے ساتھی محمد افضال بھی نواز شریف کی حفاظت کے لیے اپنی جان دینے پر تلے ہوئے تھے۔ بیرسٹر امجد ملک جن کا تعلق فیصل آباد سے ہے وہ جہاز کے اندر بھی خاصی دیر تک امیگریشن افسران سے قانونی معاملات پر لڑتے جھگڑتے رہے تھے۔ امجد ملک کا اصل امتحان اب شروع ہونے والا تھا جب وی آئی پی لاؤنج میں نواز شریف اور جنرل مشرف کے بھیجے ہوئے ایجنٹس کے درمیان آخری لڑائی شروع ہونے والی تھی۔

وی آئی پی لاؤنج میں پہنچتے ہی ہمیں یکدم محسوس ہوا کہ شاید کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ ہم لندن سے ایک عام مسافر فلائٹ میں ابھی ابھی پہنچے ہیں۔ ہم کوئی بڑے وی آئی پی لوگ ہیں جن کے لیے جوس اور چائے پانی لایا جا رہا ہے۔ وہاں کچھ اس طرح کا ماحول بنا دیا گیا تھا کہ یکدم سب لوگ ریلیکس ہو گئے۔ کئی گھنٹوں پر محیط اندیشے اور خوف اچانک ختم ہو گئے تھے۔ صحافی بڑے ریلیکس ہو کر صوفوں پر بیٹھ

[illegible]

نواز شریف بھی احمد ملک اور دوسرے [illegible] کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔ [illegible] ماحول میں چھائی ہوئی کشیدگی [illegible] حد تک [illegible] ہو گئی تھی۔

مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا تھا۔ یہ حکومت کی کیا نئی حکمت عملی تھی۔ کیا نواز شریف کو ایئرپورٹ سے نکلنے کی اجازت دے دی جائے گی یا پھر کسی مناسب وقت کا انتظار کیا جا رہا تھا کہ نواز شریف پر کمانڈو ایکشن کر کے انہیں ایئرپورٹ پر پکڑ کر ایک اور جہاز سے جدہ روانہ کر دیا جائے؟ وہاں کا ماحول اب انتہائی پرسکون ہو چکا تھا کہ وہاں تمام ٹی وی کیمرے بند تھے اور صحافی [illegible] شروع ہو گئے تھے۔

میں نے ارشد شریف سے کہا کہ یار یہ معاملہ جتنا پرسکون لگ رہا ہے یہ اتنا ہے نہیں۔ یہ ساری خاموشی اور سکون کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔

ارشد شریف نے میری طرف دیکھا اور روایتی انداز میں مسکرایا۔ یہ ایک ایسی مسکراہٹ تھی جسے ہم دوست کوئی بھی معنی اپنے مطلب کے جب چاہیں پہنا سکتے تھے۔

آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ ہم سب کے ذہن میں تھا۔ نواز شریف سے ایک دفعہ پھر امیگریشن سٹاف نے تکرار شروع کر دی کہ وہ پاسپورٹ ان کے حوالے کریں تا کہ ان کی امیگریشن کرائی جا سکے۔ اب کی دفعہ نواز شریف امیگریشن کرانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ کسی نے ان کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ انہیں ایئرپورٹ سے باہر جانے دیا جائے۔ اگر وہ ایئرپورٹ سے نکلنے میں کامیاب بھی ہو گئے تو باہر سڑک پر ایک ساتھی بھی نہیں تھا جو ان کا استقبال کرتا۔ حکومت امیگریشن کرا کر دراصل ان کا پاسپورٹ قبضے میں لینا چاہ رہی تھی تا کہ اس پاسپورٹ کو سپریم کورٹ کے سامنے ثبوت کے طور پر پیش کیا جائے کہ نواز شریف پاکستان میں داخل ہوئے تھے اور پھر اپنی مرضی سے ہی وہ جدہ چلے گئے تھے لہٰذا ان پر کسی طرح کا توہین عدالت کا کیس نہیں چل سکتا تھا۔

نواز شریف اور ان کے ساتھیوں کو یہ کہانی سمجھ آ رہی تھی لہٰذا ان کے لیے سب سے اہم بات یہ بن گئی تھی کہ کسی طرح نواز شریف کا پاسپورٹ امیگریشن والوں کے ہاتھ نہ لگے۔

اتنی دیر میں امیگریشن والوں نے صحافیوں سے کہنا شروع کیا کہ [illegible] امیگریشن [illegible] سے باہر جا سکتے ہیں۔ اب صحافی [illegible] نواز شریف کی [illegible] امیگریشن کرانا شروع ہو گئے۔ صحافیوں سے کہا گیا کہ وہ بیٹھے رہیں اور [illegible] جائیں لیکن نواز شریف اپنے پاسپورٹ پر امیگریشن کی مہر لگوائیں۔

اتنے میں ایک دفعہ پھر تناؤ کی کیفیت طاری تھی۔ اس دفعہ میجر جنرل احمد ملک امیگریشن اور دوسرے حکومتی عہدے داروں سے [illegible] رہے تھے۔ اتنی دیر میں نیب کے ایک دو افسران وہاں نمودار ہوئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ نواز شریف کو چند مقدمات میں گرفتار کرنا چاہ رہے ہیں۔ احمد ملک نے ان سے وارنٹ مانگے تو انہوں نے فوراً عدالت کے وارنٹ دکھا دیے۔ اس سے لگتا تھا کہ حکومت نے پوری تیاری کی ہوئی تھی کہ کسی نہ کسی طرح نواز شریف کو اکیلا کر کے صحافیوں اور اپنے ساتھیوں سے جدا کیا جائے تا کہ انہیں جدہ بھیجنے میں آسانی ہو۔

نیب افسران کے وارنٹ دکھانے پر وہاں ایک دفعہ پھر ایک سکون کی سی کیفیت چھا گئی۔ سب نے ایک گہرا سانس لیا کہ چلیں اب نواز شریف کو گرفتار کر کے اٹک قلعہ لے جایا جائے گا۔ اس بات کے لیے نواز شریف سمیت ان کی پارٹی کے سارے لیڈر تیار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اٹک قلعے سے چند دنوں بعد وہ سپریم کورٹ سے نواز شریف کی ضمانت کرا لیں گے۔

ارشد شریف نے اپنے ایک جاننے والے آفیسر سے پوچھا کہ اب آپ لوگوں کا کیا پلان ہے۔ اب آپ لوگ مزید کتنی دیر اس صورتحال کو اس طرح برقرار رکھیں گے۔

وہ آفیسر مسکرایا اور بولا آپ لوگوں کے جانے کا انتظار کیا جا رہا ہے تا کہ کمانڈو ایکشن کر کے نواز شریف کو جہاز پر سوار کرا دیا جائے۔

اس معنی خیز مسکراہٹ نے سب کچھ واضح کر دیا تھا۔ ہم سب لوگوں کے اندازے غلط ثابت ہو رہے تھے۔ ہم صحافیوں کا خیال تھا کہ شاید نواز شریف کو اب کی دفعہ جدہ نہیں بھیجا جائے گا۔ ہمارے اس یقین کے پیچھے تین وجوہات تھیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ اگر سعودی عرب نواز شریف کے پاکستان آنے پر راضی نہیں تھا تو وہ لندن میں ہی نواز شریف کو روک سکتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ سپریم کورٹ آف پاکستان نے حکومت کو یہ ہدایت دے رکھی تھی کہ وہ اپنے شہریوں کو واپس آنے سے نہیں روک سکتے

تھے۔ تیسری وجہ نواز شریف کا اپنا اعتماد تھا جس کی وجہ سے ہم سب دھوکہ کھا گئے تھے کہ اس سے ہم نے یہ سمجھا کہ شاید اس دفعہ نواز شریف باقاعدہ پلاننگ اور گفت و شنید کے بعد پاکستان جا رہے ہیں۔ وہ شہباز شریف کی طرح کوئی ایڈونچر کرنے نہیں جا رہے تھے لہٰذا بغیر معاملہ طے کیے پاکستان واپس نہیں آ رہے تھے۔ آخر کہیں نہ کہیں سے تو انہیں یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ وہ پاکستان واپس جانے کی تیاری کریں تو ان کے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔

نواز شریف لندن میں بار بار یہ بات کہتے تھے کہ انہیں کسی بھی سعودی عہدیدار یا بادشاہ سلامت نے فون کر کے پاکستان جانے سے نہیں روکا ہے۔ ان کے خیال میں یہ پاکستان کا اندرونی معاملہ ہے جس میں سعودی عرب مداخلت کرنے کو تیار نہیں! ایک دو دفعہ تو نواز شریف اس بات پر چڑ سے گئے جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا سعودی عرب نے انہیں پاکستان واپس جانے کی اجازت دے دی ہے۔ نواز شریف نے بڑی برہمی سے سوال کرنے والے اس صحافی کو یہ یاد کرانے کی کوشش کی تھی کہ پاکستان ایک خود مختار ملک ہے اور ہم کیوں بار بار سعودی عرب کو پاکستانی معاملات میں گھسیٹ رہے ہیں۔

جب نواز شریف سوال کرنے پر برہمی کا اظہار کر رہے تھے تو ہم سب چپ رہے ورنہ پوچھا جا سکتا تھا کہ میاں صاحب! سعودی عرب کو پاکستانی معاملات میں مداخلت کرنے کا اختیار تو اس وقت ملا تھا جب انہوں نے آپ کو جنرل مشرف کی جیل سے رہائی دلوائی تھی۔ اس وقت سعودی عرب کی مداخلت کا خیر مقدم کیا گیا تھا لیکن آج بدلتے حالات میں اسی ملک کی مداخلت کو پاکستان کی خود مختاری پر ایک ضرب قرار دیا جا رہا تھا۔

یہ وہ وجوہات تھیں جن کی بنیاد پر ہم میں سے اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ نواز شریف کو جدہ نہیں بھیجا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ انہیں اٹک جیل لے جایا جائے گا۔

اتنی دیر میں ہم نے دیکھا کہ معاملہ اب امیگریشن اور نیب کے افسران کے ہاتھوں سے انٹیلی جنس ایجنسیوں کے چند لوگوں کے ہاتھوں میں چلا گیا تھا۔ اب یہ ایجنٹس بے چین نظر آ رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ اوپر سے کہیں یہ پیغام آ گیا تھا کہ اب مزید ڈرامہ کرنے کی ضرورت نہیں! جو کرنا ہے وہ کر گزریں۔

بات چیت اب آہستہ آہستہ تلخی میں بدلتی جا رہی تھی۔ صحافی بھی اپنی سیٹوں پر چوکس ہو گئے تھے۔ سب کو پتہ چل گیا کہ آخر وہ مرحلہ آن پہنچا ہے جس کے لیے ان سب نے لندن سے اسلام آباد تک کا سفر کیا تھا۔ گفتگو میں تیزی آنے لگی۔ جذبات بھڑکنے لگے۔ اچانک نواز شریف کے گرد انٹیلی جنس افسران نے گھیرا ڈال لیا اور بڑی تیزی سے ان کی پارٹی کے لوگوں کو ان سے علیحدہ کیا۔ وہ تین نے میاں صاحب سے بدتمیزی کرنی شروع کی۔ ایک مرحلے پر وہ بدتمیزی اتنی بڑھ گئی کہ میاں صاحب کا چہرہ ایک دفعہ غصے سے سرخ ہوا اور انہوں نے تقریباً چلا کر کہا کہ وہ تمام افسر جو ان کے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہیں انہیں ایک دن اپنے کیے کی سزا بھگتنا پڑے گی۔

اس دوران میاں صاحب کو دھکے پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ ان کی پارٹی کے دو تین لوگ ابھی بھی میاں صاحب کے قریب رہنے کی کوشش کر رہے تھے کہ انہیں دھکے نہ پڑیں۔ ان میں ان کے لندن کے دفتر کے محمد افضال پیش پیش تھے۔ ہم سب صحافی اکٹھے ہو گئے تھے۔ ہمیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ کیا کرنے والے تھے۔ راول لاؤنج میں چیخ و پکار اور شور شرابہ بڑھ گیا تھا۔ انٹیلی جنس افسروں کے ساتھ اب پنجاب پولیس کے کمانڈوز بھی مل گئے تھے۔ محمد افضال کا حال اس وقت سب سے زیادہ برا تھا۔ وہ نواز شریف کے ساتھ ابھی تک چمٹے ہوئے تھے کہ کہیں ان کے ساتھ بدتمیزی نہ ہو۔ اسی دھکم پیل میں ہم نے اچانک ایک گونج دار آواز سنی۔ یہ محمد افضال کی آواز تھی جو زور سے انٹیلی جنس ایجنسیوں کے افسران کے رویے کو دیکھ کر چلاتے ہوئے کہا کہ شرم کرو یہ شخص بھی تمہارا دو دفعہ وزیراعظم رہا ہے۔ تم لوگوں کو اپنے وزیراعظم کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔

میں اور ارشد شریف ایک کونے میں کھڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ہم دونوں پر اچانک ڈپریشن کا دورہ پڑا۔ ہم کس طرح کے ملک کے شہری تھے جہاں دو دفعہ وزیراعظم رہنے والے شخص کو انٹیلی جنس ایجنسیوں کے چند لوگ سرعام ذلیل کر رہے تھے۔ وہ شخص جو کبھی اس ملک کے اچھے برے کا مالک تھا آج چند ایجنٹوں کے ہاتھوں گھسیٹا جا رہا تھا اور اسے باتھ روم میں بند کرنے کی کوشش ہو رہی تھی۔ لندن میں بیٹھ کر ہمیں یوں لگتا تھا کہ شاید اب پاکستان بدل گیا ہے، لیکن ہماری آنکھوں کے سامنے جو کچھ ہو رہا تھا اس سے تو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ اس ملک میں کچھ بھی نہیں بدلا ہے۔ جنرل مشرف اور نواز شریف کے درمیان 12 اکتوبر کو شروع ہونے والی ذاتی جنگ آٹھ سال بعد بھی اپنی تمام تر قوت

کو بحالی کا [illegible] میں آ رہا تھا۔ پاکستان میں مصطفیٰ کھر جیسے لیڈر بھی کامیاب تھے۔ [illegible] مصطفیٰ کھر بھی [illegible] گئے تھے۔ اب نواز شریف جو [illegible] گئے تھے تو مصطفیٰ کھر صاحب پاکستان میں [illegible] تھے۔

میں ائیرپورٹ سے سیدھا گھر آیا۔ ٹی وی پر خبریں ملنا شروع ہو گئیں۔ وہاں جنرل مشرف حکومت کے مختلف وزرا نواز شریف پر [illegible] رہے تھے کہ جیسے انہوں نے ڈیل کی خلاف ورزی کی تھی اس لیے انہیں جدہ بھیج دیا گیا تھا۔ ان وزرا میں ایک وزیر کا نام زاہد حامد بھی تھا۔ آج وہی زاہد حامد پاکستان مسلم لیگ نواز کے ٹکٹ پر سیالکوٹ سے الیکشن جیت کر ممبر قومی اسمبلی ہیں۔ وہی نواز شریف جو لندن میں قرآن کی قسمیں کھاتے تھے کہ وہ جنرل مشرف کے ساتھ ہاتھ ملانے والے کسی سیاستدان سے ہاتھ تک نہیں ملائیں گے وہی بعد میں زاہد حامد جیسے لوگوں کو اپنی پارٹی کا ٹکٹ دے کر قومی اسمبلی کا ممبر بنواتے دیکھے گئے۔

اس واقعے کے دو ماہ بعد نواز شریف پاکستان لوٹ آئے۔ اب کی دفعہ انہوں نے درست ایئر پورٹ کا انتخاب کیا۔ وہ اسلام آباد کے بجائے لاہور ایئر پورٹ پر اترے۔ اب انہیں ہمارے جیسے صحافیوں کو جدہ بلا کر اپنے ساتھ لاہور لانے کی ضرورت نہیں رہی تھی کیونکہ اس دفعہ سعودی عرب کے بادشاہ سلامت نے انہیں اپنے طیارے پر ایک بلٹ پروف مرسیڈیز گاڑی ساتھ دے کر پاکستان واپس بھیجا تھا۔ بھلا اب کی دفعہ جنرل مشرف کی کیا مجال کہ وہ بادشاہ کے بھیجے ہوئے ہمارے لیڈر کے ساتھ وہی سلوک کرتے جو ہماری آنکھوں کے سامنے اسلام آباد ایئر پورٹ پر کیا گیا تھا۔

سید یوسف رضا گیلانی

وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کو ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ قومی اسمبلی کے اجلاس میں فیصل صالح حیات ایک ایسی بات کہہ دیں گے جس کی وضاحت انہیں ٹی وی کیمروں کے سامنے خود کرنی پڑ جائے گی۔

دراصل وزیر اعظم گیلانی، فیصل صالح حیات اور وفاقی وزیر برائے پانی و بجلی راجہ پرویز اشرف کے درمیان ایک سال سے جاری لڑائی میں کراس فائرنگ کا شکار ہوئے۔ جون 2010ء کے آخری ہفتے میں جب بجٹ پر بحث جاری تھی تو فیصل صالح حیات نے ایک دفعہ پھر راجہ پرویز اشرف پر رینٹل پاور پراجیکٹس میں کرپشن کرنے کے الزامات دہرائے۔ اس وقت وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی بھی ایوان میں موجود تھے۔ فیصل صالح حیات نے اس موقع کا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ کہا کہ راجہ پرویز اشرف کے خلاف سکینڈل اس رپورٹر (رؤف کلاسرا) نے کیا ہے جنہوں نے وزیر اعظم گیلانی کی کتاب "چاہ یوسف سے صدا" لکھی ہے۔

یہ بات قومی اسمبلی میں بیٹھے تمام ارکان اور میڈیا کے لوگوں کے لیے ایک بم شیل کے طور پر سامنے آئی۔ کوئی بھی یہ توقع نہیں کر رہا تھا کہ وزیر اعظم گیلانی کو اس طریقے سے سب کے سامنے یہ کہا جائے گا کہ ان کی آپ بیتی دراصل کسی صحافی نے انہیں لکھ کر دی تھی۔ انہوں نے محض اس پر اپنا

نام لکھ دیا تھا۔

جب فیصل صالح حیات نے یہ ساری بات ختم کی تو وزیراعظم گیلانی کھڑے ہو گئے اور انہوں نے اپنی وضاحت پیش کی۔ گیلانی صاحب نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ رؤف کلاسرا میرے دوست ہیں۔ پھر انہیں کوئی بات یاد آئی اور بولے کہ نہیں، وہ میرے ذاتی دوست ہیں۔ جب میں اڈیالہ جیل میں تھا تو وہ مجھ سے ملنے آتے تھے۔ گیلانی صاحب نے ایک اور بات بھی کی کہ وہ بھی سرائیکی علاقے سے ہیں اور میں بھی سرائیکی علاقے سے آیا ہوں۔ تاہم، یہ کتاب میں نے خود لکھی ہے رؤف کلاسرا نے نہیں لکھی۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے گیلانی صاحب نے یہ بھی کہا کہ وہ انگلش میں لکھتے ہیں، اردو میں نہیں۔ ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اگر رؤف نے لکھی ہوتی تو وہ کتاب انگلش میں ہوتی نہ کہ اردو میں۔

جب قومی اسمبلی میں یوسف رضا گیلانی اور فیصل صالح حیات میں اس بات پر بحث جاری تھی کہ یوسف رضا گیلانی کی کتاب کس نے لکھی تھی تو میں اس وقت بڑے مزے سے اپنے گھر پر سویا ہوا تھا۔ ایکسپریس چینل کے دوست احمد کا فون آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ آپ کہاں ہیں؟ یہاں تو آپ کی وجہ سے خاصا رولا پڑا ہوا ہے۔ اب آپ ہی بتا دیں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ فیصل صالح حیات کہتے ہیں کہ کتاب آپ نے لکھی ہے، گیلانی صاحب کہتے ہیں کہ نہیں یہ کتاب انہوں نے خود لکھی تھی۔ میں نے تقریباً سوتے سوتے احمد کو جواب دیا کہ یار یہ لمبی کہانی ہے۔ پھر کسی وقت اس پر بات کریں گے۔

احمد کا فون بند ہو گیا۔ میں نے دوبارہ سونے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی بستر پر لیٹے لیٹے دس سال پہلے کی ان یادوں میں کھو گیا جب میری پہلی دفعہ یوسف رضا گیلانی سے اڈیالہ جیل میں ملاقات ہوئی تھی۔

○○○

اگست 2001ء کی بات ہے۔ میں نے ان دنوں نیا نیا ڈان اخبار چھوڑ کر دی نیوز کو جوائن کیا تھا۔ جنرل مشرف نے انہی دنوں ایڈہاک پبلک اکاؤنٹس کمیٹی تشکیل دی تھی۔ ایک منجھے ہوئے ریٹائرڈ بیوروکریٹ ایچ۔ یو بیگ کو اس کا چیئرمین لگایا گیا تھا۔ اس کمیٹی کے باقی ممبران بھی ریٹائرڈ بیوروکریٹس

بلکہ پوری ایمانداری کی بات یہ ہے کہ ان سب نے ان کے بعد آنے والے سیاسی ادوار میں بننے والی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے ممبران سے بہت اچھا کام کیا تھا۔

انہی دنوں اچھی بات یہ ہوئی کہ پہلی دفعہ اس کمیٹی کی میٹنگ میں میڈیا کے لوگوں کو شرکت کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اب صحافی وہاں بیٹھ کر اس کی کارروائی کور/رپورٹ کر سکتے تھے۔

ایک دن بڑی عجیب سی بات ہوئی۔ پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے سامنے قومی اسمبلی اور سینیٹ سیکرٹریٹ کی دو مختلف آڈٹ رپورٹس پیش کی گئیں۔ ایک رپورٹ اس دور کی تھی جب وسیم سجاد چیئرمین سینیٹ تھے اور یوسف رضا گیلانی اسپیکر قومی اسمبلی تھے۔ ان آڈٹ رپورٹس میں دونوں پر کچھ ایک طرح کے الزامات لگائے گئے تھے جن میں لوگوں کو نوکریاں دینا، گاڑیوں اور ٹیلی فونز کا غیر ضروری استعمال اور اختیارات کا غلط استعمال وغیرہ شامل تھے۔ سیکرٹری سینیٹ شاہد اقبال کو یہ خیال تھا کہ پبلک اکاؤنٹس کمیٹی سینیٹ کے حسابات کو چیک نہیں کر سکتی کیونکہ یہ ایک خودمختار ادارہ ہے جس کے تمام معاملات کی منظوری اس کی فنانس کمیٹی سے لی جاتی ہے۔ تاہم، کمیٹی نے یہ اعتراض ماننے سے انکار کرتے ہوئے آڈٹ رپورٹ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وسیم سجاد پر ٹیلی فون اور گاڑیوں کے غلط استعمال کے معاملے میں کمیٹی روم سے اٹھارہ لاکھ روپے ریکور کرنے کی ہدایت کر دی۔ بعد میں وسیم سجاد نے جنرل مشرف کے نام ایک خط لکھا۔ جنرل مشرف نے صدر پاکستان کی حیثیت سے انہیں اٹھارہ لاکھ معاف کر دیے اور کچھ دنوں بعد وسیم سجاد نے 2002ء کے الیکشن سے پہلے پاکستان مسلم لیگ قائداعظم جوائن کر لی۔ یوں یہ سارا سودا اٹھارہ لاکھ روپے میں طے ہو گیا۔

اگلے دن یوسف رضا گیلانی پر بننے والی آڈٹ رپورٹ کی باری تھی۔ ان پر بھی وہی الزامات تھے جو وسیم سجاد پر تھے۔ توقع کی جا رہی تھی کہ وہ ان پر بھی کوئی جرمانہ وغیرہ کر کے آڈٹ رپورٹ کو سیٹل کر دیا جائے گا۔ تاہم، جب رپورٹ سامنے لائی گئی تو کمیٹی کو بتایا گیا کہ نیب نے پہلے ہی اس رپورٹ کی بنیاد پر یوسف رضا گیلانی کو گرفتار کر رکھا ہے اور جب تک ان کیسز کا فیصلہ نہیں ہو جاتا کمیٹی یہ رپورٹ اپنی میٹنگ میں زیر بحث نہیں لا سکتی۔

یوں پبلک اکاؤنٹس کمیٹی نے بھی اپنے اختیارات نیب کے سامنے سرنڈر کیے۔ اگر وہ یوسف رضا گیلانی پر بننے والے ان آڈٹ پیروں کا فیصلہ کر دیتی جیسے وسیم سجاد کے سلسلے میں کیا گیا تھا تو شاید

انہیں نیب کی عدالت سے سات سال قید اور دس کروڑ جرمانے کی سزا ہوئی اور وہ بھی انہی کے ساتھ جیل میں رہ رہے تھے۔

جب میں نے پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کی میٹنگ میں یہ امتیازی سلوک دیکھا کہ کس طرح یہ چیئرمین حیثیت کے آدمی تھے ان کو پیش کر دیا گیا تھا اور اسپیکر قومی اسمبلی پر بیٹھنے والا رپورٹ کوئی بھی نہیں کیا گیا تھا تو میں نے اپنے اخبار آ کر ایک بڑی سی سٹوری دی نیوز کے فرنٹ پیج پر فائل کی۔ اس میں میں نے یوسف رضا گیلانی اور وسیم سجاد پر لگنے والے الزامات آمنے سامنے چھاپ دیے تھے۔ اس خبر کا چھپنا تھا کہ ایک تہلکہ مچ گیا۔ ان دنوں جنرل مشرف اپنی پوری قوت کے ساتھ ملک پر حکومت کر رہے تھے۔ احتساب کا بھی بہت بڑا چرچا ہو رہا تھا۔ اس خبر سے ان کے جعلی احتساب کا بھانڈا بھی پھوٹا اور یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ یہ احتساب وغیرہ محض اپوزیشن سیاستدانوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے تھا۔ وسیم سجاد کی طرح جو سیاستدان اٹھارہ لاکھ روپے کا جرمانہ معاف کرا کر پاکستان مسلم لیگ ق میں شامل ہونے کے لیے تیار تھے انہیں معافی تھی اور جو یوسف رضا گیلانی کی طرح مزاحمت کر رہے تھے ان کے لیے آٹھ سال قید اور دس کروڑ روپے جرمانے کی سزا تھی۔

میری یوسف رضا گیلانی سے اس خبر سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے شاید میری یہ خبر اڈیالہ جیل میں پڑھی تھی۔ انہوں نے اپنے جاننے والوں سے پوچھا کہ یہ رپورٹر کون ہے کیونکہ وہ مجھے نہیں جانتے تھے۔ کسی دوست کے ذریعے مجھ تک ان کے شکریے کے الفاظ پہنچے۔ وہ جی ٹائن میں واقع ایک ہسپتال میں اپنے چیک اپ کے لیے آئے۔ مجھے پیغام ملا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہاں ان سے ایک کمرے میں پہلی دفعہ ملاقات ہوئی۔ ان کے خاندان نے ان کی گرفتاری کو ان کی والدہ سے چھپایا ہوا تھا۔ انہیں یہ تاثر دیا گیا تھا کہ وہ ہسپتال کے اس کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ جب گیلانی صاحب کی والدہ وہاں آئیں تو انہوں نے ہسپتال کے اچھے صاف ستھرے کمرے کی تعریف کی اور کہا کہ اب وہ بھی یہیں رک جائیں گی۔ گیلانی صاحب کے لیے بڑا مسئلہ ہو گیا کہ وہ ماں کو کیسے سمجھائیں کہ وہ تھوڑی دیر بعد اس کمرے سے جیل چلے جائیں گے۔ آخر گیلانی صاحب نے اپنی والدہ کو بتایا کہ جنرل مشرف بھی چاہتے ہیں کہ وہ بھی نواز شریف اور شہباز شریف کی طرح پاکستان چھوڑ کر چلے جائیں۔ اب وہ یہ بتائیں کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ اس پر ان کی والدہ نے کہا کہ بالکل نہیں۔ انکی بھی

لیکن وہ انہوں نے پاکستان چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے بھلے انہیں جیل میں ہی کیوں نہ رہنا پڑے۔ اس پر گیلانی صاحب نے کہا کہ پھر جنرل مشرف کی یہ شرط ہے کہ وہ ہسپتال کے اس کمرے میں اکیلے رہیں۔ اس پر امی جی نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ میں واپس ملتان چلی جاتی ہوں۔

کچھ عرصے بعد جب گیلانی صاحب کو نیب نے سزا سنائی تو ان کی والدہ سے یہ بات چھپائی گئی تھی لیکن خاندان کے کسی شخص نے لاشعوری طور پر یہ بات ان کو بتا دی اور صدمے سے ان کی وفات ہو گئی۔

ہسپتال کے اسی کمرے میں میری پہلی دفعہ یوسف رضا گیلانی سے ملاقات ہوئی۔ وہ بڑی عزت اور احترام سے ملے۔ اس بات کا بار بار شکریہ ادا کیا کہ میں نے ان کے حق میں وہ سٹوری لکھی تھی باوجود اس بات کے کہ میں ان سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔

میں نے گیلانی صاحب سے کہا کہ بات دراصل یہ ہے کہ مجھ جیسے لوگ میڈیا میں بیٹھ کر ہمیشہ سرائیکی علاقوں کے فیوڈلز کو اس بات پر تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ وہ اپنے علاقے کے لوگوں کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ وہ غریبوں کو نوکریاں نہیں دیتے۔ جب آپ نے نوکریاں دی تھیں تو جیل میں ڈال دیا گیا تھا لہٰذا اس معاملے پر قلم اٹھانا ان پر کوئی احسان نہیں تھا۔

خیر گیلانی صاحب سے ایک نئے تعلق کی بنیاد پڑی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ عام سیاستدانوں کے برعکس ملنے ملانے میں زیادہ بہتر انسان تھے۔ ان کا رویہ عام لوگوں سے بہت اچھا تھا۔ ہر ایک کے ساتھ عزت سے پیش آنا اور شفقت سے گفتگو کرنا ان کے مزاج کا حصہ تھا لہٰذا مجھے ملنے جلنے میں وہ عار محسوس نہیں ہو رہی تھی جو میں دیگر سیاستدانوں کے معاملے میں رکھتا تھا۔

اس کے بعد میں ان سے ملنے کے لیے اڈیالہ جیل گیا۔ وہ بڑی عزت اور احترام سے پیش آتے۔ مجھے ایک نیا شوق ہونے لگا کہ کیوں نہ ان سے ان کی سیاسی زندگی کے بارے میں بات چیت شروع کی جائے تاکہ ماضی میں چھپے ہوئے رازوں پر سے پردہ اٹھایا جا سکے۔ یوں میرا اڈیالہ جیل آنا جانا زیادہ ہو گیا۔ ایک دن گیلانی صاحب نے بتایا کہ وہ اپنی آپ بیتی لکھ رہے ہیں۔ جیل میں فارغ ہونے کی وجہ سے وہ یا تو بھارتی اداکارہ ایشوریا رائے کی فلمیں دیکھتے رہتے یا پھر کاغذ قلم لے کر اپنے ماضی کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے۔

آخر گیلانی صاحب نے میرے مسلسل انکار کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ ہم دونوں واپس جانے کی طرف گئے جہاں ان کی بیوی بچے اور ارشد شریف بیٹھے تھے۔ گیلانی صاحب نے اپنی کتاب کا اردو مسودہ میرے حوالے کیا تاکہ میں ارشد شریف کے ساتھ مل کر اس کا ترجمہ کرنا شروع کروں۔

میں نے گیلانی صاحب سے مسودہ لیا اور ارشد شریف کے ساتھ جیل کی سلاخوں سے باہر آ گیا۔ میں نے ارشد شریف کو ساری بات بتائی کہ کیسے گیلانی صاحب ہمیں ہزار روپے ایڈوانس کے طور پر دے رہے تھے۔ ارشد شریف مسکرایا اور فوراً بولا پھر واپس کیوں کر دیے تھے؟ پیسوں کی بڑی شدید ضرورت تھی۔

میرا اور ارشد کا خیال تھا کہ اس کتاب کو دو حصوں میں بانٹ کر اس کا ترجمہ کرنا شروع کرتے ہیں اور پھر اسے اکٹھے بیٹھ کر ایڈٹ کر لیں گے۔ ارشد شریف ان صحافیوں میں سے ہے جو ہر کام کو دل کے ساتھ کرتے ہیں اور بہت اچھا کرتے ہیں۔ ارشد شریف کا موڈ اس وقت یہ مسودہ پڑھ کر خراب ہو گیا جب اس نے گیلانی صاحب کی اپنے خاندان کے بارے میں دی گئی چھوٹی چھوٹی معلومات کو پڑھا۔ میں نے ارشد کو بتایا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم اس کتاب کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کریں۔ ہمیں انگلش قاری کو ذہن میں رکھ کر اس کتاب کو لکھنا تھا لہٰذا گیلانی صاحب کے اس خاندان کے باب کو ہم اپنی مرضی سے ایڈٹ کر کے لکھ سکتے ہیں۔ میں نے گیلانی صاحب سے اگلی ملاقات پر یہ بات کی تو انہوں نے فوراً مجھے اس بات کی اجازت دی کہ ہم جیسے چاہیں اپنی سمجھ کے مطابق اس کتاب کو انگلش کا رنگ دیں۔

میں واپس آیا اور ارشد شریف سے بات کی جس میں میں نے محسوس کیا کہ ارشد شریف اب اس پراجیکٹ میں زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کر رہے تھے۔ میں نے ارشد کو سمجھانے کی کوشش کی کہ صرف پاکستان میں ہی ہم صحافی اس طرح کے کام نہیں کرتے تھے۔ دنیا بھر کے صحافی تحقیقات کر کے شاندار کتابیں چھاپتے تھے۔ میں نے ارشد سے کہا کہ اگر آج ہم نے گیلانی صاحب کی یہ کتاب انگلش میں کر لی تو نہ صرف ہمارے اپنے صحافیانہ کیریئر کو پروفیشنل فائدہ ہو گا بلکہ ہم اور بھی بہت سے سیاستدانوں کی آپ بیتیاں لکھنے کا ایک نیا سلسلہ شروع کر سکتے ہیں۔ میں نے ارشد سے مذاقاً بھی کہا کہ کون جانتا ہے کہ کل کو یہ جیل میں بیٹھا یوسف رضا گیلانی اس ملک کا وزیراعظم بن جائے اور پھر

اس کی سیاست اور ذات پر کبھی بھی کوئی گفتگو کرنے کے لیے ہم دونوں سے بہتر تبصرہ نگار اور کوئی نہیں ہو گا۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ گیلانی صاحب واقعی وزیراعظم بن گئے۔

میری یہ آخری کوشش بھی رائیگاں گئی کیونکہ اس کے بعد ارشد بالکل اس پراجیکٹ میں دلچسپی ختم کر گیا۔ اسی اثناء میں پتہ چلا کہ ارشد کو برطانیہ میں ماسٹرز کرنے کے لیے ایک اسکالرشپ مل گئی ہے اور وہ کچھ دنوں بعد پاکستان چھوڑ گیا۔ یوں گیلانی صاحب کی یہ کتاب کبھی بھی انگریزی میں نہیں چھپ سکی اور اس کے ذمہ دار اور کوئی نہیں، میں اور ارشد شریف ہیں۔ گیلانی صاحب کی آپ شرافت دیکھیں کہ اتنے برسوں میں انہوں نے مجھے کبھی یاد تک بھی نہیں دلایا کہ میں نے ان سے ان کی کتاب کا انگریزی ترجمہ کرنے کا وعدہ کیا تھا اور کوئی وجہ بتائے بغیر آج تک اس پر کام نہیں کیا۔

اسی اثناء میں میں ایک دن اس وقت کے وزیر اطلاعات فیصل صالح حیات سے ملنے ان کے دفتر گیا۔ میں نے باتوں باتوں میں ان سے کہا کہ وہ بھی اپنی بائیوگرافی لکھیں کیونکہ ان کی زندگی اتنی دلچسپ گزری تھی کہ پڑھنے والوں کے لیے اس میں بہت کچھ موجود ہو گا۔ میں نے ان سے یہاں تک کہا کہ اگر وہ چاہتے ہیں تو میں ان سے ساری داستان سن کر وہ کتاب لکھوں گا۔ وہ راوی ہوں گے اور ترتیب میں دوں گا۔ فیصل صالح حیات نے میری بات کو مذاق میں اڑا دیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ جب یوسف رضا گیلانی بھی جیل میں کتاب لکھ رہے تھے تو انہیں بھی کچھ لکھنا چاہیے۔ میرا خیال ہے اس وقت فیصل صالح حیات نے یہ سمجھا کہ شاید جیسے میں انہیں ان کی کتاب لکھنے کی آفر کر رہا تھا ویسے ہی یوسف رضا گیلانی کی کتاب بھی لکھ رہا تھا۔ حالانکہ میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ انہیں بھی یوسف رضا گیلانی کی طرح اپنی آپ بیتی لکھنی چاہیے۔

شاید ان سات برسوں میں فیصل صالح حیات کے ذہن میں یہی بات رہی کہ یوسف رضا گیلانی کی آپ بیتی میں نے لکھی تھی۔ فیصل نے اپنے [illegible] بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے یہ کہا تھا کہ ان کی کتاب بھی اسی صحافی نے لکھی تھی جس نے [illegible] کے خلاف سکینڈل فائل کیا تھا۔ فیصل نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ [illegible] یہ صحافی جس سے وزیراعظم نے اپنی کتاب لکھوائی ہے وہ ان کے خلاف [illegible]
جب وزیراعظم گیلانی نے اس بات کی وضاحت کی کہ یہ کتاب انہوں نے خود لکھی ہے اور [illegible]

رہی۔ اب مجھے یہ نہیں پتہ کہ بڑی غلطی آج کس کی ہوئی تھی کیونکہ گیلانی صاحب کے ساتھ ساتھ میں بھی اس کی طرح اس کھیل میں شریک ہو گیا تھا۔ ہم سارے اس ہنسی مذاق سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ اب سوچتا ہوں کہ کیا اس وقت اس کو یہ پتا ہو گا کہ وہ کسی ایسے شخص کو سہرا کرتی رہی تھی جو بعد میں پاکستان کا وزیراعظم بنا۔

ابھی ہم وہاں بیٹھے ہی تھے کہ گیلانی صاحب نے مجھے بتایا کہ ان سے ملنے کے لیے آصف علی زرداری کے ایک بڑے قریبی دوست فیصل حئی بٹ آ رہے ہیں۔ میں انہیں نہیں جانتا تھا۔ گیلانی صاحب کہنے لگے کہ وہ انہیں کھانے پر لے جانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بھی کہا کہ میں بھی ان کے ساتھ چلوں۔ میں نے محسوس کیا کہ گیلانی صاحب کچھ چپ چپ سے تھے۔ ان کی آج بینظیر بھٹو سے سات سال بعد پارٹی میٹنگ میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ شاید سمجھ رہے تھے کہ پارٹی کے لیے پانچ سال جیل میں رہنے کے بعد اور جنرل مشرف کی ہر آفر ٹھکرانے کے بعد بینظیر بھٹو شاید انہیں بڑا پروٹوکول دیں گی۔ تاہم میٹنگ میں بینظیر بھٹو نے یوسف رضا گیلانی کو شاید وہ پروٹوکول نہیں دیا جس کے وہ واقعی حقدار تھے۔ جب فیصل حئی بٹ وہاں پہنچے تو میرا ان سے تعارف ہوا۔ انہوں نے بھی تھوڑی دیر بعد یہ بات محسوس کی کہ گیلانی صاحب کچھ بجھے بجھے سے تھے۔ فیصل بٹ بڑے سمجھدار نکلے۔ انہوں نے گیلانی صاحب کا حوصلہ بڑھانے کے لیے اسی وقت اپنے موبائل فون سے آصف علی زرداری کو فون کیا جو اس وقت نیویارک میں تھے۔ انہوں نے یوسف رضا گیلانی کی آصف زرداری سے بات کرائی۔ فیصل بٹ زرداری صاحب کو اشارتاً بتا چکے تھے کہ گیلانی صاحب کا موڈ کچھ بہتر نہیں ہے۔ آصف زرداری کو احساس ہو گیا تھا کہ شاید لندن میں ہونے والی پارٹی میٹنگ میں ان کے جیل کے ساتھی کو وہ مقام نہیں دیا گیا جس کی وہ توقع کر رہے تھے۔ زرداری صاحب بڑی دیر تک گیلانی صاحب کے ساتھ ٹیلی فون پر باتیں کرتے رہے۔ اتنی دیر میں فیصل بٹ ہمیں اپنی گاڑی میں بٹھا کر کھانا کھلانے کے لیے ایک خوبصورت ترکش ریسٹورنٹ لے گئے۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا لیکن اس ریسٹورنٹ کے اندر مستی اور خوبصورتی ابھی جنم لے رہی تھی۔ میں گیلانی صاحب اور فیصل بٹ اس ریسٹورنٹ کے اندر ایک کونے والی ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہاں عربی موسیقی کی دھنوں پر عربی لڑکیوں نے وہ رقص پیش کیا کہ ہم تینوں اپنی اپنی پریشانیاں بھول گئے اور ہمارے سامنے پڑی لذیذ ڈشیں بھی سانسوں کو گرمانے والے

اس ماحول میں کب کی پڑی ٹھنڈی ہو گئی تھیں۔

○○○

اگلے دن بینظیر بھٹو نے پارٹی کی ایک اور میٹنگ بلائی ہوئی تھی۔ گیلانی صاحب نے مجھے کہا کہ میں اس میٹنگ کے بعد ایجوئے روڈ پر آ جاؤں۔ فارغ ہو کر وہاں بھی بات کریں گے۔ جب میں مقررہ وقت پر وہاں پہنچا تو میٹنگ ختم ہو چکی تھی۔ میں اور گیلانی صاحب ایجوئے روڈ پر پیدل چلنے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ آج ایک دفعہ پھر چپ چپ سے تھے۔ آگے ایک عربی کی دکان پر کھجوریں دیکھ کر میرے منہ میں پانی بھر آیا اور میں نے گیلانی صاحب سے کہا کہ مجھے پہلے یہ کھجوریں خرید لینے دیں۔ ہم ابھی وہیں کھجوریں خرید رہے تھے کہ کسی نے پیچھے سے آ کر انہیں زور سے پکڑ لیا۔ گیلانی صاحب بڑے حیران ہوئے کہ ایجوئے روڈ کی اس سرد شام میں بھلا ان کا کون جاننے والا ایسی بے تکلفی سے ان کی کمر میں ہاتھ ڈال سکتا تھا۔ ہم دونوں نے مڑ کر دیکھا تو شہباز شریف وہاں کھڑے مسکرا رہے تھے۔ گیلانی صاحب اور شہباز شریف آٹھ سال بعد ایجوئے روڈ پر یوں مل رہے تھے۔ دونوں بڑی دیر تک ششدر اور حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ دو تین منٹ ایک دوسرے کا حال احوال پوچھا۔ شہباز شریف ذرا سی جلدی میں تھے۔ وہ اجازت لے کر روانہ ہوئے۔ تقدیر کی بھی اپنی ایک کہانی ہوتی ہے۔ ان دونوں نے بھلا یہ کب سوچا تھا کہ چھ ماہ بعد ان میں سے ایک ملک کا وزیراعظم اور دوسرا پنجاب کا وزیراعلیٰ بنے گا۔

میں نے اور گیلانی صاحب نے ایک مرتبہ پھر ایجوئے روڈ پر چلنا شروع کیا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ تمہیں پتہ ہے کہ ایک سیاستدان کتنے عرصے بعد اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ جب چاہے، جس وقت چاہے اور جہاں چاہے لوگوں کو استعمال کرنے کا فن سیکھ لیتا ہے۔

میں بڑا حیران ہوا کہ گیلانی صاحب بھلا یہ کس طرح کی بات مجھ سے پوچھ رہے تھے۔ میں کیسے ان کے اس بیان کی تائید یا تردید کر سکتا تھا۔ خیر، میں نے بڑی سمجھداری سے ان کی بات سنی اور جواب دینے کی بجائے چپ رہنا مناسب سمجھا کیونکہ میرا تجربہ کہتا ہے کہ ایسے موقعوں پر جب کوئی شخص اس طرح کی بات کرے تو اس کا مطلب بڑا واضح ہوتا ہے کہ وہ خود ہی کوئی بات کرنے کے موڈ میں تھا لہٰذا اپنے آپ کو سمجھدار سمجھ کر بولنے کے بجائے بہتر ہے انتظار کر کے اس کی بات سنی جائے کہ آخر اس

کے من میں کیا ہے۔

میرا چپ رہنا میرے حق میں بہتر نکلا کیونکہ گیلانی صاحب نے پھر اپنی ذات سے جڑی ایک ایسی تاریخی کہانی سنائی جس سے مجھے سیاستدانوں کے مزاج اور نفسیات کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوئی۔

گیلانی صاحب بولے کہ آج جب بینظیر بھٹو صاحبہ پارٹی کی میٹنگ کی صدارت کر رہی تھیں تو انہیں دیکھ کر پیر پگاڑا کی بائیس سال پہلے کی یہ بات یاد آ رہی تھی کہ ایک سیاستدان بیس سال بعد لوگوں کو استعمال کرنے کا فن سیکھ لیتا ہے۔ کامیاب سیاستدان بھی وہی ہوتا ہے جو دوسروں کو استعمال کرنے کا فن سیکھ لے انہیں تو ساری عمر خود استعمال ہوتا رہے گا۔ گیلانی صاحب کا خیال تھا کہ بینظیر بھٹو اب اتنی میچور سیاستدان بن چکی ہیں کہ آج انہیں محسوس ہوا کہ پیر پگاڑا کی یہ بات سچی تھی۔ وہ جس طریقے سے پارٹی کے لوگوں کو ڈیل کر رہی تھیں اس سے صاف واضح تھا کہ وہ نہ صرف سیاستدان کو سمجھتی تھیں بلکہ وہ سیاستدانوں کو استعمال کرنے کے فن سے بھی اچھی طرح آشنا تھیں۔

میں بینظیر بھٹو کے بارے میں گیلانی صاحب کا تبصرہ بھول کر ان سے پوچھنے لگا کہ بھلا پیر پگاڑا نے ان سے یہ بات کیوں اور کب کی تھی اور اس کے پیچھے کیا کہانی تھی۔

یوسف رضا گیلانی نے ایجوئے روڈ پر چلتے چلتے مجھے بائیس سال پہلے کی وہ کہانی سنائی جو انہیں آج بینظیر بھٹو کو دیکھ کر یاد آ گئی تھی۔

○○○

یوسف رضا گیلانی محمد خان جونیجو کی حکومت میں ایک نوجوان وزیر تھے۔ ان کو وزیر بنے ابھی کچھ عرصہ ہوا تھا۔ وزیراعظم جونیجو اور پیر صاحب پگاڑا کی پنجاب کے وزیراعلیٰ نواز شریف سے نہیں بنتی تھی۔ اور تو اور، جنرل ضیاء الحق کو بھی یہ گلہ تھا کہ نواز شریف یہ سمجھتے تھے کہ وہ وزیراعلیٰ پنجاب اس لیے تھے کہ ارکان صوبائی اسمبلی کی اکثریت ان کے ساتھ تھی۔ یہ بات جنرل ضیاء سے ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ نواز شریف یہ سمجھیں کہ وہ اپنی وجہ سے وزیراعلیٰ تھے نہ کہ جنرل ضیاء کی بدولت۔ جنرل ضیاء نے اپنے دل کی بات پیر پگاڑا کے سامنے رکھی۔ جنرل ضیاء کا گلہ سن کر پیر پگاڑا نے فرمایا کہ سائیں فکر نہ کریں، نواز شریف ٹھیک ہو جائیں گے۔ اگلے دن پیر پگاڑا نے یوسف رضا گیلانی کو بلایا اور انہیں کہا کہ آپ

پنجاب جائیں اور اپنے آپ کو وزیراعلیٰ پنجاب کے طور پر ممبران اسمبلی کے سامنے پیش کرنا شروع کریں اور اپنے ساتھ چند بڑے بڑے سیاسی لوگوں کو شامل کریں۔ گیلانی صاحب نے پیر پگاڑا کے کہنے پر پنجاب میں جا کر ڈیرے لگا دیے۔ وہ ان دنوں وزیر ریلوے تھے۔ ایئرپورٹ اور ریلوے اسٹیشن سے آتے جاتے پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے درجنوں اراکین اسمبلی نے ان کا استقبال کرنا شروع کر دیا۔ یہ خبر پھیل چکی تھی کہ وفاقی حکومت یوسف رضا گیلانی کو نیا وزیراعلیٰ بنانا چاہتی ہے۔ جب بات زیادہ پھیل گئی تو بڑے بڑے لوگوں نے ان سے خفیہ رابطے کرنا شروع کر دیے۔ ان میں نصر اللہ دریشک، عاشق گوپانگ، ملک اللہ یار کھنڈا، مخدوم الطاف، رفیق لغاری اور دیگر بے شمار ایم پی اے ان کے گروپ میں آ گئے۔ سب سے بڑی کامیابی اس وقت ہوئی جب چوہدری پرویز الٰہی نے ان سے رابطہ کیا۔ وہ نواز شریف کو چھوڑ کر ان کے ساتھ شامل ہونا چاہتے تھے۔ اور تو اور، منظور وٹو کو بھی جب اس سارے معاملے کی بھنک ملی تو وہ بھی گیلانی صاحب سے ملنے کے لیے بے چین ہو گئے۔ یوں بہت کم عرصے میں گیلانی صاحب نے ایم پی ایز کی ایک بڑی تعداد کو اپنے ساتھ ملا لیا۔

پیر پگاڑا صاحب کو پیغام بھیجا گیا کہ جناب اب آپ بتائیں کہ نیا وزیراعلیٰ کس کو بنانا ہے کیونکہ نواز شریف کے خلاف بغاوت ہو چکی ہے۔ پیر صاحب سیاست کے پرانے کھلاڑی تھے۔ انہوں نے نوجوان گیلانی کو کہا کہ انتظار کرو۔

گیلانی صاحب ابھی لاہور میں تھے اور اپنے تئیں اپنی مرضی کے وزیراعلیٰ کا نام سوچ رہے تھے کہ پتہ چلا کہ نواز شریف جنرل ضیاء الحق سے ملنے کے لیے اسلام آباد تشریف لے گئے ہیں۔ نواز شریف کو احساس ہو گیا تھا کہ جنرل ضیاء سے معافی تلافی کیے بغیر ان کی وزارت اعلیٰ نہیں بچے گی۔ وہ جنرل صاحب سے ملے گئے اور اپنی وفاداری کا نئے سرے سے حلف اٹھایا۔ جب جنرل ضیاء اور نواز شریف کی ملاقات ختم ہوئی تو جنرل ضیاء الحق نے ایک بیان جاری کیا کہ نواز شریف کا کلہ مضبوط ہے۔ وزیراعظم محمد خان جونیجو نے بھی یہ بیان دیا کہ پنجاب میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ رہی سہی کسر پیر صاحب پگاڑا کے بیان نے پوری کر دی کہ نواز شریف کی بوری میں سوراخ تھا جس کا میں نے علاج کر دیا ہے۔ کھیل ختم ہو گیا تھا۔

جونہی یہ خبر لاہور پہنچی، سارے کے سارے ایم پی ایز خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے۔ ان سب کو

احساس ہو گیا کہ انہیں استعمال کیا گیا تھا۔ ان سے زیادہ گیلانی صاحب کو احساس ہوا کہ مجھے جنرل ضیاء، محمد خان جونیجو اور پیر پگاڑا نے مل کر استعمال کیا تھا۔ میں بڑے بجھے دل کے ساتھ پیر پگاڑا صاحب سے ملنے گیا اور ان سے پوچھا کہ انہوں نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا تھا۔

وہ مسکرائے اور بولے بچہ یہ سب سیاست ہے۔ نواز شریف جنرل ضیاء کو آنکھیں دکھا رہا تھا۔ میں نے جنرل ضیاء سے کہا کہ ہم نواز شریف کو ٹھیک کر دیں گے۔ اب ہم نے ایک ایسے بندے کو منتخب کرنا تھا جس کو استعمال کر کے نواز شریف کو سبق سکھایا جا سکتا۔ میری نظر تمہارے اوپر پڑی۔ تم نوجوان ہو۔ تمہاری ابھی سیاست میں پوری کریڈیبلٹی نہیں ہے۔ ملتان کے ایک بڑے سیاسی گھرانے سے تمہارا تعلق ہے۔ دوسرے تم میرے رشتہ دار ہو جبکہ تمہارے لیے ایم پی ایز کو یقین دلانا آسان تھا کہ وہ نواز شریف کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ مل جائیں۔ شکر ہے میرا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ تم نے مجھے مایوس نہیں کیا۔

گیلانی صاحب نے ٹوٹے دل کے ساتھ کہا کہ اس کا مطلب ہے آپ نے مجھے استعمال کیا ہے۔

پیر صاحب مسکرائے اور بولے جی ہاں! میں نے آپ کو استعمال کیا ہے۔

ایک شکست خوردہ گیلانی نے سیاست کے گرو سے پوچھا کہ ایک سیاستدان کب اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ جب چاہے کسی کو بھی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔

پیر صاحب نے کہا۔ بیس سال بعد۔

OOO

ایم اے روڈ پر چلتے ہوئے مجھے ایک لمحے میں یہ بات سمجھ آ گئی تھی کہ یوسف رضا گیلانی کے کہنے کا کیا مطلب تھا اور انہیں بینظیر بھٹو کو آج پارٹی کی میٹنگ میں کیوں پیر پگاڑا کا بیس سال پرانا فقرہ یاد آ گیا تھا۔

میں نے مسکراتے ہوئے گیلانی صاحب سے پوچھا کہ آپ کو سیاست میں کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔

میری بات کا مطلب سمجھ کر وہ مسکرائے کہ چھوڑو یار ہوٹل چلتے ہیں۔ وہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔

لندن میں ہونے والی اس ملاقات کے ٹھیک سات ماہ بعد مارچ 2008ء کی ایک شام میں گھر پہنچا تو پتہ چلا کہ یوسف رضا گیلانی گھر پر ایک کیک دے کر گئے تھے۔ وہ کیک اپنے وزیراعظم بننے کی خوشی میں تھا۔ یہ بھی ان کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ انہوں نے یہ بات یاد رکھی کہ جس دن وہ ملک کے وزیراعظم بن رہے تھے اس صحافی کے گھر جا کر انہوں نے کیک دینا تھا جو کبھی ان سے جیل میں آ کر ملتا تھا۔

OOO

جب گیلانی صاحب وزیراعظم بنے تو ان کے لیے سب سے بڑا بحران ان کے وہ دوست تھے جو ان کے ساتھ ان پانچ سالوں میں جیل میں رہے تھے۔ وہ ایک بہت بڑے گھپلے کا شکار تھے۔ اگر وہ جیل کے دنوں کے ان دوستوں کو بھلاتے تو ان پر یہ الزامات لگتے کہ وہ ایک خود غرض اور بے وفا انسان تھے جو اقتدار میں آتے ہی بدل گئے تھے لیکن اگر وہ انہیں اہمیت دیتے تو پھر ان کی اپنی بدنامی ہوتی تھی۔ اور بدنامی ہو کر رہی کیونکہ جیل کے دنوں کے ان ساتھیوں نے ہر جگہ یہ بتانا شروع کر دیا کہ وہ وزیراعظم کے ذاتی دوست ہیں۔ کسی نے کہیں پلاٹوں پر قبضہ کر لیا تو کسی نے [illegible] اپنے نام کرانی شروع کر دیں۔ کوئی ان کا نام استعمال کر کے ٹرانسفر پوسٹنگ کرانے لگ گیا تو کسی نے ٹھیکے پکڑنے شروع کر دیے۔ جب مجھ تک اس طرح کی خبریں پہنچیں تو میں نے گیلانی صاحب کے خلاف زوردار قسم کی سٹوریاں فائل کیں۔ گیلانی صاحب کو پہلا دھچکا اس وقت لگا جب میں نے اپنے اخبار دی نیوز میں ایک خبر لگائی کہ جس دن ملتان میں پاور لوم کے تاجر لوڈشیڈنگ کے خلاف ہنگامے کر رہے تھے اور پورے شہر کو آگ لگی ہوئی تھی، اسی شام گیلانی صاحب بحریہ ٹاؤن میں ملک ریاض کے گھر ایک بہت بڑی دعوت میں شریک تھے۔ ان کے نزدیک جلتے ہوئے ملتان جانے سے ملک ریاض کے گھر دعوت میں جانا زیادہ اہم تھا۔

یہ خبر پڑھ کر کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ میری اور گیلانی صاحب کی اتنی قریبی دوستی تھی اور میں پھر بھی ان کے خلاف اتنی بڑی خبر فائل کروں گا۔ مجھے بعد میں وزیراعظم گیلانی کے پرنسپل سٹاف آفیسر خالد سلطان نے بتایا کہ جونہی صبح اس نے خبر پڑھی تو اس نے وزیراعظم گیلانی کو فون کیا اور انہیں بتایا کہ

کے سب مشہور صحافی ایک چھت تلے اکٹھے تھے۔ اچانک ان سب کے سب نے "آج" ٹی وی چینل کی اینکر پرسن راشدہ نے ان سے پوچھ لیا کہ گیلانی صاحب اطلاع ہے کہ آپ نے لاہور ڈیفنس میں چار گھر خریدے ہیں۔ راشدہ کے سوال پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ پیسے کہاں سے آئے تھے۔ ایک لمحے کے لیے پورے ہال میں ایک سناٹا چھا گیا۔ سب صحافیوں نے وزیراعظم گیلانی کی طرف دیکھنا شروع کیا کہ اب وہ کیا ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ میں آپ کو یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر یہ سوال شوکت عزیز، جنرل پرویز مشرف یا نواز شریف سے کیا جاتا تو انہوں نے اس رپورٹر کی زندگی حرام کر دینی تھی۔ گیلانی صاحب نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا کہ اگر خریدے ہیں تو چھپ کر نہیں خریدے۔ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف دیکھ کر کہا کہ کسی اور نے کوئی سوال پوچھنا ہو تو پوچھ لے۔ یوں ایک لمحے میں انہوں نے اپنے خلاف ایک سکینڈل کو وہیں ختم کر دیا۔ انہوں نے اس کی کوئی لمبی چوڑی وضاحت دینا مناسب نہیں سمجھا اور اس کے بعد میں نے کبھی ان کے ان چار گھروں والا معاملہ اخبارات یا ٹیلی ویژن چینلز پر نہ کبھی پڑھا اور نہ سنا۔

گیلانی صاحب سے پوچھے گئے اس سوال کا موازنہ اب نواز شریف سے جولائی 2010ء کے پہلے ہفتے میں لاہور کے ایک صحافی کی جانب سے پوچھے گئے سوال کے جواب میں دکھائے گئے شدید ردعمل سے کریں۔ داتا دربار پر ہونے والے خونی حملوں کے بعد ان سے ایک رپورٹر نے جرأت کر کے صرف اتنا پوچھ لیا کہ میاں صاحب! آپ کی سیکیورٹی پر سینکڑوں کی تعداد میں پنجاب پولیس کے لوگ تعینات ہیں...... یہ سن کر میاں صاحب بھڑک اٹھے اور انہوں نے رپورٹر کو غصے میں جواب دیا کہ آپ نے مجھ سے کس طرح کا سوال پوچھا ہے۔ میاں صاحب نے فوری طور پر اس سوال کو یہ کہہ کر مسترد کیا کہ صحافی نے ان کی ذاتیات پر حملہ کیا ہے۔ آپ تصور کریں کہ اگر ہماری صحافی دوست راشدہ میاں صاحب سے اسی طرح کا کوئی سوال پوچھ لیتی جیسا انہوں نے یوسف رضا گیلانی صاحب سے پوچھا تھا تو کیا ردعمل ہوتا۔

ممکن ہے کہ گیلانی صاحب نے یہ سوچ لیا ہو کہ عوام اور میڈیا کچھ بھی کہتے رہیں، وہ وہی کچھ کرتے رہیں گے جو ان کے سیاسی مفاد میں ہے۔ ایک بات طے ہے کہ گیلانی صاحب اس پائے کے لیڈر نہیں ہیں جس کی ہمیں ان برے وقتوں میں ضرورت ہے۔ وہ شریف اور مروت بھرے انسان ضرور ہیں لیکن قابل نہیں! مجھے ان کی جو بات اچھی لگتی ہے وہ ان کی قوت برداشت ہے جس کو صحافی ہونے کے

ناطے میں اپنا وقت ضائع کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہوں لیکن اب تک انہیں اپنے چہرے پر پسینہ نہیں لا سکا۔

گیلانی صاحب قوم کی قسمت بدل سکیں یا نہ بدل سکیں لیکن انہوں نے ان کی اپنے بچوں، بیٹیوں، دامادوں اور دوستوں کی قسمت ضرور بدل دی ہے۔ اس سے زیادہ شاید گیلانی صاحب کو خواہش ہے اور نہ ہی طلب!!

ذوالفقار علی بھٹو

انٹرویو: اوریانا فلاسی

میں وہ دعوت نامہ دیکھ کر بڑی حیران ہوئی تھی۔ یہ دعوت ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے تھی۔ میرے پاس کوئی بہانہ بھی نہیں تھا کہ میں اسے مسترد کرتی۔ مجھے صرف اتنا کہا گیا تھا کہ جتنا جلدی ممکن ہو میں راولپنڈی پہنچ جاؤں۔ میں حیران ہوئی کہ اتنی جلدی کیوں؟ یہ بات درست ہے کہ ہر صحافی کی زندگی میں یہ بڑی خواہش ہوتی ہے کہ اسے ایک دفعہ وہ لوگ خود دعوت دے کر ملنے کی خواہش کا اظہار کریں جو اس وقت آپ سے ملنے سے انکاری ہوتے ہیں جب آپ کو ان کی ضرورت پڑتی ہے۔

میرے ذہن میں مختلف باتیں آنے لگیں۔ بھٹو صاحب مجھ سے کیوں ملنا چاہ رہے تھے۔ کیا وہ مجھے اندرا گاندھی کے نام کوئی پیغام دے کر بھارت بھیجنا چاہتے تھے۔ میں نے اپنے یہ مفروضے خود ہی مسترد کر دیے۔ بھٹو صاحب کو اپنے دشمن کے ساتھ رابطہ کرنے کے لیے مجھ جیسی صحافی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ یہ کام سوئس اور روسی سفارتکاروں کے ذریعے بخوبی سرانجام دے سکتے تھے۔ میرے ذہن میں ایک اور بات آئی لیکن وہ بھی میں نے فوری طور پر مسترد کر دی کیونکہ بھٹو صاحب ایک تہذیب یافتہ شخص ہیں اور ایسے لوگ اپنے مہمانوں کو بلا کر قتل نہیں کرتے۔ ایک اور خیال آیا کہ شاید مجھے بلا کر اپنا انٹرویو دینا چاہ رہے ہوں اور یوں ایک طرح کا سرپرائز میرا انتظار کر رہا تھا۔ شاید یہی بات بھٹو صاحب کے

ذہن میں بھی تھی، بھٹو صاحب سے انہوں نے بنگلہ دیش کے صدر مجیب الرحمٰن کے بارے میں ایک مضمون چھاپا تھا۔

آخر میرا تجسس میرے شک پر حاوی ہو گیا اور میں نے بھٹو صاحب کی یہ دعوت قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تاہم یہ دعوت قبول کرنے سے پہلے میں نے یہ بات ان پر واضح کر دی کہ ان کے یہاں جانے کا مطلب یہ نہیں ہو گا کہ میں کھل کر ان کے بارے میں جو چاہوں وہ نہیں لکھ سکوں گی۔ میں پہلے میزبانوں کے بارے میں اپنی مرضی کا تاثر لکھتی ہوں اسی طرح میں ان کے بارے میں بھی لکھوں گی۔ کوئی بھی تو چاہے وہ مجھے آداب ہوں یا میری خوشامد، مجھے نہیں خرید سکیں گی۔

بھٹو صاحب کا جواب آیا کہ ٹھیک ہے آپ کا جو جی چاہے وہی لکھیے گا۔

یہ میرا بھٹو صاحب کے بارے میں پہلا تاثر تھا۔

بھٹو صاحب ایک ایسے شخص ہیں جن کے بارے میں کوئی بات وثوق سے نہیں کی جا سکتی۔ وہ بڑی تیزی سے اپنا ذہن بدلتے رہتے ہیں۔ ایک عجیب و غریب شخص ہیں جو اسی طرح کے فیصلے کرتے ہیں۔ تاہم یہ بات ماننی پڑے گی کہ وہ بہت ذہین شخص ہیں۔ وہ ایک لومڑی کی طرح بہت چالاک ہیں۔ مہمانوں کو اپنی خوبصورتی سے متاثر کرنے والے یا انہیں کنفیوژ کرنے والے ہیں۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ ان میں آپ کو ایک بھرپور رواداری اور گہری یادداشت کی جھلکیاں بھی نظر آئیں گی۔

جب میں راولپنڈی ایئرپورٹ پر اتری تو دو افسران نے مجھے ریسیو کیا۔ دونوں نے بڑے جذباتی انداز میں مجھے بتایا کہ صدر پاکستان ایک گھنٹے کے اندر اندر ان سے ملاقات کرنے والے ہیں۔ اس وقت پاکستان میں صبح کے دس بج رہے تھے اور میں پچھلے اڑتالیس گھنٹوں سے نہیں سو پائی تھی۔

میں نے ان دونوں افسروں کو بتایا کہ ایک گھنٹے کے اندر ہرگز ان سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ اس وقت مجھے ایک اچھے باتھ اور نیند کی ضرورت ہے۔

شاید یہ بات اگر کسی اور صدر کے لیے مجھ جیسی صحافی نے کی ہوتی تو وہ شاید ان کے لیے بہت بڑی توہین ہوتی لیکن بھٹو صاحب نے اس بات کا برا نہیں منایا۔ انہوں نے اس ملاقات کو شام ساڑھے سات بجے تک یہ کہہ کر ملتوی کر دیا کہ وہ رات کو کھانے پر میرا انتظار کریں گے۔

جب میں شام کو بھٹو صاحب سے ملنے گئی تو بھٹو صاحب نے کھلے بازوؤں اور مسکراتے چہرے

کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ میرے سامنے ایک ایسا دراز قد شخص کھڑا تھا جو مجھے ایک ایسے بینکر کی طرح لگا جو آپ سے اپنے بینک میں اکاؤنٹ کھلوانا چاہتا ہو۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ان کی عمر چوالیس برس ہے لیکن مجھے وہ اپنی عمر سے زیادہ بڑے لگے۔ ان کے سر کے بال جھڑنا شروع ہو چکے تھے اور جو باقی بچ گئے تھے وہ بھورے تھے۔ ان کی گہری پلکوں کے پیچھے ان کا چہرہ، گال، ہونٹ، حتیٰ کہ آنکھوں کی پتلیاں بھی مجھے بھاری لگ رہی تھیں۔ پتہ نہیں کیوں بھٹو صاحب کی آنکھوں میں مجھے ایک عجیب سی اداسی نظر آئی۔ ان کی مسکراہٹ میں بھی ایک عجیب سا شرمیلا پن تھا۔

بہت سارے طاقتور لیڈروں کی طرح بھٹو صاحب میں بھی بہت زیادہ شرمیلا پن ہے۔ ان میں اور بھی بہت ساری ایسی باتیں ہیں جو آپ کو اندرا گاندھی میں بھی نظر آتی ہیں۔ آپ بھٹو صاحب کو جتنا بغور پڑھتے جائیں گے آپ اتنے ہی زیادہ کنفیوژ اور غیر یقینی نتائج اخذ کرتے جائیں گے۔ آپ بھٹو صاحب کو کئی طریقوں سے دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ آپ جس طریقے سے بھی دیکھیں گے وہی آپ کو درست لگے گا۔ بھٹو صاحب آپ کو ایک لبرل، ایک سخت گیر حکمران، فاشسٹ، کمیونسٹ، ایک انتہائی مخلص اور ایک جھوٹے شخص بھی لگیں گے۔ مجھے یہ کہنے میں حرج نہیں ہے کہ بھٹو صاحب ہمارے وقت کے سب سے زیادہ مشکل لیڈر ہیں۔ اگر پاکستان نے آج تک کوئی انتہائی دلچسپ چیز پیدا کی ہے تو وہ خود بھٹو صاحب ہیں۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ اگر اس وقت کوئی بھی پاکستان کو محفوظ رکھ سکتا ہے تو وہ بھٹو صاحب ہیں۔ آپ کو یہ بات ہر کوئی بتائے گا کہ بھٹو صاحب کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ اگر بھٹو نہ رہا تو پاکستان بھی دنیا کے نقشے سے مٹ جائے گا۔

جب آپ یہ بات سوچتے ہیں تو پھر آپ کے ذہن میں اندرا گاندھی کی بجائے اردن کے شاہ حسین کا خیال آتا ہے۔ شاہ حسین کی طرح بھٹو صاحب پر بھی یہ الزام لگتا ہے کہ وہ ایک ایسی قوم کی قیادت کر رہے ہیں جو مصنوعی طریقے سے وجود میں آئی ہے۔ وہ بھی شاہ حسین کی طرح سوویت یونین، انڈیا، چائنا اور امریکہ کے درمیان ایک سینڈوچ بنے ہوئے ہیں۔ شاہ حسین کی طرح وہ اس بات پر اڑے ہوئے ہیں کہ وہ کسی کے آگے نہیں جھکیں گے۔ اس کے ساتھ آپ کو یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ شاید وہ امریکی صدر جان کینیڈی کی طرح ہیں۔ وہ ایک ایسے دولت مند گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں کوئی چیز ناممکن نہیں حتیٰ کہ آپ سیاسی طاقت بھی حاصل کر لیتے ہیں چاہے اس پر کتنی ہی قیمت کیوں نہ صرف

ہو۔ کینیڈی ہی کی طرح بھٹو صاحب نے بھی بڑا خوبصورت، آرام دہ، طویل اور بڑا اچھا بچپن گزارا ہے۔ جان کینیڈی کی طرح ہی وہ اقتدار کی غلام گردشوں میں اوائل عمری میں ہی داخل ہو گئے تھے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بھٹو صاحب جاگیرداروں اور اشرافیہ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے پہلے برکلے اور پھر آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی جہاں انہوں نے انٹرنیشنل لاء میں ڈگری لی۔ ابھی ان کی عمر تیس برس سے کچھ ہی زیادہ ہوئی تھی کہ وہ ایوب خان کی کابینہ کے وزیر بن چکے تھے گرچہ وہ ان سے شدید نفرت کرتے تھے۔ ابھی چالیس سال کی عمر پوری ہونے میں کچھ عرصہ باقی تھا کہ وہ جنرل یحییٰ خان کے وزیر بن چکے تھے اور ان سے بھی وہ نفرت کرتے تھے۔ بھٹو صاحب بہت تکلیف دہ مراحل سے گزرنے کے بعد ایوان صدر میں براجمان ہوئے۔

طاقت محبت سے زیادہ بڑا جذبہ ہے اور جو لوگ طاقت سے محبت کرتے ہیں ان کے نہ صرف معدے بلکہ ناک بھی طاقتور ہوتے ہیں۔ انہیں بڑی خوشبوئیں تنگ نہیں کرتیں۔ بھٹو صاحب نے بھی اس طرح کی بڑی خوشبوؤں کو ناپسند نہیں کیا کیونکہ بھٹو صاحب کو بھی طاقت سے پیار ہے۔ تاہم جس طرح کے پاور سے وہ پیار کرتے ہیں اس کے بارے میں اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ وہ خود بھی اس بات کا جواب انتہائی مبہم انداز میں دیتے ہیں۔ وہ ان سیاستدانوں کے بارے میں آپ کو پہلے سے ہی خبردار کر دیتے ہیں جو سچ بولتے ہیں یا ایک بوائے اسکاؤٹ مورالٹی کو اپنی شخصیت کا حصہ بنا لیتے ہیں۔

جب آپ بھٹو صاحب کو سن رہے ہوتے ہیں تو آپ تقریباً اس بات پر یقین کرنا شروع ہو کر دیتے ہیں کہ شاید ان کی خواہشات بہت اچھی ہیں اور وہ یقیناً ایک اچھا سوشلزم پاکستان میں نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم جب آپ کراچی میں ان کی شاندار لائبریری میں داخل ہوتے ہیں تو آپ پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ مسولینی اور ہٹلر جیسے فاشسٹ لیڈروں کی کتابوں کو کتنے احترام کے ساتھ سٹور کی جلدوں میں رکھا گیا ہے۔ جتنی نفاست سے مسولینی اور ہٹلر کی کتابوں کو وہاں لائبریری میں رکھا گیا ہے تو آپ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ کتابیں محض اس وجہ سے وہاں نہیں رکھی گئیں کہ اس لائبریری کا مالک انہیں ایک شیلف میں رکھنا چاہتا تھا۔ آپ کے اندر شک اور غصہ ابھرنا شروع ہو جاتا ہے۔ آپ بھٹو صاحب سے پوچھتے ہیں تو آپ کو پتہ چلتا ہے کہ ان کے والد کے دوست سکارنو اور ناصر ہیں اور آپ کو ایک عجیب سی اذیت ہوتی ہے۔ کیا بھٹو صاحب نے کوئی خفیہ خواب دیکھ رکھا ہے کہ وہ ایک دن ڈکٹیٹر بنیں گے اور

[illegible]

یہ سب کچھ تو پہلے ہو چکا ہے مجھے اطالوی [illegible] کی ایک بات یاد آ گئی جب میں نے ان سے [illegible] کے بارے میں پوچھا تھا جن کے اس نے ایک [illegible] انٹرویو لیے تھے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کسی بھی سربراہ مملکت کو تاثر نہیں کر سکتے اگر آپ اس کے اندر صرف ایک انسان تلاش کر رہے ہوتے ہیں۔ آپ کو اس کے اندر ایک آدمی کو نہیں دیکھنا چاہیے کیونکہ جس لمحے آپ پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ بھی محض ایک آدمی ہی ہے جس کے اندر آپ کی طرح کی خوبیاں اور خامیاں ہیں تو پھر نہ چاہتے ہوئے بھی آپ اس سربراہ مملکت کو پسند کرنے لگتے ہیں اور باقی باتیں بھول جاتے ہیں۔

○○○

بھٹو صاحب کے اس انٹرویو کے چھپنے کی دیر تھی کہ ایک نیا شور شرابہ شروع ہو گیا۔ یہ ہنگامہ محض صحافیانہ انداز کا نہیں تھا جیسے کہ امریکی وزیر خارجہ ہنری کیسنجر کے سلسلے میں کھڑا ہو گیا تھا بلکہ اس کی نوعیت سفارتی اور عالمی بھی تھی۔ جیسے بھٹو صاحب اندرا گاندھی کے انٹرویو میں اپنے بارے میں ان کا یہ تبصرہ پڑھ کر بڑے غصے میں آ گئے تھے کہ وہ ایک غیر متوازن شخص ہیں۔ اسی طرح اندرا گاندھی بھی بھٹو صاحب کا یہ فقرہ پڑھ کر بہت ناراض ہوئیں جب انہوں نے مسز گاندھی کو ایک ایسی درمیانی ذہانت کی عورت قرار دیا جس میں کوئی خاص خوبی نہیں تھی اور سب سے بڑھ کر اپنے والد نہرو کے مقابلے میں اس میں آدھی خوبیاں بھی نہیں تھیں۔ بھٹو صاحب کا یہ بھی کہنا تھا کہ اندرا گاندھی سے ملنا اور ہاتھ ملانے کے بارے میں سوچ کر انہیں ہمیشہ ایک چڑ سی رہتی تھی۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اندرا گاندھی کا بھٹو صاحب کے ایک تبصرے سے ناراض ہونا واقعی درست تھا کیونکہ میرے خیال میں بھٹو صاحب نے وہ تبصرہ مسز گاندھی سے اپنی نفرت کی بنیاد پر کیا تھا نہ کہ انہوں نے انصاف کے تقاضوں سے کام لیا تھا۔ مجھے خود بھی بھٹو صاحب کی یہ بات سن کر خاصی

[illegible] کی کوشش بھی کی تھی۔ میں نے ان سے [illegible] کے ساتھ [illegible] ملاقات تو نہیں کر [illegible] بھٹو صاحب نے [illegible] تھی بلکہ اس کے بعد انہوں نے اندرا گاندھی کے بارے میں [illegible] باتیں بھی کہی [illegible] انٹرویو میں شائع کروا [illegible] اس انٹرویو کا نتیجہ بہت سنسنی خیز نکلا [illegible] خود تھی۔ جن دنوں یہ انٹرویو شائع ہوا انہی دنوں اندرا گاندھی اور بھٹو صاحب پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ کے بعد صلح کی دستاویز پر دستخط کرنے کے لیے ملنے والے تھے۔ جب بھٹو صاحب کا یہ انٹرویو نئی دہلی کے کچھ اخبارات میں چند اقتباسات کے ساتھ چھپا تو اندرا گاندھی چونک گئیں۔ انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ بھٹو صاحب کا یہ پورا انٹرویو پڑھنا چاہتی ہیں اور انہوں نے روم سے خصوصی طور پر اس انٹرویو کا سارا ٹیکسٹ منگوایا۔ بھٹو صاحب کا یہ سارا انٹرویو پڑھنے کے بعد اندرا گاندھی نے یہ اعلان کیا کہ اب وہ پاکستان کے وزیراعظم سے ملاقات نہیں کریں گی۔ یہ سن کر بھٹو صاحب مزید غصے میں آ گئے۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اپنا غصہ کس پر نکالیں۔ آخر انہوں نے اپنی توپوں کا رخ میری طرف کر لیا۔ انہوں نے ایک دفعہ پھر اٹلی میں پاکستانی سفیر کے ذریعے مجھے طلب کیا۔ بھٹو صاحب نے مجھے ادیس ابابا (شہر کا نام) میں ڈھونڈ نکالا جہاں میں ایک اور انٹرویو کرنے گئی ہوئی تھی۔ اس سفیر نے مجھ سے بہت غیر معمولی درخواست کی۔ وہ بولے کہ میں ایک دوسرا آرٹیکل لکھوں جس میں میں یہ کہوں کہ میں نے کبھی بھٹو صاحب کا انٹرویو نہیں کیا تھا۔ یہ محض ایک خواب تھا اور اسی کی بنیاد پر میں نے وہ سب کچھ لکھا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں یہ لکھوں کہ اندرا گاندھی کے بارے میں انہوں نے کوئی رائے نہیں دی تھی بلکہ یہ رائے میرے اپنے خیالات کی پیداوار تھی۔

پہلے تو مجھے بھٹو صاحب کی بھیجی ہوئی یہ فرمائش کی سمجھ نہیں آئی۔

میں نے پاکستانی سفیر سے کہا کہ آپ نے کیا کہا؟

وہ بولے کہ میں آپ سے یہ درخواست کر رہا ہوں کہ آپ ایک نیا کالم لکھیں اور اس میں یہ لکھیں کہ یہ سارا انٹرویو آپ کی اپنی ذہنی تخلیق تھا، خصوصاً جو کچھ مسز گاندھی کے بارے میں لکھا گیا تھا۔

میں چلائی کہ آپ لوگ پاگل ہو گئے ہیں۔ آپ لوگوں کا وزیراعظم بھی پاگل ہو گیا ہے۔

بہت سارے لوگوں کو قتل بھی کرنا پڑا تھا۔ سوائے جنگ کو بھی بہت سارے لوگوں کو مارنے کے لیے طاقت
کو استعمال کرنا پڑا تھا۔ میں آپ کو موجودہ تاریخ کے صرف دو واقعات بتا رہا ہوں۔ میں پوری انسانی
تاریخ میں سے اور مثالیں نہیں ڈھونڈ رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض دفعہ حالات ایسے ہو جاتے ہیں
جہاں آپ طاقت کے فوری استعمال کا جواز ڈھونڈ سکتے ہیں اور اس کا جواز بھی پیش کر سکتے ہیں۔ مارچ
کے مہینے میں پاکستان کے اتحاد کا انحصار ان علیحدگی پسندوں کو کچلنے پر تھا لیکن میرے خیال میں طاقت کا
فوری استعمال بلا جواز عام لوگوں پر کیا گیا نہ کہ ان لیڈروں پر جو اس کے ذمہ دار تھے۔ اس طرح کے
وحشیانہ پن کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ یہ کوئی طریقہ نہیں تھا کہ آپ غریب لوگوں کو اس طریقے سے قائل
کرنے کی کوشش کریں جنہیں یہ بتایا گیا ہو کہ شیخ مجیب کے چھ نکاتی پروگرام سے نہ تو سمندری طوفان
آئیں گے نہ سیلاب اور نہ ہی کوئی بھوک سے مرے گا۔ میں تو خود اس طرح کے ہتھکنڈوں کے خلاف
اس وقت پورے زور سے بولا تھا جب کسی کو بات کرنے کی جرأت بھی نہیں ہوتی تھی۔

میں آگے سے بولی بھٹو صاحب اچھا ہے کچھ بھی ہو کیا آپ نے اسی جنرل ٹکا کو اپنا آرمی چیف
نہیں بنایا جس نے بنگالیوں کے ڈھاکہ میں قتل عام کا حکم دیا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟

بھٹو صاحب بولے ٹکا خان ایک فوجی تھا اور وہ اپنی ڈیوٹی کر رہا تھا۔ اسے ایک حکم کے ذریعے
مشرقی پاکستان بھیجا گیا تھا اور دوسرے حکم کے تحت اسے واپس بلایا گیا تھا۔ اس نے وہی کچھ کیا جس کا
اسے حکم دیا گیا تھا۔ اگرچہ وہ اس طرح کے احکامات سے ہر وقت مطمئن نہیں تھا۔ میں نے اسے اس لیے
آرمی چیف بنایا کیونکہ مجھے پتہ ہے کہ وہ اسی ڈسپلن کے ساتھ میرے آرڈرز مانے گا۔ وہ سیاست میں
دخل دینے کی کوشش نہیں کرے گا۔ میں پوری پاکستان آرمی تباہ نہیں کر سکتا اور ویسے بھی میں آپ کو بتاتا
چلوں کہ ڈھاکہ میں ہونے والے واقعات کے حوالے سے اس کی ریپوٹیشن کے بارے میں باتیں بڑھا
چڑھا کر بیان کی جاتی رہی ہیں۔ ان تمام واقعات کا ذمہ دار صرف ایک ہی شخص ہے جس کا نام یحییٰ خان
ہے۔ یحییٰ خان اور اس کے مشیر جب طاقت اور کرپشن کے نشے میں چور تھے وہ یہ بھی بھول گئے کہ فوج
کی بھی کوئی عزت تھی۔ انہیں خوبصورت کاریں، خوبصورت گھر تعمیر کرنے، بینکرز سے دوستیاں کرنے اور
پیسہ کما کر بیرون ملک بھیجنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں تھا۔ یحییٰ خان ملک کی حکومت میں کوئی دلچسپی نہیں
رکھتا تھا۔ اسے اگر کسی چیز میں دلچسپی تھی تو وہ اپنے لیے طاقت حاصل کرنے میں تھی اور کچھ نہیں! آپ

[illegible] کے بارے میں کیا کہیں گے جو بیڈ سے اٹھتے ہی صبح سویرے شراب پینا شروع کر دیتے اور اس
کے بعد جب رات گئے وہ دوبارہ مدہوش ہو جاتے۔ آپ تصور ہی نہیں کر سکتیں کہ یحییٰ خان کے ساتھ
رہنا کتنا مشکل کام تھا۔ He was really Jack the Ripper.

میں نے بھٹو صاحب سے پوچھا کہ آج کل جنرل یحییٰ خان کہاں ہے اور اب آپ ان کے
ساتھ کیا سلوک کریں گے؟

بھٹو صاحب بولے وہ راولپنڈی میں واقع اپنے گھر میں قید ہیں۔ وہ بنگلہ جس میں انہیں رکھا گیا
ہے وہ سرکاری ہے۔ میں نے ایک وار کمیشن بنا لیا ہے (حمود الرحمن کمیشن) جو اس مشرقی پاکستان کے
سانحے کی ساری تحقیقات کر رہا ہے۔ میں اس کمیشن کی رپورٹ کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس رپورٹ سے ہی
مجھے فیصلہ کرنے میں آسانی رہے گی۔ اگر کمیشن نے اسے مجرم قرار دیا تو میرا خیال ہے کہ پھر یحییٰ خان کا
زوال ہو گا۔ ساری شکست کی ذمہ داری جنرل یحییٰ خان پر آتی ہے۔ اندرا گاندھی اس بات پر بالکل صحیح
فخر کر سکتی ہیں کہ انہوں نے ایک جنگ جیتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اگر انہوں نے یہ جنگ جیتی ہے تو پھر
سب سے پہلے مسز گاندھی کو جنرل یحییٰ خان اور اس کے جاہل خوشامدیوں کے ٹولے کا شکریہ ادا کرنا
چاہیے۔ یحییٰ خان سے عقل کی بات کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے اور بندہ بات سمجھاتے
سمجھاتے غصے میں آ جاتا ہے۔

25 مارچ کو ڈھاکہ میں قتل عام کے بعد اپریل کے مہینے میں یحییٰ خان نے مجھے ملاقات کے لیے
بلایا۔ اس وقت وہ بڑا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ اسے اس چیز کا یقین تھا کہ اب صورتحال
پوری طرح قابو میں تھی۔ یحییٰ خان نے مجھے شراب کا گلاس پیش کیا اور بولا "تم سیاستدان تو ختم ہو کر رہ
گئے ہو۔"

جنرل بولا نہ صرف مجیب بلکہ بھٹو صاحب آپ بھی ان لیڈروں میں شمار ہوتے ہیں جو بہت
بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے اور پاکستان کی سلامتی کے خلاف تقریریں کر رہے تھے۔

یحییٰ خان بولے "بھٹو تمہیں پتہ ہے میرے اوپر تمہیں گرفتار کرنے کے لیے ہمیشہ پریشر رہتا ہے۔"

یحییٰ خان کی یہ بات سن کر میرا پارہ چڑھ گیا اور میں نے اسے جواب دیا کہ وہ اس طرح کی
باتیں کر کے مجھے خوفزدہ نہیں کر سکتا تھا اور اس کے انہی ہتھکنڈوں کی وجہ سے ہم تباہی کے دہانے پر

کر رہے تھے۔ میں نے وہسکی کا گلاس دور پھینکا اور اس کمرے سے نکل گیا۔ باہر نکلا تو مجھے جنرل عمر نے روک لیا اور مجھے بازوؤں سے پکڑ کر کہنے لگا۔

"No. Come on, calm down, have a seat, go back in."

میں ٹھنڈا پڑ گیا اور کمرے میں واپس چلا گیا۔ میں نے جنرل یحییٰ کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ میرے اور مجیب میں بہت فرق ہے۔ مجیب ایک علیحدگی پسند تھا میں نہیں۔

لیکن میری یہ ساری گفتگو بیکار گئی۔ میری بات سننے کے بجائے جنرل یحییٰ خان ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اور پھر چوتھا اور پتہ نہیں کتنے گلاس شراب کے پیتا چلا گیا اور پھر اس کا رویہ ناقابل برداشت ہو گیا۔

میں نے بھٹو صاحب سے کہا کہ کیا ایک لمحے کے لیے ہم دوبارہ یہ بات سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں کہ آپ مارچ کے اس خوفناک مہینے میں وہاں تک کیسے پہنچے تھے چاہے اس مہینے میں ہونے والے قتل عام کا اخلاقی جواز تھا یا نہیں۔

بھٹو صاحب بولے میری طرف دیکھو۔ 27 جنوری کو میں شیخ مجیب سے ملنے کے لیے ڈھاکہ گیا تھا۔ اگر میں نے شیخ مجیب سے بات چیت کرنی تھی تو پھر مجھے ڈھاکہ جانا ہی تھا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے راولپنڈی آنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں اس دن شیخ مجیب سے ملنے کے لیے گیا تھا جس دن میری اپنی سگی بہن کے خاوند کی موت ہوئی تھی۔ اسے لاڑکانہ کے خاندانی قبرستان میں دفن کرنا تھا۔ میری بہن مجھ سے بہت شدید ناراض ہو گئی۔ قومی انتخابات میں شیخ مجیب نے مشرقی پاکستان اور میں نے مغربی پاکستان میں اکثریت حاصل کر لی تھی لیکن اب وہ اپنے چھ نکات پر اڑا ہوا تھا۔ ہم دونوں کو کسی نہ کسی معاہدے پر پہنچنا تھا۔ جنرل یحییٰ خان مسلسل یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ ہم چار مہینے کے اندر اندر آئین پر کام کر لیں ورنہ وہ اسمبلی توڑ کر نئے انتخابات کرائے گا۔ شیخ مجیب کو یہ بات سمجھانے کے لیے بہت زیادہ کوششوں کی ضرورت تھی۔ آپ ان لوگوں سے ذہانت کی توقع نہیں کر سکتے جن کے پاس ذہانت ہی نہ ہو۔ میں نے شیخ مجیب سے ان باتوں کی بار بار وضاحت کی، اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی ایک ہی بات پر اڑا رہا کہ کیا آپ میرے چھ نکات کو مانتے ہیں۔ میں ان چھ میں سے پہلے تین نکات پر بات چیت کے لیے تیار تھا لیکن میں چوتھا نکتہ کیسے مانتا جس میں یہ لکھا تھا کہ ہر صوبہ کسی بھی غیر ملک سے تجارت کر سکتا

[illegible]
کو کیا ہوا تھا اور سب سے بڑھ کر ملک کا اتحاد کیسے قائم رہتا۔ اس کے علاوہ اس بات کا سب کو علم تھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے علیحدہ کرنا چاہتا تھا اور اس کے بھارتیوں کے ساتھ 1966ء سے رابطے بھی تھے۔ یوں جنوری کے مہینے میں ہماری بات چیت آگے نہ بڑھ سکی اور پھر مارچ آ گیا۔

وسط مارچ میں یحییٰ خان کراچی آئے اور مجھے بتایا کہ وہ ڈھاکہ جا رہے تھے اور مجھ سے پوچھا کہ کیا میں وہاں جانا چاہتا تھا۔

میں نے انہیں جواب دیا ہاں اگر شیخ مجیب مجھ سے بات چیت کے لیے تیار ہے تو میں ڈھاکہ جاؤں گا۔ اگلے روز مجھے ایک ٹیلی گرام ملا کہ شیخ مجیب بات چیت کے لیے تیار ہیں۔ یہ ٹیلی گرام ڈھاکہ سے جنرل یحییٰ خان نے مجھے خود بھیجا تھا۔ میں 19 مارچ کو ڈھاکہ کے لیے روانہ ہوا۔ 20 مارچ کو میری یحییٰ خان سے ملاقات ہوئی اور 21 مارچ کو میں شیخ مجیب الرحمٰن سے ملا۔ اس ملاقات میں یحییٰ خان بھی میرے ساتھ تھے۔ میں اس وقت بڑا حیران ہوا جب میں نے دیکھا کہ شیخ مجیب یحییٰ خان سے بڑے پیار محبت بھرے لہجے میں بات کر رہے تھے۔ شیخ مجیب بولے کہ یحییٰ خان صاحب میرا تو آپ سے معاہدہ ہو گیا ہے۔ میرا بھٹو صاحب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں پریس کو بتاؤں گا کہ میری صدر صاحب سے ملاقات ہوئی ہے اور بھٹو صاحب وہاں اتفاقاً موجود تھے۔

یہ بات سن کر یحییٰ خان بولے نو نو مجیب تم صرف اپنی بات کرو۔

شیخ مجیب نے یحییٰ کو جواب دیا کہ سمندری طوفانوں میں پہلے ہی بہت سارے لوگ مارے گئے تھے۔ بہت سارے لوگ مارے گئے تھے۔ شیخ مجیب نے اپنی بات کو دہرایا۔

یہ ہے شیخ مجیب۔ اچانک اس کے بیمار ذہن میں ایک فقرہ اٹک سا جاتا ہے۔ ایک ایسا فقرہ جس کا اس گفتگو سے دور دور تک تعلق ہی نہیں ہوتا جو آپ کر رہے ہوتے ہیں اور وہ ایک جنونی کی طرح اسے بار بار دہراتا رہتا ہے۔

اس میٹنگ میں ایک موقع ایسا بھی آیا کہ مجھے غصہ آ گیا کہ بھلا مشرقی پاکستان میں آنے والے سمندری طوفان کی ذمہ داری مجھ پر کیسے آ جاتی تھی۔ کیا وہ سمندری طوفان میں نے مشرقی پاکستان

پہنچا تھا۔ میری بات سن کر شیخ مجیب اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ اس نے ایک جنازے میں شرکت کرنی تھی لہٰذا وہ جا رہا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب بھی آپ شیخ مجیب کے بارے میں بات کرتے ہیں تو آپ کو ہر بات ناقابل یقین سی لگتی ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ بھلا دنیا کیسے اسے سنجیدگی سے لیتی ہے۔

پھر، جب شیخ مجیب نے جانے کی بات کی تو میں بھی اٹھ کھڑا ہوا تا کہ اسے باہر تک چھوڑ آؤں۔ اگرچہ میں نے محسوس کیا کہ شیخ مجیب یہ نہیں چاہتا تھا کہ میں انہیں چھوڑنے جاؤں۔ ایک کمرے میں تین لوگ بیٹھے ہوئے تھے جن میں یحییٰ خان کے ملٹری سیکرٹری اور اس کا سیاسی جلاد جنرل عمر بھی شامل تھے۔ انہیں دیکھ کر شیخ مجیب چلایا کہ کمرہ خالی کرو۔ سب لوگ باہر چلے جاؤ۔ میں نے مسٹر بھٹو سے بات کرنی ہے۔ وہ تینوں کمرے سے باہر نکل گئے۔ شیخ مجیب میرے ساتھ بیٹھ گیا اور بولا برادر، برادر۔۔۔ میرے بھائی ہمیں کوئی معاہدہ کر لینا چاہیے۔ خدا کے نام پر میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ ہم یہ معاہدہ کر لیں۔

میں اس کی بات سن کر شدید حیران ہوا۔ میں اسے باہر لے گیا تا کہ کوئی اس کی بات نہ سن سکے۔ جب ہم باہر گئے تو اس نے انتہائی پرجوش سی آواز میں مجھے کہا کہ بھٹو صاحب! آپ مغربی پاکستان رکھ لو اور اسے مشرقی پاکستان دے دو۔ وہ بولا اس نے ایک خفیہ ملاقات کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔ رات کے اندھیرے میں بھی وہ مجھے بلوائے گا اور وہ یہ سارے معاملات طے کریں گے۔

میں نے اسے بتایا کہ مجھے اس طرح کی چیزیں بالکل پسند نہیں ہیں۔ میں نے کہا کہ میں ڈھاکہ اس سے ایک چور کی طرح رات کے اندھیرے میں کیلے کے کسی درخت کے نیچے چھپ کر نہیں ملنے آیا ہوں اور نہ ہی میں پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم بھی کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ قومی اسمبلی میں یہ معاملہ اٹھائے اور اپنی عددی اکثریت پر بھروسہ کرے۔

مجھے یوں لگا کہ میں کسی دیوار سے باتیں کر رہا تھا۔ میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ میں اپنے ترجمان کے ذریعے بات چیت کو جاری رکھنے کے اعلان پر کمپرومائز کرتا۔ یہ تھی وہ ساری اصل کہانی اور وہ سارا قصہ۔ ان دنوں وہ ایک طرح سے پاگل ہوا ہوا تھا۔ اس کا دماغ گھوم گیا تھا

[illegible] 25 مارچ کا دن آیا جس دن بنگالیوں کا بڑے وحشیانہ طریقے سے قتل عام ہوا۔

میں نے بھٹو صاحب سے پوچھا کہ کیا انہوں نے 25 مارچ کو کوئی عجیب و غریب چیزیں محسوس کی تھیں۔

بھٹو صاحب بولے یقیناً اس دن کوئی عجیب سا ماحول تھا۔ انہوں نے بھی ایک عجیب سی بے چینی محسوس کی تھی۔ وہ ہر شام یحییٰ خان سے ملنے جاتے اور اسے بتاتے کہ ان کے اور مجیب کے درمیان مذاکرات آگے نہیں بڑھ رہے تھے لیکن یحییٰ خان ان باتوں میں کوئی دلچسپی ظاہر نہ کرتے۔ وہ میری بات سن کر اپنا منہ پرے کر لیتے یا پھر ٹیلی ویژن کی شکایتیں کرنے لگ جاتے۔ وہ اس بات پر بڑبڑاتے کہ راولپنڈی سے ابھی ان کا ریکارڈر نہیں پہنچا تھا اور وہ اپنی پسند کے گانے نہیں سن سکتے تھے۔ 25 مارچ کی شام جنرل یحییٰ نے مجھ سے ایک ایسی بات کہی جسے سن کر میں ششدر رہ گیا۔ وہ بولے آج مجیب سے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کل صبح میں اور تم دونوں مجیب سے اکٹھے ملیں گے۔ میں نے پھر بھی کہا کہ یحییٰ ٹھیک ہے۔ میں نے اسی شام یہ بات شیخ مجیب کے ایک بندے کو بتائی تو وہ بولا "وہ کتے کا بچہ پہلے ہی ڈھاکہ سے چلا گیا ہے۔"

میں نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا۔ میں نے صدارتی رہائش گاہ فون کیا اور بتایا کہ میں یحییٰ خان سے بات کرنا چاہ رہا ہوں۔ مجھے بتایا گیا کہ ان سے بات نہیں ہو سکتی۔ وہ رات کے کھانے پر جنرل ٹکا خان کے ساتھ ہیں۔ میں نے ٹکا خان کو فون کیا تو وہاں سے مجھے بتایا گیا کہ ان سے بات نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ اس وقت یحییٰ خان کے ساتھ کھانے پر ہیں۔ اس وقت مجھے کچھ کچھ سمجھ آنا شروع ہو گئی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ کوئی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اس کے بعد میں رات کا کھانا کھانے چلا گیا اور پھر سو گیا۔ میری آنکھ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے کھلی۔ میں نے اپنے دوستوں کو کمروں سے بھاگنے کی آوازیں سنیں۔ میں دوڑ کر کھڑکی کی طرف گیا اور میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں رو پڑا اور میرے منہ سے نکلا My country is finished۔

میں نے بھٹو صاحب سے پوچھا کہ انہوں نے اپنی کھڑکی سے کیا دیکھا تھا؟

بھٹو صاحب بتانے لگے کہ اگرچہ لوگوں کو اندھا دھند نہیں مارا جا رہا تھا تاہم یہ ضرور تھا کہ فوجی یونٹیں People نامی اخبار کے دفاتر کو گرانے کی کوشش کر رہے تھے جو ہمارے ہوٹل کے بالکل

سامنے واقع تھے۔ فوجی ڈو ڈو ٹینکروں پر بیٹھ کر لوگوں کو اس جگہ سے دور جانے کا کہہ رہے تھے۔ جو ہوٹل سے باہر آئے انہیں مشین گنیں دکھا کر ایک طرف کر دیا گیا۔ دوسرے گروپس کو دوسری جانب مشین گنوں کی مدد سے وہاں سے پرے روک لیا گیا تھا جبکہ ہوٹل کو ٹینکوں نے گھیرا ہوا تھا۔ جس نے بھی ہوٹل میں پناہ لینے کی کوشش کی وہ سیدھا فوجیوں کے ہاتھ لگا۔

میں نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

صبح آٹھ بجے جب میں وہاں سے روانہ ہوا تو مجھے پتہ چلا کہ شیخ مجیب کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ چلیں شیخ مجیب زندہ تھا۔ یہ بات میرے ذہن میں ضرور آئی کہ انہوں نے شیخ مجیب کے ساتھ بدتمیزی کی ہوگی۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید اس کی گرفتاری سے اس کے ساتھ کمپرومائز کرنے میں آسانی رہے گی۔ وہ اسے ایک دو ماہ سے زیادہ جیل میں نہیں رکھیں گے اور اسی اثنا میں ہم ڈھاکہ میں لاء اینڈ آرڈر پر قابو پالیں گے۔

میں نے ان سے کہا کہ جناب صدر! مجیب نے آپ سے کہا کہ آپ مغربی پاکستان لے لو اور میں مشرقی پاکستان رکھ لیتا ہوں اور بعد میں بالکل یہی کچھ ہوا۔ کیا آپ شیخ مجیب سے اس بات پر نفرت کرتے ہیں؟

بھٹو صاحب نے زور سے کہا کہ بالکل نہیں اور میں یہ بات انڈین فیشن میں بھی نہیں کہہ رہا۔ میں آپ کو پورے خلوص سے کہہ رہا ہوں کہ میں اسے نفرت کرنے کے بجائے بہت زیادہ ہمدردی محسوس کرتا ہوں۔ اس میں نہ کامن سینس ہے نہ ہی کوئی کلچر۔ اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ اس پوزیشن میں ہی نہیں ہے کہ کوئی سیاسی، سماجی، معاشی یا عالمی مسئلہ حل کر سکے۔ اسے صرف ایک ہی طریقہ آتا ہے کہ چلانا کیسے ہے۔ میں اسے 1954ء سے جانتا ہوں اور میں نے کبھی اسے سنجیدگی سے نہیں لیا۔ میری اس سے جس لمحے ملاقات ہوئی تھی میں اسی وقت سے اس کے بارے میں یہی رائے رکھتا ہوں کہ اس میں کوئی گہرائی نہیں تھی۔ وہ محض ایک Agitator تھا جس کے اندر بہت آگ بھری ہوئی تھی لیکن آئیڈیا ایک بھی نہیں تھا۔ اگر اس کے ذہن میں کوئی آئیڈیا تھا بھی سہی تو وہ علیحدگی پسندی کا تھا۔ اب ایسے شخص کے ساتھ آپ بھلا ہمدردی کا جذبہ محسوس کرنے کے علاوہ اور کیا محسوس کر سکتے ہیں۔

یہ 1961ء کی بات ہے۔ میں ڈھاکہ گیا اور میری شیخ مجیب سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ وہ

میرے ہوٹل کی لابی میں بیٹھا تھا۔ میں چل کر اس کے پاس گیا اور کہا ہیلو مجیب! آؤ چائے کا ایک کپ پیتے ہیں۔

وہ انہی دنوں نیا نیا جیل سے باہر آیا تھا اور اس میں تلخی بھری ہوئی تھی اور ہم نے اس دفعہ بے تکلفی سے گفتگو کی۔ شیخ مجیب مجھے بتاتا رہا کہ کیسے مشرقی پاکستان کا مغربی پاکستان کے ہاتھوں استحصال ہو رہا تھا اور ڈھاکہ پر ایک کالونی کی طرح حکومت کی جا رہی تھی۔ اس کا خون چوسا جا رہا تھا۔ شیخ مجیب کی باتیں سچی تھیں۔ میں نے بالکل یہی باتیں ایک کتاب میں بھی لکھی تھیں۔ تاہم شیخ مجیب الرحمٰن نے ان باتوں سے کوئی نتیجہ نہیں نکالا۔ اس نے یہ وضاحت نہیں کی کہ غلطی معاشی نظام میں تھی۔ اس دور کے حکمرانوں میں تھی۔ اس نے اس وقت سوشلزم یا جدوجہد کی کوئی بات نہیں کی۔ اس کے برعکس اس نے کہا کہ مشرقی پاکستان کے لوگ اس وقت جدوجہد کے لیے تیار نہیں تھے اور کوئی بھی فوج کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا۔ فوج کو چاہیے تھا کہ وہ ان ناانصافیوں کا خاتمہ کرے۔ اس کے اندر جرأت بھی تھی ہی نہیں۔ یا وہ واقعی اپنے آپ کو صحافیوں کے سامنے شیر بنگال کہتا ہے۔

بھٹو صاحب کی یہ بات سن کر میں نے کہا کہ ہاں وہ تو یہ بھی کہتا ہے کہ جب اس کا ٹرائل کیا گیا تو اس نے اپنا دفاع کرنے سے انکار کر دیا تھا اور گرفتاری کے بعد اس نے ایک ہیرو کی طرح کا رویہ اختیار کیا۔ اسے ایک ایسے سیل میں رکھا گیا جہاں سونے کے لیے ایک گدا تک بھی نہ تھا۔

بھٹو صاحب نے کہا کم آن۔ اسے کبھی کسی جیل کے سیل میں نہیں رکھا گیا۔ اسے ایک ایسے اپارٹمنٹ میں رکھا گیا تھا جو خصوصی طور پر بڑے اہم سیاسی قیدیوں کے لیے تیار کرایا گیا تھا۔ اسے پنجاب کی میانوالی کی جیل میں رکھا گیا تھا۔ یہ بات درست ہے کہ اسے پڑھنے کے لیے اخبارات اور سننے کے لیے ریڈیو فراہم نہیں کیا جاتا تھا۔ تاہم اس کے پاس گورنر پنجاب کی بہت بڑی لائبریری کی سہولت موجود تھی اور وہ وہاں بڑے اچھے طریقے سے رہا۔ کئی موقعوں پر تو اسے بنگالی خانساماں بھی دیا گیا کیونکہ وہ بنگالی ڈشز کھانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے ٹرائل کے موقع پر اپنا دفاع بھی کیا۔ اس نے اپنے دفاع کے لیے دو بڑے وکیلوں کمال حسین اور اے کے بروہی کی خدمات بھی مانگیں جو اس کا قانونی مشیر اور دوست بھی تھا۔ کمال حسین ان دنوں جیل میں تھا لیکن بروہی صاحب آزاد تھے۔ بروہی کو اپنا وکیل بنانے کا مقصد یہ تھا کہ آپ کے پاس بہتر سے بہتر وکیل آپ کا دفاع کرنے کے لیے موجود ہو۔ میں

آپ کو ایک اور بات بتاتا ہوں۔ پہلے تو بروہی نے اس کا وکیل بننے سے انکار کیا تاہم یحییٰ خان نے اسے مجبور کیا اور وہ شیخ مجیب کے مقدمے میں اپنے چار اگر جونیئر وکیلوں کے ساتھ پیش ہوا۔ بروہی کے ساتھ صرف ایک ہی مسئلہ ہے کہ وہ بولتا بہت ہے۔ جب بھی وہ لائل پور سے کراچی واپس آتا تو وہ شیخ مجیب کے ساتھ کی گئی اپنی ساری گفتگو لوگوں کو سناتا اور کہتا کہ اسے مجرم ثابت کرنا بہت مشکل ہوگا۔ مجیب نے اسے بہترین انداز میں وہ ساری باتیں اسے بتائی ہوتیں کہ جیسے وہ جنرل یحییٰ کا بھی احترام کرتا تھا اور پاکستان توڑنے میں بھی اسے دلچسپی نہیں تھی۔ شیخ مجیب یہ بات کہتے ہوئے کبھی نہیں تھکتا تھا کہ یحییٰ خان ایک زبردست آدمی تھا۔ بہت بڑا محب وطن لیکن بھٹو نے اسے دور کر دیا تھا۔ شیخ مجیب کا خیال تھا کہ اس کی گرفتاری کا ذمہ دار بھٹو تھا۔ یہ مجھے جنرل پیرزادہ نے بھی مجھے بعد میں کنفرم کی تھی اور میں نے اسے کہا تھا کہ آپ اسے میرے حوالے کر دیں۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ مجھے بھی یہی کہے گا کہ بھٹو ایک زبردست انسان، بہت بڑا محب وطن ہے اور آپ لوگوں کی بے عزتی کرے گا۔

میں نے کہا کہ بھٹو صاحب! شیخ مجیب کو تو اس ٹرائل میں باقاعدہ سزا بھی سنائی گئی تھی؟

بھٹو صاحب بولے نہیں ایک اسپیشل ٹریبونل نے اسے مجرم قرار دیا تھا۔ اس کے بعد مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے طور پر یہ پاورز یحییٰ خان کے پاس تھے کہ وہ سزا کا فیصلہ کرے جو پانچ سال سے لے کر عمر قید یا سزائے موت ہو سکتی تھی۔ یحییٰ خان نے کوئی فیصلہ نہیں کیا کیونکہ جنگ پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔ اس کے ذہن پر اور بہت ساری چیزیں سوار تھیں۔

میں نے کہا کہ بھٹو صاحب! شیخ مجیب نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی قبر تک کھود دی گئی تھی۔

بھٹو صاحب بولے کہ کیا آپ کو پتہ ہے کہ یہ قبر کیا تھی۔ یہ ایئر ریڈ شیلٹر تھی۔ انہوں نے جیل کی دیواروں کے ارد گرد کھدائی کی ہوئی تھی۔ بیچارہ مجیب وہ اتنا خوفزدہ تھا کہ وہ ہر چیز کو اپنی موت کا پروانہ سمجھتا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ یحییٰ خان اسے قتل کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ 27 دسمبر کو جب مجھے پاکستان کے نئے صدر کا حلف دیا گیا تو میں جنرل یحییٰ خان سے ملا۔ اس وقت وہ نشے میں دھت تھا اور Dorian Gray کے پورٹریٹ کی طرح لگ رہا تھا۔ یحییٰ خان نے مجھے بتایا کہ "میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ میں نے شیخ مجیب کو پھانسی پر نہیں چڑھایا۔ تم اگر چاہتے ہو تو یہ کام کر گزرو۔"

میں نے بھٹو صاحب سے پوچھا پھر کیا ہوا؟

بھٹو صاحب بولے میں نے کہا کہ میں اسے پھانسی نہیں لگاؤں گا اور بار بار سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے شیخ مجیب کو رہا کر دینا چاہیے۔ پاکستان آرمی کے مظالم کی کہانیوں کے بعد جس کی ہر طرف سے مذمت کی جا رہی تھی، میرے ملک کو چند ہمدردیوں کی ضرورت بھی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شیخ مجیب کو معافی دے کر ہمیں زیادہ ہمدردیاں ملیں گی۔ اس کے علاوہ میرے ذہن میں یہ بھی تھا کہ اس کی رہائی کا پیغام جائے گا اور ہمارے جنگی قیدی جلدی واپس آ سکیں گے۔ یہ سوچ کر میں نے فوری طور پر حکم دیا کہ شیخ مجیب کو لائل پور سے راولپنڈی لایا جائے۔ جب شیخ مجیب کو یہ آرڈرز دیے گئے تو وہ خوفزدہ ہو کر سسکیاں بھرنے لگا کہ وہ اسے باہر نکال کر مار دیں گے۔ وہ لائل پور سے راولپنڈی کے سفر کے دوران بھی پرسکون نہیں تھا۔ اس کی اس وقت بھی تسلی نہیں ہوئی جب اسے بڑے خوبصورت بنگلے میں لے جایا گیا۔ وہ خوبصورت بنگلہ چند بڑے لوگوں کے استعمال کے لیے مخصوص تھا۔ جب میں وہاں اپنے ساتھ ایک ریڈیو، ایک ٹیلی ویژن سیٹ اور کپڑوں کا ایک بنڈل لے کر گیا تو اس نے میرے اوپر چڑھائی کر دی۔ وہ بولا تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اس وقت پاکستان میں صدر بن چکا ہوں۔ یہ سن کر اس کی آواز فوراً بدل گئی۔ وہ آ کر میرے گلے لگ گیا اور بولا کہ یہ اس کی زندگی کی سب سے اچھی خبر ہے اور یہ کہ خدا اسے ہمیشہ بچانے کے لیے مجھے وقت پر بھیج دیتا ہے۔ میں اس سے پہلے بھی اسے ایک دفعہ اسی طرح جیل سے نکلوا چکا تھا۔ جیسا کہ میرا اندازہ تھا شیخ مجیب نے جنرل یحییٰ خان پر تنقید شروع کر دی۔ اپنی اس تنقید میں وہ وقفہ صرف اس وقت کرتا جب وہ مجھ سے یہ پوچھتا کہ کیا وہ اب اپنے آپ کو آزاد سمجھے۔ اسے بذریعہ لندن ڈھاکہ جانے سے پہلے میں اس سے دو دفعہ ملا اور دونوں دفعہ اس نے قرآن پاک نکالا اور اس پر ہاتھ رکھ کر قسم کھا کر کہا کہ وہ مغربی پاکستان کے ساتھ تعلقات رکھے گا۔ جب وہ جہاز پر سوار ہوا تو اس نے تب بھی قرآن پاک پر قسم کھائی۔ جب میں اسے صبح پنڈی چھوڑنے ایئرپورٹ گیا تو یقین کریں میں اس کی ان باتوں سے متاثر ہو گیا تھا۔ اس نے ایک اور قسم کھائی، مجھے گلے سے لگایا، میرا شکریہ ادا کیا اور ہمیشہ کے لیے میرا ممنون رہنے کی باتیں کیں۔ جہاز پر چڑھنے سے پہلے وہ مجھ سے بولا کہ صدر صاحب! میں بہت جلد واپس آؤں گا۔ میں اب آپ کے ملک کو بہتر طریقے سے جاننا چاہتا ہوں۔ میں اب یہاں بار بار آتا رہوں گا۔

میں نے بھٹو صاحب سے پوچھا کہ کیا کبھی انہیں شیخ مجیب کو رہا کرنے کا افسوس ہوا؟

بھٹو صاحب نے کہا نہیں، کبھی بھی نہیں اور یہ کبھی ہوگا ہے وہ دوسری طرف ایک پاکستانی ہے اور ہم دونوں پر تقریباً ایک طرح کے اثرات لگتے رہے ہیں۔ ہم نے ایک طرح کے حقائق کا سامنا کیا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود ہمارے درمیان ایک تعلق موجود ہے۔ میں آج بھی اسے یاد کرتا ہوں جب مجھے اندرا گاندھی کا وہ دن یاد آتا ہے جب اس نے مجھے بازوؤں سے پکڑ اور سسکیاں لے کر درخواست کی تھی کہ مجھے بچاؤ، بچاؤ۔ میں واقعی اس کے لیے ہمدردی محسوس کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ بیچارہ مجیب زیادہ دیر تک اقتدار میں نہیں رہے گا۔ آٹھ ماہ گزر گئے ہیں۔ جو بھی ایک سال پرانا ہوگا وہ بھاری جو وہ ہمیشہ سے چاہتا تھا وہ اسے خود نگل جائے گی۔ آج آپ دیکھ رہے ہیں بنگلہ دیش انڈیا کا سیٹلائٹ بنا ہوا ہے۔ بہت جلد یہ روس کا سیٹلائٹ بنے گا اور مجیب کیمونسٹ نہیں ہے۔ اگر مجیب ان تمام معاملات کو اچھے طریقے سے سنبھال بھی لے جس کا امکان مجھے نہیں لگتا تو بھی بہت جلد اس کا سامنا Maoists سے ہوگا جو اس جنگ کے اصل فاتح ہیں۔ وہ پہلے ہی اس پر دباؤ بڑھا رہے تھے۔ سیاسی طور پر مکتی باہنی کچھ بھی نہیں۔ اگر معاشرتی طور پر دیکھا جائے تو وہ ایک طرح سے کوئی خطرہ ہی نہیں۔ مکتی باہنی کو صرف ایک چیز آتی ہے کہ ہوا میں گولی کیسے چلائی ہے۔ لوگوں کو خوفزدہ کیسے کرنا ہے۔ کیسے مال چرانا ہے اور Joi Bangla کے نعرے کیسے لگانے ہیں۔ اور آپ محض نعرے لگا کر ایک ملک نہیں چلا سکتے جبکہ دوسری طرف بنگالی Maoists نے موزے تنگ کی آدھی لال کتاب پڑھی ہوئی ہے لیکن وہ سمجھدار ہیں اور بھارتیوں کو یہ اجازت نہیں دیتے کہ وہ انہیں استعمال کریں۔ میرا انہیں خیال کہ وہ پاکستان کے اتحاد کے خلاف ہیں۔ آپ دیکھیے گا برتری انہی کو ہی ملے گی۔ اتنے خوفناک اور پیچیدہ مسائل کا سامنا کرنے کے لیے آپ کو ایک جینئس کی ضرورت ہوگی۔ اب آپ ذرا تصور کریں کہ شیخ مجیب الرحمٰن جیسا شخص ان تمام مسائل سے ڈیل کر رہا ہے اور پھر یہ زمین (بنگلہ دیش) بہت بدنصیب دھرتی ہے۔ سمندری طوفان، سیلاب اور دیگر مصیبتیں ہر وقت چلتی رہتی ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جائے گا کہ وہ کسی منحوس ستارے کے زیر اثر پیدا ہوا تھا۔ آپ نے ڈھاکہ کو 1947ء میں دیکھا تھا اور 1954ء میں بھی، ایک گندہ سا گاؤں جہاں گلیاں تک نہیں تھیں اب وہاں ہر چیز تباہ ہو چکی ہے اور اسے تباہ کرنے میں بنگلہ دیش کی مکتی باہنی کے ڈاکا ماینس نے بڑا کردار ادا کیا ہے۔

میں نے جب بھٹو صاحب کے منہ سے بنگلہ دیش کا نام سنا تو میں بڑی حیران ہوئی اور ان سے

کہا کہ آپ کے منہ سے بنگلہ دیش کا نام سن کر مجھے حیرت ہو رہی ہے؟

بھٹو صاحب میری حیرانی دیکھ کر بولے کہ صاف ظاہر ہے میں بنگلہ دیش کا نام لیتے اور نفرت سے ساتھ لے رہا ہوں۔ میرے لیے تو ابھی تک یہ مشرقی پاکستان ہے۔ اب آپ گو کہ یہ غلط۔ اگرچہ یہ بھی بھارتیوں کی فوجی کارروائی کا نتیجہ ہے۔ پچاس ملک اسے تسلیم کر چکے ہیں۔ اب مجھے بھی اسے تسلیم کرنا پڑے گا۔ میں بھی اسے تسلیم کرنے کو تیار ہوں اگر بھارت ہمارے قیدی واپس کرے اور بہاریوں کا وہاں قتل عام بند کیا جائے اور پاکستان کے حامیوں کو نہ مارا جائے۔ اگر ہم نے دوبارہ ایک فیڈریشن میں ضم ہونا ہے تو ہمیں سفارتی تعلقات قائم کرنے چاہئیں۔ میرا خیال ہے کہ اگلے پندرہ سالوں میں پاکستان اور بنگلہ دیش دوبارہ ایک فیڈریشن بن سکتے ہیں۔ یہ بن سکتے ہیں اور انہیں بننا بھی چاہیے ورنہ اس کی کمی کو کون پورا کرے گا۔ دوسری طرف مغربی بنگال بھی بھارت سے علیحدگی چاہتا ہے۔ مشرقی بنگالیوں اور مغربی بنگالیوں میں کوئی چیز مشترک نہیں ہے جبکہ ہمارے اور مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کے درمیان ایک مذہب مشترک ہے۔ 1947ء میں ہونے والی تقسیم بہت اچھی تھی۔

میں نے کہا کہ بھٹو صاحب ادھر ہی رکئے۔ کیا آپ نے ایک ایسا ملک 1947ء میں بنایا جو ایک دوسرے سے دو ہزار کلومیٹر دور اور درمیان میں انڈیا تھا۔

بھٹو صاحب بولے کہ آپ یہ بات کیوں بھول رہی ہیں کہ یہ دونوں علاقے باوجود بہت ساری خامیوں کے پچیس سال تک ایک ملک کا حصہ رہے۔ ایک ریاست محض علاقائی یا جغرافیائی تصور بھی نہیں ہوتی۔ جب آپ کا جھنڈا، قومی ترانہ، مذہب ایک ہو تو پھر فاصلوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب مغلوں نے انڈیا کو اکٹھا کیا تھا تو مسلمانوں کو اس کے دوسرے حصے تک پہنچنے کے لیے پورا ایک سو سال لگا تھا۔ اب ہوائی جہاز کے ذریعے محض دو گھنٹے لگتے ہیں۔ کیا آپ میری بات سمجھ رہی ہیں۔

میں نے کہا جناب صدر نہیں۔ مجھے اندرا گاندھی کی بات زیادہ بہتر سمجھ میں آتی ہے جب وہ یہ کہتی ہیں کہ 1947ء کی تقسیم غلط تھی اور 1970ء کی دہائی میں مذہب کی لڑائی ایک احمقانہ چیز تھی!

بھٹو صاحب بولے، مسز گاندھی کے ذہن میں صرف یہ خواب ہے کہ وہ پورے برصغیر پر قبضہ کر کے ہمیں اپنی رعایا بنانا چاہتی ہے۔ وہ ایک کنفیڈریشن بنا کر پاکستان کو دنیا کے نقشے سے غائب کرنا چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ یہ کہتی ہیں کہ ہم آپس میں بھائی بھائی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ہم بھائی بھائی نہیں

ہے۔ میں یہ بات اس لیے بھی نہیں کہہ رہا کہ وہ ہمارے نوے ہزار فوجی واپس کرنے کو تیار نہیں ہے اور پنڈ آف کوشش کا احترام نہیں کر رہی۔ میں تو آپ کو وہ بتا رہا ہوں جیسا میں نے اسے پایا ہے۔ وہ ایک ایسی خاتون ہیں جن میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بالکل نہیں ہے۔ ٹھیک ہے کہ آج وہ ان دنوں سے زیادہ بہتر ہیں جب وہ آکسفورڈ میں پڑھتی تھیں یا لندن میں ہونے والے ایک لیکچر میں بیٹھی اونگھ رہی تھیں۔ اللہ نے اسے اعتماد دیا ہے اور کامیابی سے بہتر کوئی اور چیز نہیں ہوتی، لیکن اصل سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے اس کی خوبیوں سے زیادہ کامیابی ملی ہے۔ اگر پاکستان اور انڈیا نے ایک کنفیڈریشن بنا لی تو مجھے مسز اندرا گاندھی سے ان کا یہ عہدہ لینے میں کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ میں ان سے Intellectual Confrontations بھی خوفزدہ نہیں ہوں۔ یہ سب کچھ کہنے کے باوجود بھی میں مسز گاندھی سے کسی بھی جگہ ملنے کو تیار ہوں جہاں وہ پسند کریں۔ میں نئی دہلی جا کر بھی ان سے ملاقات کے لیے جا سکتا ہوں۔ جی ہاں! میں ان سے ملنے کے لیے نئی دہلی بھی جانے کو تیار ہوں۔ تاہم، جو بات مجھے پریشان کرتی ہے وہ یہ ہے کہ مجھے بھارتی فوج گارڈ آف آنر پیش کر رہی ہے اور میں اندرا گاندھی سے ملاقات کر رہا ہوں۔ یہ دونوں چیزیں مجھے پتہ نہیں کیوں اچھی نہیں لگتیں۔ خدارا مجھے ان دونوں چیزوں کے بارے میں سوچنے پر مجبور بھی نہ کرو۔

بھٹو صاحب نے مجھ سے پوچھ لیا کہ آپ یہ باتیں چھوڑیں اور مجھے یہ بتائیں کہ مسز اندرا گاندھی نے ان کے بارے میں مجھے اپنے انٹرویو میں کیا کہا تھا۔

میں نے بھٹو صاحب کو جواب دیا کہ وہ کہتی تھیں کہ آپ ایک غیر متوازن شخصیت کے مالک انسان ہیں۔ آپ ایک دن ایک بات کرتے ہیں اور دوسرے دن دوسری۔ وہ یہ بھی کہتی تھیں کہ آپ کے بارے میں کسی کو کوئی پتہ نہیں چلتا کہ آپ کے ذہن میں کیا ہے۔

بھٹو صاحب بولے۔ واقعی؟

بھٹو صاحب نے کہا میں آپ کو اس کا بڑا سیدھا سا جواب دیتا ہوں۔ مجھے مشہور فلاسفر لاک کی صرف ایک بات اچھی لگتی ہے کہ Consistency is a virtue of small minds (اگرچہ بھٹو صاحب نے یہ مشہور فقرہ لاک کے نام سے کہا۔ دراصل یہ بات ایمرسن نے کہی تھی۔ اس نے کہا تھا A foolish consistency is the hobgoblin of little minds۔ مترجم)

بھٹو صاحب نے کہا کہ دوسرے لفظوں میں میرے خیال میں آپ کا بنیادی تصور ضرور ایک ہونا چاہیے لیکن اس کے اندر بھی تبدیلی کی گنجائش ہونی چاہیے۔ آپ کبھی ایک پول پر چلے جائیں تو کبھی دوسرے پر۔ ایک دانشور کو صرف ایک خیال کے ساتھ چمٹ کر نہیں رہنا چاہیے۔ اس کے خیالات میں لچک ہونی چاہیے ورنہ اس کے خیالات ڈرامے یا فلم میں کسی کردار کی لمبی تقریر جیسے ہی ہوں گے۔ یہ بات سیاستدان پر بھی صادق آتی ہے۔ سیاست بھی ایک تحریک کی طرح ہوتی ہے اور ایک سیاستدان کو بھی سوال کرتے رہنا چاہیے۔ اسے کبھی رائٹ تو کبھی لیفٹ کی طرف گھومنا چاہیے تو کبھی اس کے اندر تضادات اور شکوک بھی ابھرنے چاہئیں۔ اسے مسلسل اپنے آپ کو بدلتے رہنا چاہیے۔ چیزوں کو ٹیسٹ کرتے رہنا چاہیے اور ان پر ہر سائیڈ سے حملہ کرتے رہنا چاہیے تاکہ وہ اپنے مخالفین کے کمزور پوائنٹ ڈھونڈ کر ان پر حملہ کر سکے۔ اس شخص پر ترس کھانا چاہیے جو ہر وقت اپنے ایک بنیادی خیال سے چمٹا رہے اور اس سے ہمدردی کرنی چاہیے کہ اگر وہ اپنے اس بنیادی نقطے کا انکشاف کرتا ہے۔ بظاہر ایک غیر مستقل مزاجی کسی بھی ذہین شخص اور منجھے ہوئے شخص کی بہت بڑی خوبی ہوتی ہے۔ اگر یہ بات مسز اندرا گاندھی کو سمجھ نہیں آتی تو پھر مجھے یہ کہنے میں حرج نہیں ہے کہ وہ اپنے سیاسی پیشے کی اس خوبصورتی سے ناآشنا ہے۔ یہ بات بہرحال مسز گاندھی کے والد نہرو کو اچھی طرح پتہ تھی۔

میں نے بھٹو صاحب کو بتایا کہ اندرا گاندھی تو کہتی ہیں کہ ان کے والد صاحب نہرو سیاستدان نہیں بلکہ ایک Saint تھے۔ (یہ خطاب دراصل رومن کیتھولک اور آرتھوڈکس چرچ ایک بہت ہی اچھے اور نیک انسان کو اس کی موت کے بعد دیا کرتے تھے۔ مترجم)

بھٹو صاحب فوراً بول پڑے اور ان کے منہ سے نکلا اوہ۔ مسز گاندھی اپنے باپ کے بارے میں یہ غلط بات کہہ رہی ہیں۔ ان کا باپ ایک بہت عظیم سیاستدان تھا۔ میری خواہش تھی کہ ان میں اپنے باپ کی آدھی خوبیاں بھی ہوتیں۔ اگرچہ نہرو پاکستان کے قیام کے خلاف تھا لیکن پھر بھی میں اس کی خوبیوں کا معترف ہوں بلکہ جب میں نوجوان تھا تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں ان کا بہت بڑا فین تھا۔ یہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا کہ ان میں بھی بہت ساری خامیاں تھیں۔ ان کے حصے کی اپنی ناکامیاں تھیں۔ ان میں بھی خامیاں تھیں اور وہ سٹالن، چرچل یا موزے تنگ کی کلاس سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔

بھٹو صاحب نے پھر مجھ سے پوچھا کہ اس کے علاوہ مسز گاندھی نے ان کے بارے میں اور کیا کہا؟

[illegible] 1971 [illegible]

[illegible]

بھٹو صاحب [illegible] 28 [illegible] مشرقی پاکستان ہمارے ملک کا حصہ نہیں تھا [illegible] کرتے ہیں کہ [illegible] Palermo پر حملہ کر دے تو کیا آپ اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کریں گے کہ [illegible] Marseilles پر حملہ کر دے تو کیا آپ اسے یہ نہیں کہتے کہ فرانس پر حملہ ہوا تھا۔

دراصل مسز گاندھی یہ بات بھول جاتی ہیں کہ ہم نے مقبوضہ کشمیر پر حملہ 3 دسمبر کو کیا تھا۔ مجھے یاد ہے میری نومبر 29 کو جنرل یحییٰ خان سے ملاقات ہوئی تھی اور میں نے ان سے اس بات پر خاصی بحث کی تھی کہ ہم نے بھارتیوں پر جوابی حملہ کیوں نہیں کیا تھا۔ میں نے یحییٰ خان کو کہا تھا کہ آپ تو ایسے بیٹھے ہوئے ہیں جیسے مشرقی پاکستان میں کچھ نہیں ہوا تھا۔ آپ بھارت پر حملہ نہ کر کے دراصل بھارتیوں کا کھیل کھیل رہے تھے۔ آپ لوگوں کو اس بات کا یقین دلا رہے تھے کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان ایک ملک کا حصہ نہیں تھے۔

میں نے یہ ساری باتیں جنرل یحییٰ کو بتائیں لیکن اس نے میری ایک بھی نہیں سنی۔ اس نے چار دفعہ بھارت پر جوابی حملے کی کارروائی کے احکامات دیکر واپس لیے۔ جب چوتھی دفعہ جنرل یحییٰ نے بھارت پر حملے کے احکامات دیکر واپس لیے تو ہمارے فوجی افسران اور فوجی شدید مایوسی میں اپنے سر اپنے ٹینکوں کے ساتھ ٹکرا رہے تھے۔

جہاں تک ڈھاکہ کی بات ہے میں نے جنرل یحییٰ سے کہا کہ ہم باقی محاذ چھوڑ کر ڈھاکہ میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ہم ڈھاکہ کو ایک بہت بڑا قلعہ بنائیں گے اور وہاں دس ماہ سے لے کر ایک سال تک بھارت سے جنگ لڑیں گے اور پوری دنیا ہمارے ساتھ ہوگی۔ تاہم، یحییٰ خان کے ذہن میں صرف ایک بات سمائی ہوئی تھی کہ کہیں بھارتی ہمارے چھوٹے سے علاقے پر بھی قبضہ نہ کر لیں اور وہاں بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرا دیں اور جب اسی جنرل یحییٰ نے جنرل نیازی کو بھارتی جنرل کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا تو میں نے خدا سے کہا تھا بہتر ہوتا کہ میں اس سے پہلے ہی مر جاتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں اس

[illegible]

[illegible]

[illegible]

میں نے بھٹو صاحب سے کہا کہ [illegible]

بھٹو صاحب نے کہا کہ ہاں [illegible] میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ واقعی ایک حقیقت ہے لیکن میں اس وقت [illegible] ہوا تھا۔ بھارتی اپنے غرور کی آخری حد تک پہنچے ہوئے تھے۔ مجھے اس چیز پر بڑا غصہ تھا کہ بڑی بڑی طاقتیں بھارت سے خوفزدہ تھیں کہ کہیں وہ ان سے ناراض نہ ہو جائے۔ مجھے اپنے جذبات پر قابو نہ رہا اور میں نے پھر وہ تقریر کی تھی جس میں میں نے ان سب سے کہا تھا کہ آپ لوگ جائیں جہنم میں۔ میں اس وقت رو پڑا تھا۔ آپ حیران نہ ہوں میں کبھی کبھار روتا بھی ہوں۔ میں ہمیشہ اس وقت روتا ہوں جب میں کہیں ناانصافی ہوتے دیکھتا ہوں۔ میں ایک بہت جذباتی آدمی ہوں۔

میں نے بھٹو صاحب سے کہا کہ یعنی آپ ایک جذباتی، ایک مشکل اور ایک ایسے انسان ہیں جن کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ سب سے زیادہ زیر بحث بھی رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے بہتر ہوگا کہ ہم آپ کی شخصیت کے بارے میں تھوڑی سی گفتگو کریں۔ اب اس بات پر بات کرتے ہیں کہ آپ ایک بہت امیر آدمی ہیں پھر بھی آپ ایک سوشلسٹ ہیں۔ آپ مغربی انداز میں زندگی گزارتے ہیں اور پھر بھی آپ کی دو بیویاں ہیں۔

بھٹو صاحب بولے کہ میری شخصیت تضادات سے بھری ہوئی ہے اور مجھے ان کا علم بھی ہے۔ میں ان تضادات کو ایک دوسرے سے ملانے اور ان پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن مجھے اس میں کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ میں مشرق اور مغرب کا ایک عجیب سا ملاپ ہوں۔ میں نے ایک عام آدمی کی سی تعلیم حاصل کی ہوئی ہے اور ایک مسلم گھرانے میں میری پرورش ہوئی ہے۔ میرا ذہن مغربی اور میری روح مشرقی ہے۔ جہاں تک میری دو بیویوں کی بات ہے، میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میری شادی اس وقت کر دی گئی تھی جب میں 13 سال کا تھا۔ میری پہلی بیوی میری کزن تھی۔ میں 13 برس کا اور وہ 23 برس کی تھی۔ اس وقت تو مجھے یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ بیوی کیا چیز ہوتی ہے۔ جب انہوں نے مجھے بہلانے کی کوشش کی تو مجھے اس وقت شدید غصہ آیا تھا۔ مجھے اس وقت بیوی نہیں چاہیے تھی۔ میں کرکٹ کھیلنا چاہتا تھا۔ مجھے کرکٹ بہت پسند تھی۔ مجھے اس شادی پر راضی کرنے کے لیے انہوں نے

مجھے کرکٹ کے دو نئے بیگ خرید کر دیے۔ جونہی میری شادی کی رسومات ختم ہوئیں میں بھاگ کر کرکٹ کھیلنے چلا گیا۔

مجھے احساس ہے کہ میرے ملک میں ایسی بہت ساری چیزیں ہوتی ہیں جنہیں مجھے تبدیل کرنا چاہیے۔ میں پھر بھی اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں۔ میرے گاؤں میں تو میرے ساتھ کرکٹ کھیلنے والے ایک کھلاڑی دوست جس کی عمر اس وقت گیارہ سال تھی، کی شادی ایک 32 سالہ خاتون سے کر دی گئی تھی۔ وہ مجھے ہمیشہ کہتا تھا کہ یار تم تو خوش قسمت ہو کہ تمہاری بیوی 23 برس کی تھی اور تم 13 برس کے!

جب میں اپنی دوسری بیوی نصرت کی محبت میں گرفتار ہوا تو میری عمر اس وقت 23 برس تھی۔ نصرت اس وقت لندن میں پڑھ رہی تھی۔ اگرچہ وہ ایرانی تھی اور ایران میں ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی روایت تھی، پھر بھی میرے لیے اسے شادی پر رضامند کرنا بہت مشکل تھا۔ میرے پاس اسے منانے کے لیے کوئی زیادہ دلیلیں نہیں تھیں۔ میں نے اسے صرف دو تین الفاظ ہی کہے تھے کہ کیا ہوا اگر میں پہلے سے شادی شدہ ہوں۔ لعنت بھیجو اس پر۔ اب میں یہ بات ضرور کہوں گا کہ اپنی پہلی بیوی کا خیال میرے ذہن میں کبھی نہیں آیا۔ نہ صرف یہ کہ وہ میری کزن ہے بلکہ یہ بھی کہ اب وہ میری ذمہ داری ہے۔ اس بیچاری کی تمام عمر اس احمقانہ شادی کی وجہ سے تباہ ہو کر رہ گئی جو ایک 13 سال کے بچے سے کی گئی تھی۔ یہ ایک ایسی بیہودہ روایت ہے جس میں ہم سب پل بڑھ کر جوان ہوئے ہیں۔ وہ میرے لاڑکانہ والے گھر میں رہتی ہے۔ ہم اکثر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ وہ زیادہ تر تنہا زندگی گزارتی ہے۔ وہ ماں ہی نہیں بن سکی جبکہ میری دوسری بیوی سے میرے چار بچے ہیں۔ میں نے اپنی پہلی بیوی کے ساتھ بہت کم وقت گزارا ہے۔ میں جونہی تھوڑا سا بڑا ہوا میں پڑھنے کے لیے لندن چلا گیا۔ یہ ناانصافی کی ایک اپنی داستان ہے۔ میں وزیراعظم کی حیثیت سے وہ سب کچھ کروں گا جس سے لوگ دوسری شادی نہ کریں۔ پھر دوسری شادی کے بعد بہت بڑے معاشی مسائل بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اکثر یہ بیویاں الگ گھروں اور شہروں میں رہتی ہیں جیسا کہ میرے ساتھ ہوا، لیکن اب ہر کوئی میری طرح بھی دو بیویاں مختلف شہروں اور گھروں میں افورڈ نہیں کر سکتا۔ اگرچہ میں کوئی اتنا امیر آدمی بھی نہیں ہوں۔

میں نے حیرانی سے بھٹو صاحب سے پوچھا۔ کیا آپ واقعی امیر نہیں ہیں؟

بھٹو صاحب نے فوراً جواب دیا کہ نہیں! میں اس طرح امیر نہیں ہوں جیسا آپ کے ہاں سمجھا

جاتا ہے۔ یہاں جس کے پاس بہت ساری زمین ہو اسے امیر سمجھا جاتا ہے جبکہ اس کے برعکس وہ یورپ کے ان نوابوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے جو شاندار بنگلوں میں رہتے ہیں اور زندہ رہنے کے لیے Gigolo کھیلتے ہیں۔ ہماری زمینیں خشک ہیں اور پیداوار کم ہے۔ اس لیے یہ کہنے کے بجائے کہ میں ایک امیر آدمی ہوں، آپ یہ کہہ سکتی ہیں کہ میں نسبتاً ایک امیر آدمی ہوں۔ میں ایک اچھی زندگی گزارتا ہوں۔ میری بہن بھی ایک اچھی لائف گزار رہی ہے۔ میرے بھائی نے بھی اچھی زندگی گزاری اور ہم اچھے سکولوں میں پڑھنے گئے لیکن ہم نے کبھی ایک روپیہ بھی ضائع نہیں کیا۔ میں کبھی بھی پلے بوائے نہیں رہا۔ جب میں امریکہ میں سٹوڈنٹ تھا اور بعد میں آکسفورڈ میں پڑھ رہا تھا، میں نے وہاں کوئی کار نہیں خریدی۔ میں نے پیسوں کو ہمیشہ بڑی احتیاط سے خرچ کیا ہے، مثلاً میں نے پیسے کو یورپ جانے اور اچھے لوگوں سے ملنے اور کتابیں خریدنے پر خرچ کیا ہے۔ اگر آپ میری لائبریری پر ایک نظر دوڑائیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ میں نے اپنی دولت کا بڑا حصہ کتابوں پر خرچ کیا ہے۔ میرے پاس ہزاروں کتابیں ہیں جن میں بہت ساری پرانی اور نئی کتابیں ہیں۔ میں مطالعے سے بہت لطف اندوز ہوتا ہوں جس طرح سپورٹس سے! چند لوگ میرے اوپر یہ الزام لگاتے ہیں کہ میں ڈریس کپڑے پہنتا ہوں۔ یہ بات درست ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اپنی دولت کپڑوں پر اڑاتا ہوں۔ اچھے کپڑے پہننے کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک صاف ستھرا انسان ہوں۔ میں نہانے اور کپڑے تبدیل کرنے سے محبت کرتا ہوں۔ میں ان بھارتی اور پاکستانی شہزادوں کے ساتھ کھڑا نہیں ہو سکتا جو گندے رہتے ہیں اور ان سے بُو آتی ہے۔ میرے پاس خوبصورت اور آرام دہ گھر ہیں۔ یہ بات بھی درست ہے، لیکن بہت بڑے عرصے تک میرے ان گھروں میں ایئر کنڈیشنر تک نہیں تھے۔ میں لوگوں کو کھلا پلا کر خوش ہوتا ہوں لیکن احمق اور بیوقوف لوگوں کو نہیں! مجھے رقص کرنا آتا ہے لیکن اس وجہ سے کیونکہ مجھے میوزک پسند ہے۔ دوسرے! میں اس وقت دیوار پر لگا ہوا ایک ساکت پھول بن کر نہیں رہ سکتا جب دوسرے رقص میں مصروف ہوں اور آخر میں۔۔۔۔

میں نے بھٹو صاحب کی بات ان کے منہ سے اچک لی اور بولی کہ آخر میں آپ کی یہ ریپوٹیشن ہے کہ خوبصورت عورتیں آپ پر مرتی ہیں۔ آپ ایک Don Juan ہیں۔ جناب صدر! کیا یہ بات درست ہے؟

میں جتنا عرصہ چاہوں وہاں ٹھہر سکتا ہوں۔ اس کے بعد تیسرا لیڈر جس سے میں متاثر رہا ہوں وہ ستالن تھا۔ میں ہمیشہ اس کی دل سے بڑی عزت کرتا ہوں۔ تاہم، میں نے خروشیف کو کبھی پسند نہیں کیا۔ اسے میں نے ہمیشہ چیختے چلاتے، سٹیروں کو برا بھلا کہتے یا شراب پیتے اور ہمیشہ امریکیوں کے آگے جھکنے کے لیے تیار دیکھا۔ خروشیف نے ایشیا کو بہت نقصان پہنچایا۔ آخری لیڈر جس سے میں متاثر ہوں اور میرا خیال ہے کہ آپ چاہتی ہیں کہ میں ماؤزے تنگ کے بارے میں کچھ کہوں تو میں آپ کو بتاؤں کہ میرے لیے چو این لائی کے بارے میں بات کرنا زیادہ آسان ہے کیونکہ میں اسے ذاتی طور پر جانتا ہوں اور میری ان سے کئی ملاقاتیں اور بحث و مباحثے ہوئے ہیں جو صبح سے شام تک جاری رہے حتیٰ کہ ایک سال تک ہم یہ مباحثے کرتے رہے۔ میں 1962ء سے بیجنگ جا رہا ہوں اور چو این لائی سے ملاقاتیں کرتا رہا ہوں۔ میں اسے بہت پسند کرتا ہوں۔

میں نے کہا کہ جناب صدر! آپ جن لیڈروں کے نام لے رہے ہیں انہوں نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے بہت جدوجہد کی تھی جبکہ آپ نے تو ایسا کچھ نہیں کیا؟

بھٹو صاحب بولے آپ غلط کہہ رہی ہیں۔ یہاں تک پہنچنا میرے لیے کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مجھے جیل میں ڈالا گیا۔ میں نے کئی دفعہ خطرات کا سامنا کیا۔ میں نے جنرل ایوب خان اور یحییٰ خان کا سامنا کیا۔ انہوں نے کھانے میں زہر دیکر مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔ میرے اوپر گولیاں بھی برسائی گئیں۔ دو دفعہ میرے اوپر قاتلانہ حملہ 1968ء میں ہوا اور ایک دفعہ 1970ء میں۔ سندھ کے شہر سانگھڑ میں دو سال پہلے میں یحییٰ خان کے بھیجے ہوئے قاتلوں کی کی گئی کراس فائرنگ میں ایک گھنٹے تک پھنسا رہا۔ مجھے بچاتے ہوئے ایک شخص مارا گیا جبکہ دوسرے شدید زخمی ہوئے۔ آپ ایک اور بات بھی نہ بھولیں کہ جب آپ کسی امیر گھر میں پیدا ہوتے ہیں اور اس کے بعد سوشلسٹ بنتے ہیں تو پھر کوئی آپ کی بات کا یقین نہیں کرتا نہ دوست اور نہ ہی آپ کے قریبی لوگ بلکہ وہ آپ کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور تو اور غریب بھی آپ کی بات کا یقین نہیں کرتے جو بچارے اتنے پڑھے لکھے نہیں ہوتے کہ وہ آپ کے خلوص پر یقین کریں۔ میرے لیے گولیوں کی بوچھاڑ اور خوراک میں زہر سے بچنا اتنا مشکل کام نہیں تھا جتنا ان لوگوں کو اس بات پر مجبور کرنا کہ وہ میری باتوں کو سنجیدگی سے لیں جو مجھ پر یقین نہیں کرتے تھے۔ ایک ایسا شخص جو سازشوں اور مراعات میں میں پیدا ہوا تھا، انہوں نے کوئی مجھے الہ دین کے قالین پر

نہیں بٹھا دیا تھا اور اگر سیاست میرا پیشہ نہ ہوتا۔۔۔۔

میں نے کہا بھٹو صاحب آپ کے اندر سیاست کے لیے اتنی محبت کہاں سے آئی؟

بھٹو صاحب بولے یہ ہمیشہ سے میرے اندر تھی۔ جب میں ایک بچہ تھا یا اس وقت بھی میرے ساتھ تھی، لیکن میرا خیال ہے کہ یہ چیز میرے والدین کی طرف سے میرے اندر آئی تھی۔ میرا باپ ایک بڑا زبردست سیاستدان تھا۔ تاہم، افسوس کی بات ہے کہ سیاست سے اس وقت وہ نکل گئے جب وہ مختلف انتخابات میں ہار گئے۔ ان کے سیاست کے بارے میں بڑے اعلیٰ خیالات تھے۔ ایک دن وہ مجھے لاڑکانہ کا چکر لگوانے لے گئے۔ انہوں نے مجھے قدیم مندر دکھائے۔ شاندار گھر اور اپنی تہذیب کی نشانیاں اور مجھے کہا کہ دیکھو بیٹا سیاست بھی ایک مندر یا گھر تعمیر کرنے کی طرح ہوتی ہے یا میوزک یا شاعری لکھنے کی مانند۔ انہوں نے اپنی گفتگو میں مائیکل اینجلو کا بھی ذکر کیا۔ تاہم میری ماں بڑی مختلف خاتون تھیں۔ ان کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا اور وہ دوسرے غریب لوگوں کی غربت بہت کھٹکتی تھی۔ وہ مجھے اکثر کہتی رہتی تھی کہ بیٹا تم ہمیشہ غریبوں کا خیال رکھنا۔ ہمیں غریبوں کی مدد کرنی چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ جب میں امریکہ گیا تو میری ماں کی باتیں میرے ذہن میں اتنی رچ بس گئی تھیں کہ میں ایک انقلابی بن گیا۔ میں امریکہ کی یونیورسٹی آف کیلیفورنیا میں پڑھنے گیا جہاں انٹرنیشنل لاء کا ایک بہت بڑا جیوریسٹ پڑھا رہا تھا۔ میں اس وقت انٹرنیشنل لاء میں بھی ڈگری لینا چاہتا تھا۔ یہ دور کمیونسٹوں کو ہرٹ کرنے کا دور تھا۔ میں پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ میں نے کیا کرنا تھا۔ میں لال نیل پالش لگانے والی لڑکیوں سے دور رہتا اور ایک ایسی سٹریٹ میں جا کر رہا جہاں نیگروز رہتے تھے۔ میں وہاں ایک مہینہ اور ایک ہفتہ رہا۔ مجھے ان کے ساتھ رہنا اچھا لگا۔ وہ جو بھی تھے ان میں بناوٹ نہیں تھی۔ انہیں ہنسنا آتا تھا۔ ایک دن سان ڈیاگو میں ایک ہوٹل والے نے اس وجہ سے کمرہ دینے سے انکار کر دیا کہ میں ایک میکسیکن لگتا تھا۔ اس واقعے نے بھی میری سوچ کافی بدلی۔ میں امریکہ سے لندن گیا۔ ان دنوں الجیریا کی آزادی کی تحریک چل رہی تھی۔ میں الجیریا کے لوگوں کے ساتھ ہو گیا لیکن میں مظاہرین کے ساتھ مل کر برطانیہ کے وزیراعظم کے دفتر 10۔ ڈاؤننگ سٹریٹ کے باہر نعرے نہیں لگاتا تھا۔ ہو سکتا ہے شاید کسی کو علم نہیں ہے کہ میں اندر سے ایک شرمیلا انسان ہوں۔ میں لوگوں میں زیادہ گھلنا ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔ میں ہمیشہ لکھ کر بحث و مباحثہ کرنے کو ترجیح دیتا تھا۔ میرے خیال میں سیاست کی گیم میں یہ چیز مجھے

زیادہ واضح ہو گئی تھی۔

میں نے کہا کہ بھٹو صاحب! اب آپ سے آخری سوال۔ معاف کیجیے گا اگر سوال آپ کو زیادہ چبھ گیا۔ آپ کا کیا خیال ہے، آپ کتنا چلیں گے؟

بھٹو صاحب نے کہا کہ آپ کے اس سوال کو ہم اس طرح لیتے ہیں کہ یہ ممکن ہے کہ میں اگلی صبح ختم ہو جاؤں لیکن میرا خیال ہے کہ میں ان تمام لوگوں سے زیادہ دیر تک پاکستان کا حکمران رہوں گا جنہوں نے ابھی تک اس ملک پر حکمرانی کی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اس وقت صحت مند ہوں اور میرے اندر خاصی انرجی بھری ہوئی ہے۔ میں کام کر سکتا ہوں جیسے ابھی بھی ایک دن میں اٹھارہ گھنٹے کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں اس وقت نوجوان ہوں۔ میری عمر 44 برس ہے اور میں اندرا گاندھی سے دس سال چھوٹا ہوں اور سب سے بڑھ کر مجھے اس بات کا پتہ ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے میں تیسری دنیا کا واحد لیڈر ہوں جو دنیا کی دو بڑی سپر پاورز کی مخالفت کے باوجود دوبارہ سیاست میں واپس آیا۔ 1966ء میں امریکہ اور روس دونوں مجھ سے سخت خفا تھے اور مجھے مشکلات میں دیکھنا چاہتے تھے۔ آج میں ان تمام مشکلات پر قابو پا کر یہاں بیٹھا ہوں کیونکہ مجھے اپنے پیشے (سیاست) کے بنیادی اصولوں کا پتہ ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ اصول کیا ہیں؟ دراصل سیاست میں آپ کو کئی دفعہ یہ تاثر دینا پڑتا ہے کہ آپ بیوقوف ہیں اور دوسروں کو یہ یقین دلانا پڑتا ہے کہ ان سے بہتر ذہین کوئی پیدا نہیں ہوا۔ تاہم، یہ سب کچھ کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ کے اندر لچک ہو۔۔۔۔ کیا آپ نے کبھی کسی گھونسلے پر کسی پرندے کو اپنے انڈوں پر بیٹھے دیکھا ہے۔ ایک سیاستدان کی انگلیاں اتنی ہلکی اور لچکدار ہونی چاہئیں کہ وہ بڑی مہارت سے اس پرندے کے نیچے سے اس کے انڈوں کو ایک ایک کر کے اتنی خوبصورتی سے نکالے کہ اسے پتہ ہی نہ چلے!

کراچی، اپریل 1972ء

Courtesy : An Interview With History

مترجم: رؤف کلاسرا

رؤف کلاسرا کی یہ کاوش آج کے ان تجزیہ نگاروں کے لیے بہت مفید ہے جن کے پاس رائے عامہ کو تبدیل کرنے کی طاقت تو بہت ہے مگر سیاست کو سمجھنے کا تجربہ، جماعتوں کے اسرار و رموز، مقامی سیاست کے مسائل اور علاقائی تفریقوں سے آگاہی بہت کم ہے۔ رؤف نے یہ سیاسی خاکے لکھ کر ان شخصیات کے اندر جھانکنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہم رؤف کے تجربے سے اتفاق کریں، مگر رؤف نے سیاست کے ایک دور کا خاکہ میدان میں ریفرنس کے لیے پھینک دیا ہے۔ جس کسی میں اختلاف کا مواد یا مباحثے کی عقل ہو وہ اس معرکے میں شریک ہو سکتا ہے۔

مجھے یہ خاکے پڑھ کر احساس ہوا کہ جو چوہدری نثار یا چوہدری شجاعت رؤف کے خاکوں میں ابھرے ہیں ان کو تو میں جانتا ہی نہیں یا یہ کہ مصنف نے ان کو اپنے زاویے سے دیکھا ہے۔ شاید سیاسی صحافت کا یہی سب سے بڑا سبق ہے کہ ایک ہی منظر اور کردار کی کئی کہانیاں ہوتی ہیں۔ اسی لیے ان خاکوں کا عنوان "ایک سیاست کئی کہانیاں" بہت موزوں ہے۔ کسی کے پاس سچائی کی ٹھیکیداری نہیں اور یوں ہی چھوٹی کہانیوں سے ایک بڑی کہانی ابھرتی ہے جو حقیقت کے قریب تر ہوتی ہے۔

عامر متین

ISBN: 978-969-496-385-3